قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

نومبر 2026 قیمت ₹25

ماہنامہ

اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

دوروزہ قومی سمینار، حیدرآباد



ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:28، شمارہ11، نومبر 2026

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
نائب مدیر : نہاں
معاون مدیر: ڈاکٹر فیضان الحق
معاونین : ڈاکٹر وسیم اقبال، محمد اکرام، محمد فرقان عالم

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع : سالاسار امیجنگ سسٹمس
B-19، سیکٹر 88، نوئیڈا۔ 201305 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: اختر حسین
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/25 روپے، سالانہ -/240 روپے

صفحات: Total Pages:100

- قلمکاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 011-35151992 | شعبۂ ادارت: 011-35152009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

ای-میل
editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746،
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
- ہماری بات — مدیر — 4

خطوط
- آپ کی بات — قارئین — 5

رپورٹ
- دوروزہ قومی سمینار (حیدرآباد) — ادارہ — 7



زبان و تعلیم
- ٹیکنو پیڈاگوجی اور طلبہ کی ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت — سید رضاء الرحمن — 12
- استفساری تدریس اور مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت — محمد جمشید عالم — 15

تلاش و تحقیق
- خواجہ حیدر علی آتش یا آتش — احمد محفوظ — 19



خراج عقیدت
- ضامن جعفری: معیاری شاعری کا ضامن — ارتضیٰ کریم — 22



- مولانا ابوالکلام آزاد: ایک وطن دوست رہنما — فیروز بخت احمد — 25
- علی امام نقوی کے افسانے — عبدالسمیع — 27

گوشۂ اختر الایمان
- اختر الایمان کے ادبی تصورات — شاہ عالم — 31
- اختر الایمان کی مختصر نظمیں: ایک جائزہ — شفیع ایوب — 35



- اختر الایمان کا فنی طریقِ کار — نوشاد عالم — 38
- اختر الایمان کی نظموں کا بیانیہ نظام — لیاقت علی — 42

شخصیات
- جی اے کلکرنی کی افسانہ نگاری — محمد فیضان اللہ — 46



- سلام بن رزاق کی ادبی خدمات — محمد سرفراز — 49

ادب کی عوامی جہات
- بدیسیا: ایک مقبول عام لوک گیت — محمد نظرین انصاری — 52



- عہد حاضر میں اردو لوک گیت کی معنویت — محمد ارشد ہمراز — 56
- اودھ کی کہاوتوں، محاوروں اور اصطلاحات کا تہذیبی پس منظر — محمد عمر رضا — 60

خصوصی گفتگو
- پاپولر میرٹھی سے ایک مکالمہ — فرقان احمد سردھنوی — 64

کتابوں کی دنیا
- تبصرہ و تعارف — ادارہ — 67

جہانِ آگہی
- خبرنامہ — ادارہ — 76

ہماری بات

کسی بھی رسالے کی خوبیوں میں جہاں مواد کی جامعیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے، وہیں اس کی ترتیب کا تنوع بھی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ جس سے رسالے کے مشمولات قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتے ہیں اور قاری اس سے بہتر طور پر مستفید ہو کر اپنی فکر کو جلا بخشتا ہے۔ رسالہ اردو دنیا کی بھی یہ کوشش رہی ہے کہ اس کی ترتیب وتزئین میں جدت جامعیت اور تنوع کو ملحوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ پیش نظر شمارے کی ترتیب میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ تعلیم اور زبان وادب کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ زاویوں سے دیکھنے کے ساتھ ان کے باہمی رشتوں کو بھی سمجھا جائے۔ نتیجتاً زبان وتعلیم، تلاش وتحقیق، خراجِ عقیدت، گوشہ اختر الایمان، شخصیات، ادب کی عوامی جہات، اور خصوصی گفتگو جیسے عنوانات اس شمارے کے موضوعاتی دائرے کو وسعت بخشنے کے ساتھ تنوع کا اشاریہ محسوس ہوتے ہیں۔ یہ عنوانات محض مختلف موضوعات کی نشان دہی نہیں کرتے، بلکہ علم، تحقیق، تخلیق، شخصیت شناسی اور سماجی شعور کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جو اردو زبان و ادب کی تفہیم میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان عنوانات کے ذریعے ایک طرف زبان وتعلیم کے مسائل اور تحقیق کی اہمیت پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے، تو دوسری طرف ادبی شخصیات کی خدمات، تخلیقی انفرادیت اور ادب کے سماجی کردار کو سمجھنے کی راہیں بھی کھلتی ہیں۔ اس طرح شمارہ زبان و ادب کی مختلف جہات اور تعلیم وتعلم کے ابعاد کو وسیع تر تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔



زبان وتعلیم کا موضوع کسی بھی علمی وادبی معاشرے کی بنیادی ضرورتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ زبان محض خیالات کے اظہار کا وسیلہ نہیں، بلکہ تہذیبی شناخت، اجتماعی یادداشت اور انسانی تجربات کی امین بھی ہوتی ہے۔ تعلیم اس زبان کے علمی سرمایے کو سمجھنے، اسے نئی نسل تک منتقل کرنے اور اس کے امکانات کو وسعت دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لیے زبان اور تعلیم کے باہمی رشتے پر گفتگو دراصل علمی ترقی، فکری تربیت اور تہذیبی تسلسل کے اہم سوالات سے بحث کرنا ہے۔ اسی طرح تلاش وتحقیق کا گوشہ علمی دیانت، مستند معلومات اور نئے نتائج تک پہنچنے کی جستجو کو نمایاں کرتا ہے۔ تحقیق کسی بھی موضوع کے بارے میں پہلے سے قائم تصورات کو جانچنے، دستیاب شواہد کا تجزیہ کرنے اور نئی حقیقتوں کو سامنے لانے کا نام ہے۔ ادبی تحقیق کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے ذریعے تخلیقات، ادبی شخصیات اور تاریخی رجحانات کو محض روایت یا مشہور آرا کی بنیاد پر نہیں، بلکہ علمی دلائل کی روشنی میں سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ خراجِ عقیدت اور شخصیت کے عنوانات علم وادب کی ان شخصیات کی خدمات کو یاد کرنے اور ان کے کارناموں کا جائزہ لینے کی طرف متوجہ کرتے ہیں جنھوں نے اپنے علم وفکر، نظریہ وعمل اور تخلیقی صلاحیتوں سے علمی وادبی روایت کو تقویت پہنچائی۔ کسی بھی شخصیت کو یاد کرنا صرف اس کے ماضی کے کارناموں کا ذکر کرنا نہیں بلکہ اس کی خدمات کی معنویت کو موجودہ عہد کے تناظر میں سمجھنا بھی ہے۔ اس عمل میں تنقیدی بصیرت اور ادب واحترام کو متوازن انداز میں ملحوظ رکھنا ضروری قرار پاتا ہے۔

اس شمارے کے موضوعاتی تنوع میں گوشہ اختر الایمان بھی شامل ہے، جو اردو نظم کے ایک اہم شاعر کی شخصیت اور فن کو احاطہ تحریر میں لیتا ہے۔ اختر الایمان نے اپنی شاعری میں سماجی رویوں اور فرد کی داخلی کشمکش کو منفرد انداز میں پیش کیا۔ ان کا شعری اسلوب روایتی اظہار سے مختلف ہے اور ان کی نظموں میں زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے اور ان پر سوال اٹھانے کا رجحان نمایاں ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ اردو نظم کے ارتقا، جدید شعری حسیت اور بدلتے ہوئے فکری رویوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ کسی اہم شاعر کے فن پر توجہ دینے کا مقصد صرف اس کی ادبی عظمت کا اعتراف کرنا نہیں، بلکہ اس کے تخلیقی تجربات اور فکری انفرادیت کو نئے زاویوں سے دیکھنا بھی ہے۔ اس حوالے سے 'گوشہ اختر الایمان' قارئین کے لیے مفید و بامعنی ثابت ہوسکتا ہے۔ موجودہ دور میں جب مطالعے کے طریقے تیزی سے بدل رہے ہیں اور معلومات کی فراوانی کے باوجود سنجیدہ مطالعے کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوتا جارہا ہے، ایسے شماروں کی ضرورت مزید بڑھ جاتی ہے جو متنوع موضوعات کو علمی سنجیدگی اور ادبی سلیقے کے ساتھ پیش کریں۔ امید ہے کہ رسالہ اردو دنیا کا یہ شمارہ قارئین کے ادبی ذوق کو وسعت بخشنے کے ساتھ، اردو زبان وادب کے مختلف پہلوؤں سے ان کی دلچسپی میں اضافہ کرنے اور علمی وتخلیقی مباحث کے لیے نئی راہیں کھولنے میں معاون ثابت ہوگا۔

شمس اقبال

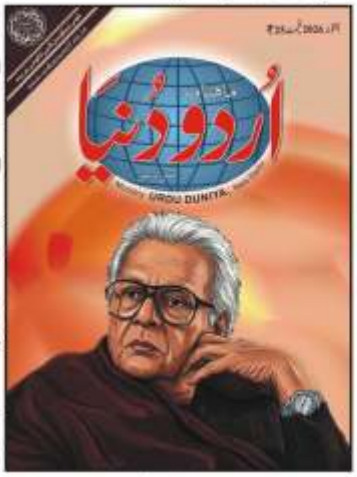


آپ کی بات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے تاثرات شائع کرنے کا مقصد رسالے کے مشمولات کے تئیں قارئین کی آرا سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ رسالے کے قلمکاروں اور قارئین سے گذارش ہے کہ مشمولات کے حوالے سے اپنے تاثرات ارسال کرنے کی زحمت کریں اور نئے موضوعات، مسائل، علاقوں اور ادبی و علمی شخصیات سے بھی مطلع فرمائیں۔ خطوط کی شکل میں موصول ہونے والے آپ کے یہ تاثرات ہمارے لیے بے حد اہم ہیں کیوں کہ ہمیں ان سے رسالے کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

معنوی اور صوری خوبیوں کی بنا پر ماہنامہ 'اردو دنیا' وقیع رسالہ ہے۔ یہ ادب و ثقافت، زبان و تعلیم، فنون لطیفہ کے مختلف اصناف اور حیات و کائنات کے مختلف النوع موضوعات کی پیشکش میں انوکھے پن اور انفرادیت کا حامل ہے کہ یہ تینوں زمانے، ماضی، حال اور مستقبل کو اپنے دامن میں سمیٹے اور سجائے ہوتا ہے۔

ماضی کے قلمکاروں کی بازیافت اور خراجِ عقیدت، حال کے ادب و شعر اور ثقافت و زبان کی جھلکیاں، اور تعلیم و تدریس، ادب اطفال اور ڈیجیٹل دنیا کی حیات انسانی میں بڑھتی اور پھیلتی پیش رفت اور ہلچل کے توسط سے یہ نئی نسل کے راہنما کے روپ میں بھی اجاگر ہے۔



تازہ شمارہ اکتوبر 2026 نہایت جامع اور معلوماتی شمارہ ہے، بلکہ سابقہ شماروں سے کچھ زیادہ ہی مرصع اور مسجع ہے۔ اس میں شامل گوشۂ راہی معصوم رضا خاصا وقیع ہے، یہ اس شمارہ کے وقار اور معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔

اس گوشہ میں راہی معصوم رضا کی ادبی شخصیت اور ان کے بطور شاعر، ناول نگار، مکالمہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر، شناخت اور اہمیت کے تعلق سے، نہاں رباب نے پدم شری جناب مظفر علی سے ایک انٹرویو کیا ہے، اس گفتگو میں راہی معصوم رضا کے ادب و شعر اور زبان کے تعلق سے رجحان و میلان اور رویے کا بطریق احسن اظہار ہوا ہے۔ اس انٹرویو کے علاوہ اس گوشہ میں چھ اہم اور مختلف النوع موضوعات کو محیط مضامین شامل ہیں جن کے ذریعے راہی معصوم رضا کی ادبی شخصیت اور مختلف النوع اساسی پہلوؤں کی توضیحی، تخیلی معانی اور شاعری کے تجزیاتی مطالب کو بڑی عمدگی سے منکشف کیا گیا ہے۔ یوں یہ گوشہ خاصا وقیع ہے۔

نہاں رباب نے مظفر علی سے انٹرویو میں اپنے سوالوں کے ذریعے راہی معصوم رضا کی تخلیق کے پوشیدہ پہلو، ان کی بنیادی تخلیقی قوت، ان کے ناولوں کے کرداروں کی تشکیل کا بنیادی سرچشمہ وغیرہ جیسے اہم نکتوں پر گفتگو کی ہے۔ مظفر علی نے ان کی تخلیقی شخصیت کے تشریحی بیان میں راہی معصوم رضا کا یہ شعر پیش کیا ہے۔

انساں تھا کسی اور کا سایہ بھی نہیں تھا ہر ڈھونڈنے والے کو وہ ملتا بھی نہیں تھا

یہ انٹرویو راہی معصوم رضا کی تخلیقی کائنات کے اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے۔

'نوآبادیاتی مزاحمت کا شعری استعارہ، راہی کا رزمیہ 1857' کے زیرعنوان شافع قدوائی نے راہی معصوم رضا کی متعلقہ نظم کے تعلق سے تفصیلی، استدلالی اور تحقیقی انداز تحریر میں نہ صرف نظم 1857 کا پس منظر اور نظم کی تخلیقی حیثیت کی توضیح کی ہے، بلکہ مضمون کے ابتدا میں رزمیہ کا موثر اور قابل قدر تعارف بھی پیش کیا ہے۔ شافع قدوائی کا یہ مضمون اپنی اثر انگیزی کے اعتبار سے اس گوشہ کی اہمیت اور وقار میں اضافہ بھی کرتا ہے۔

'ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی شخصیت اور ان کا فن' میں انیس امروہوی نے ان کی ولادت، خاندان، ابتدائی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، شادی، فلموں سے وابستگی، ایوارڈ، اور ان کے ناولوں کے تعلق سے اہم معلومات بڑے سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کی ہیں۔ معصوم مرادآبادی نے اپنے مضمون 'راہی معصوم رضا ایک وسیع الذہن تخلیق کار' میں کئی اہم نکتوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے مطابق راہی معصوم رضا کی زیادہ تر تخلیقات ہندی میں شائع ہوئیں، لیکن انھوں نے 'آدھا گاؤں' اور 'مہابھارت' کے مکالمے اردو میں لکھے، جنھیں بعد میں دیوناگری میں تبدیل کیا گیا۔ انھوں نے ان کے ادبی سفر کے تذکرہ میں رومان (الہ آباد) میں شاہد اختر کے فرضی نام سے راہی معصوم رضا کے ناول لکھنے کا ذکر کیا ہے۔ معصوم مرادآبادی کا مضمون کئی پوشیدہ گوشے اجاگر کرتا ہے۔ صدر عالم گوہر نے اپنے مضمون 'راہی معصوم رضا، ادب سے پردۂ سیمیں تک' میں ان کے ناول 'آدھا گاؤں' کو ان کی شہرت اور شناسائی کا وسیلہ گردانا ہے، لیکن ان کے دیگر ناولوں میں بیباکی اور تخلیقی آزادی کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ مہابھارت میں ان کے ماتا شری، پتا شری اور بھراتا شری جیسے تہذیبی الفاظ کے استعمال کو وہ لسانی اختراع اور زبان کا دلچسپ پہلو قرار دیتے ہیں۔ یہ مضمون ادب اور پردۂ سیمیں سے متعلق راہی معصوم رضا کے تخلیقی جوہر کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ مظفر حسین غزالی نے اپنے مضمون 'راہی معصوم رضا کا جہانِ شعر' میں ان کی شاعری کے محاسن کو خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ ان کے مطابق راہی معصوم رضا کی شعری کائنات میں محبت، تنہائی، ہجرت، یاد، سماجی اضطراب، سیاسی شعور آزادی پسندی،

خودداری اور انسان دوستی کے جذبات نمایاں ہیں۔ منتظر قائمی نے 'راہی معصوم رضا، طلسم ہوش ربا سے مہابھارت تک' کے زیرعنوان اپنا مضمون پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں ان کے ادبی سفر کی داستان رقم ہے۔ راہی معصوم رضا کے اس تخلیقی سفر میں ان کے ناولوں اور ان کی نظم 'رزمیہ 1857' سے متعلق راست گفتگو کی گئی ہے۔ ان کے رجحان ومیلان کے تعلق سے مضمون نگار کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقات میں یہاں کی مٹی، رنگ، موسم، ادب تہذیب اور ثقافت سب میں ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھا ہے؛ جہاں انسان کو اس کے مذہب، ذات، رنگ، نسل میں تقسیم کرکے نہ دیکھا جائے۔ ان کا یہ مضمون راہی معصوم رضا کے ادبی سفر کا مکمل احاطہ پیش کرتا ہے۔

ابوہریرہ کے مضمون 'راہی معصوم رضا کے ناولوں کا اجمالی جائزہ' میں ان کے ناول محبت کے سوا، آدھا گاؤں، ٹوپی شکلا، ہمت جونپوری، اوس کے بوند، دل سادہ کاغذ، سین 75، کٹرا بی آرزو، اسنتوش کے دن اور نیم کا پیڑ کا تنقیدی اور اثر انگیز جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون راہی معصوم رضا کی ناول نگاری کے موضوعات اور فنی برتاؤ کا بہترین مطالعہ ہے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے متذکرہ شمارہ میں محض گوشۂ راہی معصوم رضا ہی ایک جاذب توجہ اور پرکشش حصہ نہیں بلکہ اس شمارہ کے دیگر مضامین مثلاً یگانہ بحوالہ نیر مسعود (معید الرحمٰن)، فضا ابن فیضی کی رباعی نگاری (امتیاز ندیم) اور بانو سرتاج قومی یکجہتی کی علمبردار مصنفہ (قیام نیر) بھی موضوع اور انداز پیشکش کے اعتبار سے اہم مضامین ہیں، یعنی

راہ مضمون تازہ بند نہیں تا قیامت کھلا ہے باب سخن

عشرت ظہیر: ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی، موبائل: 9801527481

ماہنامہ 'اردو دنیا' قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والا معروف ومشہور رسالہ ہے جس کی شروعات 1999 میں ہوئی تھی۔ اس رسالے نے تقریباً 27 سال پورے کر لیے ہیں۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' نے اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے ساتھ مختلف علوم وفنون کی بھی آبیاری کی ہے، آج بھی اس کے شماروں میں عصری شعور، عصری حسیت، عصری آگہی کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ہر شمارے کے مشمولات میں نئی معنویت اور جدت وندرت پائی جاتی ہے۔ بیشتر مضامین میں کچھ نہ کچھ نیا پن دیکھنے کو ملتا ہے۔ اردو معاشرہ میں ایسا صاف شفاف رسالہ نکالنا بڑی عرق ریزی کا کام ہے۔ اس کا ادار یہ ہمیشہ سے معلوماتی رہا ہے۔ اس شمارے میں چنار بک فیسٹیول 2026 کی افتتاحی تقریب کے ساتھ دیگر ادبی تقاریب کے شرکا کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ رپورٹ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اس بار کا چنار بک فیسٹیول نہایت کامیاب رہا۔ 'ہماری بات' میں مدیر ڈاکٹر شمس اقبال کہتے ہیں کہ ''چنار بک فیسٹیول 2026 اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کی فکر دونوں ہمیں ایک ہی بنیادی بات کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ کسی معاشرے کی حقیقی ترقی علم، مطالعے اور فکر کی بیداری سے ہوتی ہے۔''

قومی یوم اساتذہ ذیلی عنوان کے تحت ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کی زندگی، ان کے کارنامے اور علمی ادبی تدریسی خصوصیت کو سلمان عبدالصمد نے موثر انداز سے پیش کیا ہے۔ ادب زاویے اور جہات میں ابوبکر عباد نے اساس ثلاثہ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور علی گڑھ پر ان اداروں کی کارکردگی، اسباب وعلل، کردار پر روشنی ڈالی ہے، لیکن علی گڑھ ادارہ کے کردار پر نہیں لکھا گیا ہے، اس پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ خان محمد رضوان نے علامہ جمیل مظہری کی فکری جہات پر، ان کے حالات زندگی، ادبی علمی خدمات، فکر وفن پر اشعار کے حوالوں سے بحث کی ہے۔ وارث علوی اور افسانہ کی تنقید پر تنویر احمد نے صرف افسانہ کی تنقید سے سروکار رکھا ہے، تمہید میں وارث علوی کے تنقیدی کارناموں پر روشنی ڈالتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ غالب حیات نو کا استعارہ (ریاض احمد) نے خوب لکھا ہے۔ مہرالنسا کا مضمون 'ویریندر پٹواری ان کے افسانوں میں کشمیر کا ذکر' معلومات سے پر ہے۔ اردو میں نسوانی شاعری کی روایت (وجے کمار) بھی خوب ہے۔ صدام حسین نے 'سودا کا قصیدہ تضحیک روزگار ایک مطالعہ' میں گھوڑے کو علامت بنا کر مغل سلطنت کا نظام حکومت، سیاسی، سماجی، معاشی سسٹم پر طنز وہجو کو پیش کیا ہے۔ جہان ترجمہ میں تمل ناڈو کے دو شاعر گنڈ وعبدالقادر شاکر (سید سجاد حسین)، اردو ادب میں ولیم محمد بشیر نے 'تراجم کا ایک جائزہ' میں ان کی ترجمہ شدہ کتابوں کا تعارف اور ترجمہ کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ منور لکھنوی نے سنسکرت سے اردو میں بہت ترجمے کیے ہیں۔ فلم وتھیٹر کا رنگ منچ کے تحت 'ہندوستان میں فلم کا آغاز اور اس کی ترقی کے مراحل' مجید بیدار نے اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ تھیٹر کے بعد فلم کا دور شروع ہوگیا، اس سے بیشتر لوگ واقف ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ تحریریں بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ واکیڈمک سینٹ ممبر، تلنگانہ یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ، موبائل: 9603018825

پیش نظر شمارہ ستمبر 2026 کے مضامین میں صنفی تنوع وجلت کے باعث نیا پن نظر آتا ہے۔ اساس ثلاثہ: 'فورٹ ولیم کالج دہلی کالج اور علی گڑھ کالج (ابوبکر عباد) لائق استفادہ مضمون ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے لگا کہ استاد واقعی استاد ہوتے ہیں۔ ان کی تحریریں بھی ان کی غیر موجودگی میں رہنمائی کرتی ہیں۔ قومی اساتذہ (سلمان عبدالصمد)، لوک داستانیں اور ہندی سنیما (احمد خان) سے طبیعت محظوظ ہوئی۔ یہ شمارہ کئی لحاظ سے ایک اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔

'جہان ترجمہ' کے تحت تمل ناڈو کا ایک باکمال شاعر: گنڈ وعبدالقادر شاکر (سید سجاد حسین)، اردو ادب میں ولیم محمد بشیر: تراجم کا ایک جائزہ (عارف این)، منور لکھنوی: بحیثیت سنسکرت اردو مترجم (محمد اسجد) نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ مضمون کیا ہیں علم وانکشاف اور ادراک وآگہی کا ایک سمندر ہیں۔ یہ وہ مضامین ہیں جس کا ہر لفظ گویا گنجینۂ معنی کا ایک طلسم ہے۔

اس کے علاوہ خان محمد رضوان، تنویر احمد، ریاض احمد، وجے کمار، مہرالنسا، صدام حسین، محمد فیضان، مجید بیدار، شارق محمد عزیز غرض کے سبھی اپنے اپنے میدان کے شہسوار ہیں۔ ہر بار 'اردو دنیا' کے بعض مضامین علمی روشنی کے ساتھ چونکاتے بھی ہیں۔ اس شمارے میں ادب زاویے اور جہات کے متعلق قلمکاروں کی تحریر اچھی لگی۔ چنار بک فیسٹیول 2026 کی تفصیلی رپورٹ پڑھی اور تصاویر بھی دیکھیں، دل خوش ہوگیا۔

قومی اردو کونسل کی معرفت ''اردو دنیا'' کے چراغ کی لو کو نہایت سلامت روی کے ساتھ مدیر کی حیثیت سے ڈائرکٹر صاحب کے بعد منتظم، نائب، معاون، اور معاونین مدیران، شعبۂ ادارت کو نیک خواہشات کے ساتھ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر حبیب سیفی: حوض رانی، نئی دہلی

■

ادارہ

دو روزہ قومی سمینار (حیدرآباد)



ہندوستان صدیوں سے مختلف زبانوں، تہذیبوں، ادبی روایتوں اور ثقافتی تجربات کے باہمی میل جول کا ملک رہا ہے۔ یہاں زبانوں نے ایک دوسرے سے محض الفاظ اور محاورات ہی اخذ نہیں کیے بلکہ خیالات، اسالیب اظہار، ادبی اصناف اور تہذیبی اقدار کے تبادلے کے ذریعے ایک مشترکہ ثقافتی ورثے کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس تناظر میں اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے لسانی، ادبی و ثقافتی روابط کا مطالعہ ہندوستان کی کثیر لسانی شناخت، تہذیبی تنوع اور مشترکہ تاریخی شعور کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

زبان کسی معاشرے میں محض ابلاغ کا وسیلہ نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کی اجتماعی یادداشت، تاریخی تجربات، معاشرتی رویوں اور تہذیبی اقدار کی امین بھی ہوتی ہے۔ اردو کی تشکیل و ترویج ہندوستان کے اسی کثیر لسانی ماحول میں ہوئی، جہاں مقامی بولیوں اور زبانوں کے ساتھ فارسی اور عربی کے اثرات نے اس کے ذخیرۂ الفاظ، اسلوب اور ادبی مزاج کو وسعت عطا کی۔ امیر خسرو کی ہندوی روایت، دکنی ادب، صوفی اور بھکتی تحریکوں کی ادبی روایت اور جدید ہندوستانی ادب اس باہمی تعامل کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اردو ادب کی شعری و نثری روایت میں ہندوستانی زندگی کے مختلف رنگ نمایاں ہیں۔ کلاسیکی شاعری، داستان، افسانہ، ناول، ڈراما اور صحافت نے یہاں کے سماجی تجربات، عوامی احساسات، رسم و رواج اور تہذیبی تنوع کو اپنے اظہار کا حصہ بنایا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادب میں بھی ایسے موضوعات اور تجربات ملتے ہیں جو مختلف لسانی روایتوں کے درمیان فکری اور تہذیبی قربت کو واضح کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے زبانوں کے باہمی روابط کا مطالعہ محض لسانی اثرات کی نشان دہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ مشترکہ انسانی تجربات اور تہذیبی اقدار کی تفہیم کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔ ان روابط کو مضبوط بنانے میں ترجمے کا کردار بھی غیرمعمولی اہمیت رکھتا ہے۔ ترجمہ مختلف زبانوں کے ادبی سرمائے، فکری مباحث اور ثقافتی تجربات کو وسیع تر قارئین تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ زبانوں کے درمیان مکالمے اور افہام و تفہیم کی راہیں ہموار کرتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے باہمی اشتراک سے منعقدہ یہ دو روزہ قومی سمینار اسی علمی و تحقیقی ضرورت کے تحت عمل میں آیا۔ اس کا مقصد اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے باہمی رشتوں، مشترکہ ادبی روایتوں اور ثقافتی روابط کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدہ علمی مکالمے کو فروغ دینا ہے۔ اسی پس منظر میں سمینار کے افتتاحی اجلاس اور مختلف تکنیکی نشستوں میں اہل علم نے موضوع کے متنوع پہلوؤں پر اپنے خیالات اور تحقیقی نتائج پیش کیے۔





پہلا دن: 23/ ستمبر، 2026

سی پی ڈی یو ایم ٹی آڈیٹوریم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، بہ اشتراک مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، دوروزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو اور دیگر ہندوستانی زبانیں: لسانی، ادبی و ثقافتی روابط' کا انعقاد کیا گیا، جس کے پہلے دن افتتاحی اجلاس کے علاوہ تین تکنیکی اجلاس منعقد ہوئے۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر سید عین الحسن (وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) نے کی۔ اس اجلاس کے دیگر شرکا میں پروفیسر ایس کے اشتیاق احمد (رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)، ڈاکٹر محمد شمس اقبال (ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)، پروفیسر گلفشاں حبیب (ڈین، اسکول آف لینگویجز، لنگوسٹکس اینڈ انڈولوجی، مانو، حیدرآباد)، پروفیسر محمد نسیم الدین فریس (سابق ڈین، اسکول آف لینگویجز، لنگوسٹکس اینڈ انڈولوجی، مانو، حیدرآباد) اور ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، شامل رہے۔

صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر سید عین الحسن نے کہا کہ قومی اردو کونسل اور مانو کا امتزاج فطری امتزاج ہے، جس کی کوششوں میں زبان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ زبان اگر اپنی شناخت باقی رکھتی ہے تو یہ زندگی کے کسی بھی میدان میں ماند نہیں پڑتی۔ زبان اپنا راستہ خود بناتی ہے، جس کا خوبصورت سلسلہ شاعری سے شروع ہوتا ہے۔ زبان بولی جانے کے ساتھ ساتھ خاموشی سے بھی اپنا گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ انھوں نے اردو زبان سے پیدا ہونے والی کیفیات پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو میں یہ کیفیات دوسری زبانوں سے اختلاط اور میل جول سے ہی پیدا ہوئی ہیں۔

مہمانِ اعزازی پروفیسر اشتیاق احمد نے سمینار کے موضوع کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ بہت ہی وسیع اور متنوع موضوع ہے، جس پر کافی علمی اور بامعنی گفتگو ہو سکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ماہرین اپنے مقالات میں اس پر بہتر انداز میں روشنی ڈالیں گے۔

افتتاحی کلمات میں ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے سمینار کے موضوع کی معنویت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا یہ سمینار ایسی جگہ، یعنی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں منعقد ہو رہا ہے، جو اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ قومی اردو کونسل نے زبان کے حوالے سے جو سمینار منعقد کیے یا کر رہی ہے، ان میں کونسل کی یہ کوشش رہی ہے کہ زبان کے ذریعے ہندوستان کی تکثیریت پر بھرپور گفتگو ہو اور زبان کی خوبصورتی کے ساتھ اس کی مختلف خوبیوں کو بھی واضح کیا جا سکے۔ قومی اردو کونسل نے اسی مقصد کے پیش نظر گزشتہ ڈھائی برسوں میں دو عالمی





کانفرنسوں کے ساتھ ملک کے الگ الگ خطوں میں اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے تہذیبی، ثقافتی اور لسانی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سمینارز اور پینل ڈسکشن منعقد کیے ہیں۔ یہ سمینار بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے مزاج میں ہندوستانیت شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے دوسری زبانوں سے جوڑ کر دیکھنے سے ہندوستان کے تکثیری سماج کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مانو اور قومی کونسل مل کر مستقبل کے ہندوستان کی تعمیر میں اس زبان کے ذریعے اہم کردار ادا کر سکتی ہیں اور 'وکست بھارت 2047' کے وژن کو عملی طور پر مضبوطی عطا کرنے میں اس کا رول کلیدی ہوسکتا ہے۔

استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے پروفیسر گلفشاں حبیب نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور اس دو روزہ سمینار کے مقاصد پر بھی روشنی ڈالی۔

کلیدی خطبے میں پروفیسر محمد نسیم الدین فریس نے اردو کی لسانی، ادبی اور تہذیبی روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے تینوں کے تاریخی تناظر اور عملی جہت کو واضح کیا اور کہا کہ زبانوں کے باہمی اختلاط سے اخذ و قبول کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جس کے گہرے اثرات ایک دوسرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ سنسکرت اور تدبھو کے بغیر اردو کے جملے لکھنا محال ہے، اس لیے کہ اس کا بنیادی ڈھانچہ ہند آریائی ہے۔ اردو نے مختلف علاقوں کی بولیوں سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔ اس حوالے سے یہ بہت ہی سیال زبان رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بہت سی کہاوتیں، محاورے اور تلمیحات ایسی ہیں جو ہندستانی تہذیب کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ انھوں نے اردو کی مختلف شعری اصناف سے اس کی بہت سی مثالیں بھی پیش کیں۔ ساتھ ہی اس ضمن میں ترجمے کی اہمیت اور اس کے کردار پر بھی گفتگو کی۔ آخر میں ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے کلماتِ تشکر پیش کیے۔

افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض پروفیسر محمد عبدالسمیع صدیقی (ڈائرکٹر، سی پی ڈی یو ایم ٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) نے انجام دیے۔

پہلے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر رحمت یوسف زئی اور پروفیسر رشبھ دیو شرما نے کی۔ اس تکنیکی اجلاس میں پروفیسر شہاب ظفر اعظمی (اردو اور بہار کی علاقائی زبانیں: لسانی، ادبی اور ثقافتی تعلقات)، پروفیسر محمد جہانگیر وارثی (میتھلی اور اردو: لسانی اور تاریخی اشتراک)، پروفیسر نکہت جہاں (اردو پر پنجابی کا اثر: ماہیے کے حوالے سے)، پروفیسر مشتاق عالم قادری (اردو اور گوجری کے لسانی اشتراکات) اور جناب وقار قادری (مراٹھی دلت کتھا: ایک اجمالی جائزہ) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر نہاں رباب نے انجام دیے۔

دوسرے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد جہانگیر وارثی اور پروفیسر سید سجاد حسین نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر سید محمود کاظمی (فکر اقبال پر ہندوستانی فکر وفلسفے کے اثرات)، پروفیسر احمد خان (اردو پر بین اللسانی تہذیب کے اثرات: تاریخی تناظرات اور برج بھاشا کا خصوصی حوالہ)، جناب مکرم نیاز (ہندوستانی زبانوں سے اردو تراجم کا ڈیجیٹل ڈیٹا بیس: ضرورت، امکانات اور علمی افادیت)، ڈاکٹر طلحہ فرحان (فیروز اللغات میں حرف 'ہ' سے وارد ہندی اسما اور اس کی لسانی و معنوی جہتیں) اور ڈاکٹر رمیشہ قمر (کنڑا اور اردو کی ہم آہنگی کے کچھ رنگ) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس تکنیکی اجلاس میں نظامت کے فرائض جناب محمد فرقان عالم نے انجام دیے۔

تیسرے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیقی محمود اور پروفیسر وبھا شرما نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر عزیز بانو (دکنی شاہناموں کی روایت، جدید اردو شاہنامے اور ادبی اثرات: ایک تعارف)، پروفیسر سید شجاعت علی (اردو مراٹھی کا باہمی رشتہ: مختلف اصنافِ سخن کے حوالے سے)، پروفیسر فیروز عالم (کبیر: اردو کے تشکیلی عہد کی نمائندہ آواز) اور ڈاکٹر صابر علی سیوانی (اردو ہندی کے لسانی اور ثقافتی رشتے: کہاوتوں کے حوالے سے) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس تکنیکی اجلاس کی نظامت کے فرائض محترمہ عصمت فاطمہ نے انجام دیے۔

آخر میں مانو ڈراما کلب کی ٹیم نے 'رستم وسہراب' کے عنوان سے ڈراما پیش کیا۔





دوسرا دن: 24/ستمبر، 2026

سمینار کے دوسرے دن تین تکنیکی اجلاس منعقد ہوئے، جن میں مقالہ نگاروں نے موضوع سے متعلق مختلف مقالات پیش کیے۔

سمینار کے چوتھے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر سید محمود کاظمی اور پروفیسر فضل اللہ مکرم نے کی۔ اس میں پروفیسر فہیم الدین احمد، (قدیم ہندوستان میں ترجمے کی روایت: نظری مباحث)، پروفیسر افتخار احمد، (اردو اور بنگلہ کے لسانی، تہذیبی اور ادبی روابط)، ڈاکٹر اجے مالویہ [آن لائن] (اردو اور دیگر زبانیں: لسانی، ادبی اور ثقافتی روابط) اور محترمہ عصمت فاطمہ (دکنی اردو اور تیلگو کے باہمی لسانی روابط) نے اپنے مقالات پیش کیے۔

پروفیسر فضل اللہ مکرم نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ زبانیں اخذ و استفادہ سے ہی ترقی پاتی ہیں۔ اگر کسی بھی زبان نے اس عمل کو عملی طور پر نہیں برتا تو وہ تنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اردو زبان کی خوبصورتی ہی یہ ہے کہ اس نے لین دین کے عمل کو مسلسل جاری رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زبان تہذیبوں کے تنوع کو بھی واضح کرتی ہے۔ پروفیسر سید محمود کاظمی نے صدارتی خطاب میں سیشن کے تمام مقالات پر گفتگو کرتے ہوئے اردو الفاظ کے تہذیبی، ثقافتی اور لسانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ترجمہ نگاری کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس کے بنیادی نکات کی طرف بھی مفید اشارے کیے۔ اس تکنیکی اجلاس میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر صبا خاتون نے انجام دیے۔

پانچویں تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد نسیم الدین فریس نے کی۔ اس سیشن میں پروفیسر سید سجاد حسین (اردو اور ہندی کا لسانی، ادبی و ثقافتی اشتراک)، پروفیسر وبھا شرما (مسافر الفاظ کی کہانی) اور ڈاکٹر شاکر رضا (پدماوت میں استعمال ہونے والے عربی اور فارسی کے اہم الفاظ) نے اپنے مقالات پیش کیے۔

صدارتی خطاب میں پروفیسر محمد نسیم الدین فریس نے سیشن کے مقالات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ لسانی لین دین زبانوں کی خصوصیت ہوتی ہے۔ الفاظ مسافر ہوتے ہیں، لیکن زبانوں کے درمیان ان کی کوئی نہ کوئی منزل ضرور ہوتی ہے۔ اردو زبان کے تنوع کے پیش نظر اس کو کسی دائرے میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس تکنیکی اجلاس میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر جرار احمد نے انجام دیے۔

چھٹے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر شہاب ظفر اعظمی اور پروفیسر رضاء اللہ خان نے کی۔ اس میں پروفیسر ابو شہیم خان (اردو-ہندی زبان و ادب: وصل اور فصل کے درمیان)، پروفیسر آمنہ تحسین (دکن کی مشترکہ روایت اور نسائی ادب)، ڈاکٹر محمد جابر اور ڈاکٹر انوپما پال [آن لائن] (دکنی اردو، فارسی، عربی اور کنڑا زبان کے باہمی لسانی روابط) نے اپنے مقالات پیش کیے۔

صدارتی خطاب میں پروفیسر شہاب ظفر اعظمی نے سمینار کے موضوع کی اہمیت اور اس کے عملی تنوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کشمیر سے کنیا کماری تک ہم جو زبان بولتے اور محاورے ادا کرتے ہیں، یہ سمینار موضوعات کے تنوع میں اس کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے اس کی عمدہ مثال ہے۔ پروفیسر رضاء اللہ خان نے اپنے صدارتی خطاب میں اردو اور دیگر زبانوں کے حوالے سے جدید ٹیکنالوجی کے تناظر میں گفتگو کی اور کہا کہ زبانوں کے بنیادی تقاضوں کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تقاضوں، بالخصوص مصنوعی ذہانت کے چیلنجز کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔

اس تکنیکی اجلاس کے فوراً بعد اختتامی اجلاس منعقد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر سید علیم اشرف جائسی (پروفیسر ایمریٹس، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کنوینر سمینار) نے کی اور کلماتِ تشکر ڈاکٹر محمد شمس اقبال (ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) نے پیش کیے۔





اس میں پروفیسر مہ جبین غزال (میسور)، پروفیسر مشتاق عالم قادری (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) اور محمد سلمان (ریسرچ اسکالر، مانو، حیدرآباد) نے دوروزہ سمینار کے حوالے سے اپنے تاثرات پیش کیے۔ انھوں نے سمینار کے موضوع کی اہمیت اور اس میں پیش کیے گئے مقالات کے تنوع پر بھی گفتگو کی اور کہا کہ اس معنی میں وسعتِ فکر ونظر کے اعتبار سے یہ سمینار بہت ہی کامیاب اور معنی خیز رہا۔ ساتھ ہی گذشتہ ڈھائی برسوں میں قومی اردو کونسل کی جو سرگرمیاں رہی ہیں، انھوں نے ان کو بھی سراہا۔ پروفیسر علیم اشرف جائسی نے زبانوں کے لسانی، ادبی، تاریخی اور ثقافتی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ زبانوں کے الفاظ کے درمیان لین دین کے عمل سے تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں، جس کا صحیح اندازہ لسانی پہلوؤں کو پیش نظر رکھے بغیر ممکن نہیں۔ اس سمینار کے لیے موضوع کے انتخاب میں یہی فکر کارفرما رہی۔

ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے کلماتِ تشکر ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس سمینار کے موضوع کے تعلق سے ہماری جو سوچ تھی، اس اعتبار سے سمینار کامیاب رہا۔ اس میں مقالہ نگاروں نے معنی خیز گفتگو کی۔ انھوں نے زبانوں کے حوالے سے قومی اردو کونسل کے ذریعے گذشتہ ڈھائی برسوں میں منعقد کیے گئے سمینارز اور پروگراموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کونسل نے اردو زبان کے فروغ کے دائرے کو وسیع کرتے ہوئے قومی اہداف ومسائل سے جوڑنے کی کوششیں کی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم نے اردو اور ہندستانی زبانوں کے باہمی رشتوں کے ساتھ وکست بھارت کی تعمیر اور نئی تعلیمی پالیسی 2020 سے جڑے مختلف پہلوؤں کو اردو زبان سے مربوط کر کے کئی اہم اور کامیاب سمینارز، مذاکرے اور پینل ڈسکشنز کا اہتمام کیا ہے۔

آخر میں انھوں نے اس سمینار کے انعقاد میں معاون ادارے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، اس کے ذمے داران اور سمینار میں شرکت کرنے والے تمام اہل علم و دانش اور اساتذہ و طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔ آخری تکنیکی اجلاس اور اختتامی اجلاس کی نظامت کے فرائض جناب نایاب حسن نے انجام دیے۔

شام میں 'بزم سخن' کے عنوان سے مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر سید عین الحسن (وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد) نے کی جس میں جناب مصحف اقبال توصیفی، ڈاکٹر محسن جلگانوی، جناب سردار سلیم، جناب محبوب خان اصغر، پروفیسر مہ جبیں نجم غزال، جناب سیف نظامی، پروفیسر شیخ وسیم، پروفیسر افتخار احمد، شریف اطہر اور شیخ احمد ضیا نے اپنے کلام پیش کیے اور سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرہ کی نظامت پروفیسر محمد عبدالسمیع صدیقی نے کی۔



دو روزہ قومی سمینار کے مختلف اجلاس میں پیش کیے گئے مقالات اور اہلِ علم کے اظہارِ خیال سے یہ حقیقت نمایاں ہوئی کہ اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے روابط ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ زبانوں کے درمیان الفاظ، محاورات، ادبی اسالیب اور فکری تجربات کا تبادلہ ان کی ترقی و وسعت کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس علمی اجتماع نے واضح کیا کہ ہندوستان کی لسانی تکثیریت محض مختلف زبانوں کی موجودگی کا نام نہیں بلکہ باہمی استفادے، مکالمے اور تہذیبی اشتراک کا ایک مسلسل عمل ہے۔

سمینار میں ترجمے کی اہمیت، ادبی روایتوں کے باہمی اثرات، لسانی تنوع اور جدید ٹیکنالوجی کے امکانات وچیلنجز پر ہونے والی گفتگو نے موضوع کی وسعت کو مزید نمایاں کیا۔ اس طرح یہ سمینار اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے درمیان علمی و تحقیقی روابط کو مستحکم کرنے اور مشترکہ ادبی و ثقافتی سرمائے کی تفہیم کو فروغ دینے کی ایک بامعنی کوشش ثابت ہوا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کا یہ باہمی اشتراک اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس کے ذریعے زبان وادب کے فروغ کو وسیع تر قومی اور تعلیمی تناظر سے مربوط کیا گیا۔ ایسے علمی اجتماعات مستقبل میں بین اللسانی مکالمے، ترجمے، تحقیقی تعاون اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی روایت کے تحفظ وفروغ کے لیے نئی راہیں ہموار کر سکتے ہیں





ٹیکنو پیڈاگوجی

اور طلبہ کی ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت

سید رضاء الرحمان

اکیسویں صدی کو معلومات، مواصلات اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کی صدی قرار دیا جاتا ہے، جس نے انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی طرح تعلیم کے میدان میں بھی نمایاں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ جدید تعلیمی نظام میں تدریس کا مقصد محض معلومات کی منتقلی نہیں بلکہ طلبہ میں تخلیقی فکر، تنقیدی تجزیہ، مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت اور موثر ابلاغ جیسی اعلیٰ علمی مہارتوں کو فروغ دینا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے تدریسی عمل میں معلوماتی و مواصلاتی ٹیکنالوجی (ICT) کے موثر اور بامقصد استعمال کو خصوصی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ تکنیکی علم تدریس (Techno-Pedagogy) ایک جدید تدریسی تصور ہے، جس میں ٹیکنالوجی اور تدریسی اصولوں کو اس انداز میں یکجا کیا جاتا ہے کہ تدریس زیادہ موثر، دلچسپ، طلبہ مرکوز اور نتائج پر مبنی بن جائے۔ اس طریقۂ تدریس میں اساتذہ مختلف ڈیجیٹل وسائل، انٹرایکٹو سافٹ ویئر، ملٹی میڈیا، اسمارٹ کلاس روم، آن لائن پلیٹ فارمز اور دیگر جدید تعلیمی ذرائع کو تدریسی حکمتِ عملی کے ساتھ مربوط کر کے طلبہ کے سیکھنے کے تجربات کو بہتر بناتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں طلبہ نہ صرف علمی تصورات کو بہتر انداز میں سمجھتے ہیں بلکہ ان میں تخلیقی اور تنقیدی سوچ بھی فروغ پاتی ہے۔ ریاضی ایک ایسا مضمون ہے جس میں محض قواعد اور فارمولوں کو یاد کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ منطقی استدلال، تجزیاتی فکر، تخلیقی سوچ اور نئے طریقوں سے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت بھی ضروری ہوتی ہے۔ اسی لیے ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت (Mathematical Creativity) کو جدید ریاضیاتی تعلیم کا ایک اہم مقصد تصور کیا جاتا ہے۔ یہ صلاحیت طلبہ کو نئے خیالات پیدا کرنے، مختلف حکمتِ عملی کے ذریعے مسائل کا حل تلاش کرنے، متبادل طریقے اختیار کرنے اور ریاضیاتی تصورات کو تخلیقی انداز میں استعمال کرنے کے قابل بناتی ہے۔ حالیہ برسوں میں متعدد تحقیقی مطالعات نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ٹیکنو پیڈاگوجی پر مبنی تدریس طلبہ کی تعلیمی کامیابی، سیکھنے کی دلچسپی، مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت اور بالخصوص ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت میں مثبت کردار ادا کرتی ہے۔ ٹیکنالوجی کی مدد سے طلبہ کو بصری، عملی اور تعاملی (Interactive) انداز میں سیکھنے کے مواقع میسر آتے ہیں، جس سے ان کی فکری وسعت اور تخلیقی استعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔

ٹیکنو پیڈاگوجی (تکنیکی علمِ تدریس)

ٹیکنو پیڈاگوجی (Techno-Pedagogy) جدید تدریسی نظریات پر مبنی ایک اہم تصور ہے، ۔ اس کا بنیادی مقصد محض کلاس روم میں ٹیکنالوجی کا استعمال نہیں بلکہ اسے تدریسی مقاصد کے مطابق اس انداز میں بروئے کار لانا ہے کہ طلبہ کے سیکھنے کے تجربات میں بہتری آئے اور تعلیمی نتائج زیادہ موثر ہوں۔ ٹیکنو پیڈاگوجی کی نظریاتی بنیاد ٹی پی اے سی کے (TPACK) ماڈل پر قائم ہے، جسے مشرا اور کوہلر نے پیش کیا۔ اس ماڈل کے مطابق موثر تدریس اس وقت ممکن ہوتی ہے جب استاد موضوعی علم، تدریسی علم اور تکنیکی علم کے درمیان مناسب توازن اور ہم آہنگی قائم کرے۔ اس تصور کے تحت ٹیکنالوجی تدریسی عمل کا ایک لازمی جزو بن جاتی ہے اور سیکھنے کے عمل کو مزید موثر، دلچسپ اور بامعنی بناتی ہے۔ موجودہ دور میں ٹیکنو پیڈاگوجی کے تحت مختلف ڈیجیٹل وسائل، جیسے اسمارٹ بورڈ، ملٹی میڈیا پریزنٹیشن، جیوجبرا، تعلیمی سافٹ ویئر، آن لائن لرننگ پلیٹ فارمز، ورچوئل لیبارٹریز اور مصنوعی ذہانت پر مبنی تعلیمی اوزار استعمال کیے جا رہے ہیں۔ ان وسائل کی مدد سے طلبہ کو عملی، بصری اور تعاملی انداز میں سیکھنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں، جس سے ان کی دلچسپی، شرکت اور تعلیمی کارکردگی میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔

(Koehler & Mishra, 2009)

ٹیکنو پیڈاگوجی کی اہم خصوصیات

ٹیکنو پیڈاگوجی میں طلبہ کو سیکھنے کے عمل کا مرکز بنایا جاتا ہے اور انھیں مختلف ڈیجیٹل وسائل، عملی سرگرمیوں، باہمی تعاون اور مسئلہ حل کرنے پر مبنی تدریسی سرگرمیوں میں شریک کیا جاتا ہے۔ ٹیکنو پیڈاگوجی نہ صرف تدریسی عمل کے معیار کو بہتر بناتی ہے بلکہ اکیسویں صدی کی مہارتوں اور خودمختار سیکھنے کی صلاحیتوں کو بھی فروغ دیتی ہے۔ ذیل میں ٹیکنو پیڈاگوجی کی اہم خصوصیات بیان کی جارہی ہیں۔

ٹیکنالوجی اور تدریسی حکمتِ عملی کا موثر انضمام

ٹیکنو پیڈاگوجی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ٹیکنالوجی کو صرف معلومات کی ترسیل کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ اسے موثر تدریسی حکمتِ عملی کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے۔ استاد مختلف ڈیجیٹل ٹولز، سافٹ ویئر، آن لائن پلیٹ فارمز اور ملٹی میڈیا وسائل کو تدریسی مقاصد کے مطابق استعمال کرتا ہے، جس سے سیکھنے کا عمل زیادہ موثر، منظم اور بامقصد بن جاتا ہے۔

طلبہ مرکوز اور سرگرمی پر مبنی تدریسی عمل

ٹیکنو پیڈاگوجی میں طلبہ تدریسی عمل کا مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ انھیں مختلف ڈیجیٹل سرگرمیوں، گروہی منصوبوں، عملی مشقوں اور تحقیقی کاموں میں فعال شرکت کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ اس فعال شرکت سے طلبہ کی دلچسپی، خود اعتمادی اور سیکھنے کی استعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔

ڈیجیٹل وسائل کے بامقصد اور موثر استعمال پر زور

اس تدریسی طریقے میں ویڈیوز، انیمیشنز، تعلیمی ایپس، اسمارٹ بورڈ، ورچوئل لیبارٹریز، آن لائن سمولیشنز اور دیگر ڈیجیٹل وسائل کو تدریسی مقاصد کے حصول کے لیے موثر انداز میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان وسائل کی مدد سے طلبہ مشکل تصورات کو آسانی سے سمجھتے ہیں اور ان کا سیکھنے کا تجربہ زیادہ دلچسپ اور موثر بن جاتا ہے۔

تنقیدی، تخلیقی اور تجزیاتی سوچ کی حوصلہ افزائی

ٹیکنو پیڈاگوجی طلبہ کو مختلف مسائل کا تجزیہ کرنے، معلومات کا تنقیدی جائزہ لینے، نئے خیالات پیش کرنے اور اختراعی حل تلاش کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ مختلف ڈیجیٹل سرگرمیوں اور تحقیقی منصوبوں کے ذریعے ان میں تنقیدی، تخلیقی اور تجزیاتی سوچ کی مضبوط بنیاد قائم ہوتی ہے۔

باہمی تعاون اور خود مختار آموزش کا فروغ

ٹیکنو پیڈاگوجی طلبہ کو گروہی سرگرمیوں، آن لائن مباحثوں، مشترکہ منصوبوں اور اشتراکی تعلیم کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ ساتھ ہی انھیں خود معلومات تلاش کرنے، سیکھنے کی رفتار کو منظم کرنے اور اپنی تعلیمی ذمہ داری قبول کرنے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے، جس سے خود مختار سیکھنے کی صلاحیت پروان چڑھتی ہے۔

حقیقی زندگی کے مسائل کو تدریسی سرگرمیوں سے مربوط کرنا

اس طریقۂ تدریس میں طلبہ کو ایسے مسائل اور سرگرمیوں سے جوڑا جاتا ہے جو حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں۔ وہ ٹیکنالوجی کی مدد سے ان مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں، مختلف متبادل حل تلاش کرتے ہیں اور عملی صورتِ حال میں اپنے علم کا موثر استعمال کرتے ہیں۔ اس سے مسئلہ حل کرنے اور فیصلہ سازی کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

تدریس کو زیادہ دلچسپ، موثر اور نتائج پر مبنی بنانا

ٹیکنو پیڈاگوجی تدریسی عمل کو زیادہ پرکشش، تعاملی اور موثر بناتی ہے۔ مختلف ڈیجیٹل وسائل، بصری مواد اور انٹرایکٹو سرگرمیوں کے استعمال سے طلبہ کی توجہ برقرار رہتی ہے، سیکھنے میں دلچسپی بڑھتی ہے اور تعلیمی نتائج میں نمایاں بہتری آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ استاد بھی طلبہ کی پیش رفت کا موثر جائزہ لے کر بروقت تدریسی فیصلے کر سکتا ہے۔

متعدد تحقیقی مطالعات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ٹیکنو پیڈاگوجی طلبہ کی تعلیمی کامیابی، سیکھنے میں دلچسپی، مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت، تنقیدی و تخلیقی سوچ اور بالخصوص ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خصوصاً ریاضی کی تدریس میں ٹیکنالوجی کے موثر استعمال سے طلبہ ریاضیاتی تصورات کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں، اور نئے خیالات پیش کرنے کی صلاحیت حاصل کرتے ہیں۔(Voogt et al., 2013) لہٰذا موجودہ تعلیمی تقاضوں کے پیش نظر ٹیکنو پیڈاگوجی کو معیاری اور موثر تدریس کے لیے ایک ناگزیر تدریسی حکمتِ عملی تصور کیا جاتا ہے۔

ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت

ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت(Mathematical Creativity) سے مراد طلبہ کی وہ ذہنی استعداد ہے جس کے ذریعے وہ ریاضیاتی مسائل کو نئے، منفرد اور موثر طریقوں سے حل کرتے ہیں، مختلف امکانات پر غور کرتے ہیں اور روایتی طریقوں سے ہٹ کر نئے خیالات پیش کرتے ہیں۔ یہ صلاحیت طلبہ کو محض قواعد، فارمولوں اور طریقۂ کار کو یاد کرنے تک محدود نہیں رکھتی بلکہ انھیں منطقی استدلال، تجزیاتی فکر، اختراع اور تخلیقی انداز میں ریاضیاتی تصورات کو سمجھنے اور استعمال کرنے کے قابل بناتی ہے۔(Haylock,1987) جدید تعلیمی نظریات کے مطابق ریاضی کی تعلیم کا مقصد صرف درست جواب تک پہنچنا نہیں بلکہ اس عمل میں طلبہ کی سوچ، استدلال اور تخلیقی صلاحیت کو بھی فروغ دینا ہے۔ جب طلبہ کسی مسئلے کے ایک سے زیادہ حل تلاش کرتے ہیں، مختلف حکمتِ عملی کا موازنہ کرتے ہیں اور اپنے خیالات کو منطقی انداز میں پیش کرتے ہیں تو ان کی ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے(Silver, 1997) ثانوی سطح پر ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں طلبہ پیچیدہ ریاضیاتی تصورات، منطقی استدلال اور تجزیاتی مہارتوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ اگر اس مرحلے پر انھیں ایسا تدریسی ماحول فراہم کیا جائے جو سوال کرنے، تحقیق کرنے، تجربہ کرنے اور نئے خیالات پیش کرنے کی حوصلہ افزائی کرے، تو ان کی تخلیقی صلاحیت اور مسئلہ حل کرنے کی مہارت میں نمایاں بہتری آتی ہے (National Council of Teachers of Mathematics, 2000).

ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت کے بنیادی اجزا درج ذیل ہیں:

- روانی (Fluency) کسی ریاضیاتی مسئلے کے متعدد ممکنہ حل یا خیالات پیش کرنے کی صلاحیت۔
- لچک :(Flexibility) مسئلے کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور مختلف حکمتِ عملی کو اختیار کرنے کی صلاحیت۔
- اصالت :(Originality) نئے، منفرد اور غیر روایتی خیالات یا حل پیش کرنے کی صلاحیت۔
- توسیع :(Elaboration) کسی خیال یا حل کو مزید واضح، منظم اور تفصیلی انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت۔

یہ تمام اجزا باہم مل کر طلبہ کی مجموعی ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ جب تدریسی عمل میں ایسی سرگرمیاں شامل کی جاتی ہیں جو طلبہ کو دریافت، تحقیق، تجربہ، بحث و مباحثہ اور عملی اطلاق کے مواقع فراہم کریں، تو ان اجزا کی موثر نشوونما ممکن ہوتی ہے۔ اس طرح ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت جدید ریاضیاتی تعلیم کا ایک بنیادی مقصد ہے، جو طلبہ میں منطقی فکر، تخلیقی اندازِ فکر، مسئلہ حل کرنے کی مہارت اور خود اعتمادی کو فروغ دیتی ہے۔ یہی صلاحیت انھیں نہ صرف تعلیمی میدان میں بہتر کارکردگی دکھانے کے قابل بناتی ہے بلکہ مستقبل کی عملی زندگی میں بھی نئے مسائل کا موثر اور اختراعی حل تلاش کرنے کے لیے تیار کرتی ہے۔

ٹیکنو پیڈاگوجی ریاضی کی تدریس کو زیادہ موثر، دلچسپ اور نتائج پر مبنی بناتی ہے، جس کے نتیجے میں طلبہ کی ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔ ذیل میں اس کے اہم اثرات بیان کیے جا رہے ہیں۔

ریاضیاتی تصورات کی بہتر تفہیم

ٹیکنالوجی پر مبنی تدریس طلبہ کو ریاضیاتی تصورات کو بصری (Visual) اور تعاملی (Interactive) انداز میں سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ انیمیشنز، سمولیشنز،

جیوجیبرا اور دیگر ڈیجیٹل وسائل کی مدد سے طلبہ پیچیدہ تصورات کو آسانی سے سمجھتے ہیں، جس سے ان کی فہم میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ نئے خیالات پیدا کرنے کے قابل بنتے ہیں۔

مسئلہ حل کرنے کی مہارت میں بہتری

ڈیجیٹل وسائل، تعاملی سرگرمیوں اور ٹیکنالوجی پر مبنی مشقوں کے ذریعے طلبہ مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں، مختلف امکانات کا جائزہ لیتے ہیں اور مناسب حل تلاش کرتے ہیں۔ اس مسلسل مشق سے ان کی مسئلہ حل کرنے کی مہارت مضبوط ہوتی ہے اور وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ ریاضیاتی مسائل کا سامنا کرتے ہیں۔

منطقی اور تجزیاتی سوچ کو فروغ

ٹیکنو پیڈاگوجی طلبہ کو مختلف ریاضیاتی دلائل کا تجزیہ کرنے، شواہد کا موازنہ کرنے اور منطقی نتائج اخذ کرنے کی تربیت دیتی ہے۔ اس عمل سے ان میں منطقی استدلال، تنقیدی فکر اور تجزیاتی صلاحیتوں کی موثر نشوونما ہوتی ہے۔

سیکھنے میں دلچسپی اور تحریک میں اضافہ

ملٹی میڈیا، تعلیمی سافٹ ویئر، جیوجیبرا، ویڈیوز اور دیگر ڈیجیٹل وسائل کے استعمال سے تدریس زیادہ دلچسپ اور تعاملی بن جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں طلبہ کی سیکھنے میں دلچسپی، تحریک (Motivation) اور فعال شرکت میں اضافہ ہوتا ہے، جس کے مثبت اثرات ان کی تخلیقی کارکردگی پر بھی ظاہر ہوتے ہیں (Voogt et al.,2013)

ریاضیاتی تجربات اور دریافت کے مواقع

ٹیکنو پیڈاگوجی طلبہ کو مختلف ریاضیاتی سرگرمیوں، تجربات اور دریافت پر مبنی سیکھنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ طلبہ خود مشاہدہ کرتے ہیں، مختلف امکانات کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنے نتائج اخذ کرتے ہیں، جس سے ان کی تخلیقی صلاحیت مزید نکھرتی ہے۔

باہمی تعاون اور خیالات کے تبادلے کو فروغ

ٹیکنو پیڈاگوجی کے تحت گروہی سرگرمیوں، آن لائن مباحثوں اور مشترکہ ریاضیاتی منصوبوں کے ذریعے طلبہ ایک دوسرے کے ساتھ خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ مختلف آرا اور تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے وہ نئے تصورات اور اختراعی حل پیش کرتے ہیں، جس سے ان کی ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت مزید مستحکم ہوتی ہے۔

اکیسویں صدی کی مہارتوں کی ترقی

ٹیکنو پیڈاگوجی طلبہ میں تخلیقی سوچ، تنقیدی فکر، موثر ابلاغ، تعاون، ڈیجیٹل خواندگی اور مسئلہ حل کرنے جیسی اکیسویں صدی کی بنیادی مہارتوں کو فروغ دیتی ہے۔ یہ مہارتیں جدید تعلیمی نظام اور مستقبل کی پیشہ ورانہ زندگی میں کامیابی کے لیے نہایت اہم سمجھی جاتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ٹیکنو پیڈاگوجی ایک ایسی موثر تدریسی حکمتِ عملی کے طور پر سامنے آئی ہے، جس نے تدریس و تعلم کے عمل کو زیادہ بامقصد، دلچسپ، تعاملی اور موثر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ٹیکنو پیڈاگوجی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ٹیکنالوجی کو محض ایک تدریسی معاون کے طور پر استعمال نہیں کرتی بلکہ اسے تدریسی مقاصد، تعلیمی سرگرمیوں اور تجزیاتی عمل کے ساتھ مربوط کرتی ہے۔ اس طریقۂ تدریس کے ذریعے طلبہ کو مختلف ڈیجیٹل وسائل، انٹرایکٹو سرگرمیوں، بصری مواد اور عملی تجربات کے ذریعے سیکھنے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کی تعلیمی دلچسپی، فعال شرکت اور سیکھنے کی استعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبہ میں منطقی استدلال، تنقیدی فکر، مسئلہ حل کرنے کی مہارت اور تخلیقی اندازِ فکر بھی فروغ پاتا ہے۔ ریاضی کی تعلیم کے تناظر میں ٹیکنو پیڈاگوجی کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے، کیونکہ ریاضی ایسا مضمون ہے جو محض قواعد اور فارمولوں کو یاد کرنے تک محدود نہیں بلکہ منطقی سوچ، تجزیاتی صلاحیت اور تخلیقی فکر کا تقاضا کرتا ہے۔ جب طلبہ کو ٹیکنالوجی پر مبنی تدریسی ماحول میں مختلف ریاضیاتی تصورات کو دریافت کرنے، متعدد طریقوں سے مسائل حل کرنے، بصری ماڈلز کا استعمال کرنے اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے مواقع ملتے ہیں تو ان کی ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت میں نمایاں بہتری آتی ہے۔ وہ نہ صرف پیچیدہ تصورات کو بہتر انداز میں سمجھتے ہیں بلکہ نئے اور منفرد حل پیش کرنے کی صلاحیت بھی حاصل کرتے ہیں۔ مختلف قومی اور بین الاقوامی تحقیقی مطالعات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ٹیکنالوجی کے بامقصد استعمال سے طلبہ کی تعلیمی کامیابی، تخلیقی سوچ، مسئلہ حل کرنے کی مہارت، منطقی استدلال، خود اعتمادی اور ریاضی کے تئیں مثبت رجحان میں اضافہ ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ طلبہ میں خود مختار سیکھنے، باہمی تعاون، تحقیق پر مبنی سوچ اور جدید ڈیجیٹل مہارتوں کی بھی نشوونما ہوتی ہے، جو اکیسویں صدی کی تعلیم کے بنیادی تقاضے ہیں۔ اس کے باوجود ٹیکنو پیڈاگوجی کے موثر اطلاق کے لیے بعض چیلنجز بھی موجود ہیں، جن میں اساتذہ کی تکنیکی مہارت کی کمی، مناسب تربیت کا فقدان، ڈیجیٹل وسائل کی محدود دستیابی، انٹرنیٹ کی ناکافی سہولت اور بعض تعلیمی اداروں میں بنیادی انفراسٹرکچر کی کمی شامل ہیں۔ ان مسائل کے حل کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت کو مضبوط بنایا جائے، تعلیمی اداروں میں جدید ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل وسائل فراہم کیے جائیں، اور تدریسی منصوبہ بندی میں ٹیکنو پیڈاگوجی کو موثر طریقے سے شامل کیا جائے۔

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ٹیکنو پیڈاگوجی کو منصوبہ بند انداز میں نصاب، تدریسی عمل، تجزیاتی نظام اور اساتذہ کی تربیت کا حصہ بنایا جائے تو ثانوی سطح کے طلبہ کی ریاضیاتی تخلیقی صلاحیت میں نمایاں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں طلبہ نہ صرف ریاضی میں بہتر تعلیمی کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے بلکہ وہ تخلیقی، تجزیاتی اور منطقی انداز میں سوچنے والے ایسے ذمہ دار افراد کے طور پر بھی ابھریں گے جو مستقبل کے تعلیمی، سماجی اور پیشہ ورانہ چیلنجز کا اعتماد اور مہارت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے۔ یہی جدید تعلیم کا بنیادی مقصد ہے اور ٹیکنو پیڈاگوجی اس مقصد کے حصول کا ایک موثر، بامعنی اور قابلِ اعتماد ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

کتابیات

1. Bruner, J. S. (1961). The process of education. Harvard University Press.
2. Jonassen, D. H. (2011). Learning to solve problems: A handbook for designing problem-solving learning environments. Routledge.
3. Koehler, M. J., & Mishra, P. (2009). What is technological pedagogical content knowledge (TPACK)? Contemporary Issues in Technology and Teacher Education, 9(1), 60–70.
4. Ministry of Education. (2020). National education policy 2020. Government of India.
5. National Council of Teachers of Mathematics. (2000). Principles and standards for school mathematics. Author.

Syed Razaur Rahman
Research scholar, (Education)
MANUU College of Teacher Education
Darbhanga Bihar- 846002
Email: - rahmanr869@gmail.com

استفساری تدریس اور مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت



محمد جمشید عالم



اکیسویں صدی میں تعلیمی نظام سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایسے افراد تیار کرے جو بدلتے ہوئے حالات میں موثر فیصلے کر سکیں، نئے مسائل کا تجزیہ کر سکیں اور مناسب حل تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اسی تناظر میں تدریس کے روایتی طریقوں کے ساتھ ساتھ جدید اور طلبہ مرکز تدریسی حکمتِ عملیوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام (Inquiry-Based Intervention Program) انہی جدید تدریسی طریقوں میں سے ایک موثر طریقہ ہے، جس میں طلبہ کو سوال کرنے، مشاہدہ کرنے، معلومات جمع کرنے، شواہد کا تجزیہ کرنے، مفروضے قائم کرنے اور نتائج اخذ کرنے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس طریقۂ تدریس میں استاد محض معلومات فراہم کرنے والا نہیں بلکہ ایک رہنما اور سہولت کار (Facilitator) کا کردار ادا کرتا ہے، جب کہ طلبہ اپنی سرگرم شرکت کے ذریعے علم کی تعمیر کرتے ہیں۔ اس طرح سیکھنے کا عمل زیادہ بامعنی، دلچسپ اور دیرپا بن جاتا ہے۔ مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت (Problem Solving Ability) طلبہ کی ان بنیادی علمی مہارتوں میں شامل ہے جو نہ صرف تعلیمی کامیابی بلکہ عملی زندگی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ صلاحیت طلبہ کو مختلف حالات کا تجزیہ کرنے، متبادل حل تلاش کرنے، منطقی استدلال سے کام لینے اور مناسب فیصلہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔ موجودہ تعلیمی پالیسیوں اور نصابی اصلاحات میں بھی اس مہارت کی نشوونما پر خصوصی زور دیا جا رہا ہے تاکہ طلبہ کو حقیقی زندگی کے مسائل سے نمٹنے کے لیے تیار کیا جا سکے۔ متعدد قومی اور بین الاقوامی تحقیقات سے یہ واضح ہوا ہے کہ استفساری تدریس طلبہ کی علمی کامیابی، سائنسی رویے، تنقیدی فکر، تخلیقی صلاحیت اور مسئلہ حل کرنے کی مہارت کو فروغ دینے میں موثر کردار ادا کرتی ہے۔ اس طریقۂ تدریس کے ذریعے طلبہ معلومات کو محض یاد کرنے کے بجائے ان کا تجزیہ کرتے ہیں، تجربات سے سیکھتے ہیں اور مختلف حالات میں اپنے علم کو بروئے کار لانے کے قابل بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کئی ترقی یافتہ ممالک میں Inquiry-Based Learning کو تدریسی نظام کا ایک اہم حصہ بنایا گیا ہے۔ ہندوستان میں بھی قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے تجرباتی، سرگرمی پر مبنی، دریافت پر مبنی اور طلبہ مرکز تعلیم کو فروغ دینے پر زور دیا ہے۔ اس پالیسی کا مقصد طلبہ میں اعلیٰ درجے کی فکری صلاحیتوں، تخلیقی سوچ، تنقیدی تجزیہ اور مسئلہ حل کرنے کی مہارت کو فروغ دینا ہے تاکہ وہ اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکیں۔

استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام

استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام (Inquiry-Based Intervention Program) ایک ایسا تدریسی طریقۂ کار ہے جس میں طلبہ کو سیکھنے کے عمل کا فعال حصہ بنایا جاتا ہے۔ اس طریقۂ تدریس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ علم صرف استاد سے طالب علم تک منتقل نہیں ہوتا بلکہ طلبہ سوالات، مشاہدات، تجربات، تحقیق اور بحث و مباحثہ کے ذریعے خود علم کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس عمل میں طلبہ کسی مسئلے یا سوال کو بنیاد بنا کر معلومات حاصل کرتے ہیں، شواہد کا تجزیہ کرتے ہیں، مختلف امکانات پر غور کرتے ہیں اور منطقی انداز میں نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اس طرح سیکھنے کا عمل زیادہ بامعنی، موثر اور دیرپا ہو جاتا ہے (Bruner, 1961; Dewey, 1938) استفساری تدریس کی نظریاتی بنیاد تعمیریت (Constructivism) پر قائم ہے، جس کے مطابق طلبہ اپنے سابقہ تجربات اور نئی معلومات کے باہمی تعامل سے علم کی تعمیر کرتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق موثر تدریس وہ ہے جو طلبہ کو سوال کرنے، تحقیق کرنے، دریافت کرنے اور اپنے خیالات کا تنقیدی جائزہ لینے کے مواقع فراہم کرے۔ اس نقطۂ نظر میں استاد کا کردار معلومات فراہم کرنے والے کے بجائے ایک رہنما، سہولت کار اور معاون کا ہوتا ہے، جب کہ طلبہ سیکھنے کے پورے عمل

میں فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ (Piaget, 1972; Vygotsky, 1978) استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام میں تدریس کا آغاز عموماً کسی حقیقی مسئلے، سوال یا عملی صورتِ حال سے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد طلبہ مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرتے ہیں، تجربات انجام دیتے ہیں، گروہی مباحثے میں حصہ لیتے ہیں، اپنے نتائج پیش کرتے ہیں اور شواہد کی بنیاد پر مناسب حل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس پورے عمل کے دوران تجسس، تنقیدی سوچ، مشاہدہ، تجزیہ، استدلال اور فیصلہ سازی جیسی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کو فروغ ملتا ہے، جو موثر تعلیم کی بنیادی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں۔ (National Research Council, 2000)

ذیل میں استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام کی اہم خصوصیات بیان کی جارہی ہیں۔

طلبہ مرکز تدریس اور فعال شرکت

استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تدریسی عمل کا مرکز استاد کے بجائے طالب علم ہوتا ہے۔ طلبہ محض سننے والے نہیں رہتے بلکہ سیکھنے کے پورے عمل میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ وہ سوالات کرتے ہیں، مختلف سرگرمیوں میں شریک ہوتے ہیں، اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور سیکھنے کے تجربے کو خود تشکیل دیتے ہیں۔ اس فعال شرکت کے نتیجے میں طلبہ کی دلچسپی، خود اعتمادی اور تعلیمی کارکردگی میں نمایاں بہتری آتی ہے۔

سوال کرنے، تحقیق کرنے اور دریافت کرنے کی حوصلہ افزائی

اس پروگرام میں طلبہ کو ہر موضوع پر سوالات اٹھانے اور ان کے جوابات تلاش کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ وہ مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرتے ہیں، تحقیق کرتے ہیں اور نئے حقائق دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عمل سے ان میں تجسس، جستجو اور خود سیکھنے کی عادت پیدا ہوتی ہے، جو زندگی بھر سیکھنے (Lifelong Learning) کی بنیاد بنتی ہے۔

حقیقی زندگی کے مسائل سے تدریسی سرگرمیوں کا ربط

استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام میں تدریسی سرگرمیوں کو حقیقی زندگی کے مسائل اور حالات سے جوڑا جاتا ہے۔ طلبہ ایسے مسائل پر غور کرتے ہیں جو ان کی روزمرہ زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کے ممکنہ حل تلاش کرتے ہیں۔ اس طریقے سے سیکھا گیا علم زیادہ بامعنی، پائیدار اور عملی زندگی میں قابلِ استعمال ثابت ہوتا ہے۔

تجربات، مشاہدات اور شواہد پر مبنی سیکھنے کا عمل

اس پروگرام میں طلبہ کو صرف نظری معلومات فراہم نہیں کی جاتیں بلکہ انھیں تجربات کرنے، مشاہدات کرنے اور مختلف شواہد کی بنیاد پر نتائج اخذ کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس عملی اندازِ تدریس سے طلبہ سائنسی طرزِ فکر اپناتے ہیں، منطقی استدلال کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں اور معلومات کو تنقیدی انداز میں پرکھنے کے قابل بنتے ہیں۔

> موجودہ تعلیمی پالیسیوں اور نصابی اصلاحات میں بھی اس مہارت کی نشوونما پر خصوصی زور دیا جارہا ہے تاکہ طلبہ کو حقیقی زندگی کے مسائل سے نمٹنے کے لیے تیار کیا جاسکے۔ متعدد قومی اور بین الاقوامی تحقیقات سے یہ واضح ہوا ہے کہ استفساری تدریس طلبہ کی علمی کامیابی، سائنسی رویے، تنقیدی فکر، تخلیقی صلاحیت اور مسئلہ حل کرنے کی مہارت کو فروغ دینے میں موثر کردار ادا کرتی ہے۔

تنقیدی اور تخلیقی سوچ کی نشوونما

استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام طلبہ میں تنقیدی اور تخلیقی سوچ کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ طلبہ مختلف نظریات کا تجزیہ کرتے ہیں، شواہد کا موازنہ کرتے ہیں، مسائل کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور نئے خیالات یا متبادل حل پیش کرتے ہیں۔ اس عمل سے ان کی فیصلہ سازی، اختراعی صلاحیت اور فکری وسعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

باہمی تعاون، تبادلۂ خیال اور اجتماعی مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت کا فروغ

اس پروگرام میں طلبہ کو گروہی سرگرمیوں، مباحثوں اور مشترکہ منصوبوں کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں، دوسروں کی آرا کا احترام کرتے ہیں اور اجتماعی طور پر مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اس سے ان میں سماجی مہارتیں، موثر ابلاغ، قائدانہ صلاحیت اور ٹیم ورک کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔

استاد کا کردار ایک رہنما اور سہولت کار کے طور پر

استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام میں استاد کا کردار معلومات فراہم کرنے والے واحد ذریعہ کے بجائے ایک رہنما، معاون اور سہولت کار کا ہوتا ہے۔ استاد طلبہ کو مناسب سوالات، وسائل اور رہنمائی فراہم کرتا ہے تاکہ وہ خود تحقیق کریں، نتائج اخذ کریں اور اپنے علم کو وسعت دیں۔ اس کردار کی بدولت طلبہ میں خود مختار سیکھنے، اعتماد کے ساتھ فیصلے کرنے اور مستقل علمی جستجو کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا جملوں کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام جدید تدریسی رجحانات کا ایک موثر نمونہ ہے جو طلبہ کو فعال، خود مختار اور تنقیدی انداز میں سیکھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اس کی مختلف خصوصیات نہ صرف تعلیمی کامیابی میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ طلبہ کی فکری، سماجی اور عملی صلاحیتوں کو بھی مضبوط بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام میں اس پروگرام کو موثر تدریسی حکمتِ عملی کے طور پر تسلیم کیا جارہا ہے، خصوصاً سائنس اور ریاضی جیسے مضامین میں مسئلہ حل کرنے، تحقیق اور تخلیقی سوچ کے فروغ کے لیے اس کی اہمیت مزید نمایاں ہوجاتی ہے۔

مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت

مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت (Problem Solving Ability) سے مراد فرد کی وہ ذہنی اور عملی استعداد ہے جس کے ذریعے وہ کسی مسئلے کی نوعیت کو سمجھتا ہے، اس کا تجزیہ کرتا ہے، ممکنہ متبادل حل تلاش کرتا ہے، مناسب حکمتِ عملی اختیار کرتا ہے اور شواہد و منطق کی بنیاد پر بہترین فیصلہ تک پہنچتا ہے۔ یہ صلاحیت محض تعلیمی میدان تک محدود نہیں بلکہ روزمرہ زندگی، سماجی معاملات، پیشہ ورانہ ذمہ داریوں اور سائنسی تحقیق میں

بھی یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ تعلیمی ماہرین کے مطابق مسئلہ حل کرنے کی مہارت طلبہ میں خود اعتمادی، آزادانہ سوچ، تخلیقی صلاحیت اور موثر فیصلہ سازی کو فروغ دیتی ہے (Polya,1957)۔ ثانوی سطح کی تعلیم میں مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت کو بنیادی تعلیمی مقاصد میں شمار کیا جاتا ہے، کیونکہ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں طلبہ مجرد تصورات کو سمجھنے، منطقی استدلال کرنے اور حقیقی زندگی کے مسائل کو علمی بنیادوں پر حل کرنے کی صلاحیت حاصل کرتے ہیں۔ اگر تدریسی عمل صرف معلومات یاد کرانے تک محدود رہے تو طلبہ کی فکری نشوونما متاثر ہوتی ہے، جب کہ مسئلہ پر مبنی اور استفساری تدریس انھیں سوچنے، سوال کرنے اور نئے حل تلاش کرنے کی ترغیب دیتی ہے (Jonassen, 2011) جارج پولیا (George Polya) نے مسئلہ حل کرنے کے عمل کو چار بنیادی مراحل میں تقسیم کیا ہے:

(1) مسئلے کو سمجھنا

(2) مناسب منصوبہ تیار کرنا

(3) منصوبے پر عمل کرنا

(4) حاصل شدہ حل کا جائزہ لینا

یہ مراحل آج بھی تدریسِ ریاضی، سائنس اور دیگر مضامین میں مسئلہ حل کرنے کی تعلیم کے لیے بنیادی رہنما اصول سمجھے جاتے ہیں۔ ان مراحل کی مدد سے طلبہ منظم انداز میں سوچنا سیکھتے ہیں اور پیچیدہ مسائل کو مرحلہ وار حل کرنے کی مہارت حاصل کرتے ہیں۔ مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت کی نشوونما متعدد ذہنی صلاحیتوں پر مشتمل ہوتی ہے، جن میں مسئلے کی شناخت، معلومات کا تجزیہ، منطقی استدلال، تنقیدی فکر، تخلیقی سوچ، فیصلہ سازی، شواہد کی جانچ اور نتائج کی تشخیص شامل ہیں۔ جب طلبہ کو ایسے تدریسی ماحول میں سیکھنے کا موقع ملتا ہے جہاں انھیں سوالات کرنے، مختلف امکانات پر غور کرنے اور عملی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی آزادی ہو، تو ان کی مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت نمایاں طور پر بہتر ہوتی ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 بھی اس بات پر زور دیتی ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف معلومات کی فراہمی نہیں بلکہ طلبہ میں اعلیٰ سطح کی علمی مہارتیں، تنقیدی فکر، تخلیقی صلاحیت، موثر ابلاغ اور مسئلہ حل کرنے کی قابلیت پیدا کرنا ہے۔ اسی لیے نصاب، تدریسی حکمتِ عملیوں اور تشخیصی نظام میں ایسی سرگرمیوں کو شامل کرنے کی سفارش کی گئی ہے جو

تعلیمی ماہرین کے مطابق مسئلہ حل کرنے کی مہارت طلبہ میں خود اعتمادی، آزادانہ سوچ، تخلیقی صلاحیت اور موثر فیصلہ سازی کو فروغ دیتی ہے (Polya,1957)۔ ثانوی سطح کی تعلیم میں مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت کو بنیادی تعلیمی مقاصد میں شمار کیا جاتا ہے، کیونکہ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں طلبہ مجرد تصورات کو سمجھنے، منطقی استدلال کرنے اور حقیقی زندگی کے مسائل کو علمی بنیادوں پر حل کرنے کی صلاحیت حاصل کرتے ہیں۔

طلبہ کو حقیقی زندگی کے مسائل کے حل کے لیے تیار کریں اس تناظر میں مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت کو اکیسویں صدی کی بنیادی مہارتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایسے طلبہ جو موثر انداز میں مسائل کا تجزیہ اور حل کر سکتے ہیں، وہ نہ صرف تعلیمی میدان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ مستقبل میں پیشہ ورانہ اور سماجی زندگی میں بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تدریسی طریقوں، خصوصاً استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام، کو مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت کے فروغ کے لیے نہایت موثر ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔

استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام کا مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت پر اثرات

استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام طلبہ میں مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت (Problem Solving Skills) کو موثر انداز میں فروغ دینے والی جدید تدریسی حکمتِ عملیوں میں سے ایک ہے۔ اس پروگرام کے تحت طلبہ کو محض تیار شدہ معلومات فراہم کرنے کے بجائے انھیں مسائل کی نشاندہی کرنے، سوالات قائم کرنے، مفروضے بنانے، معلومات جمع کرنے، شواہد کا تجزیہ کرنے اور مناسب نتائج اخذ کرنے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس عمل کے دوران طلبہ مختلف علمی، فکری اور عملی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کے منطقی استدلال، تنقیدی تجزیہ، فیصلہ سازی اور تخلیقی سوچ کی صلاحیتیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اس طرح استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام نہ صرف تعلیمی کامیابی میں معاون ثابت ہوتا ہے بلکہ طلبہ کو حقیقی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے اور ان کا موثر حل تلاش کرنے کے قابل بھی بناتا ہے۔ ذیل میں اس پروگرام کے مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت پر اہم اثرات بیان کیے جا رہے ہیں۔

مسئلے کی درست شناخت کی صلاحیت میں اضافہ

استفساری تدریس طلبہ کو مسئلے کی نوعیت کو سمجھنے، اس کی بنیادی وجوہات کی نشاندہی کرنے اور مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی تربیت دیتی ہے، جس سے وہ مسئلہ حل کرنے کے ابتدائی مرحلے میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ (Polya, 1957)

تنقیدی اور تجزیاتی سوچ کی نشوونما

اس طریقۂ تدریس میں طلبہ معلومات کو محض قبول نہیں کرتے بلکہ ان کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں، شواہد کا تجزیہ کرتے ہیں اور منطقی بنیادوں پر نتائج اخذ کرتے ہیں، جس سے ان کی مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت مضبوط ہوتی ہے۔ (Hmelo-Silver et al.,2007)

تخلیقی سوچ کو فروغ

استفساری سرگرمیاں طلبہ کو کسی ایک حل تک محدود نہیں رکھتیں بلکہ متعدد ممکنہ حل تلاش کرنے کی ترغیب دیتی ہیں، جس سے ان کی تخلیقی سوچ اور اختراعی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے (Bruner, 1961)

منطقی استدلال اور فیصلہ سازی میں بہتری

استفساری تدریس طلبہ کو شواہد کی بنیاد پر دلائل قائم کرنے، مختلف متبادل حل کا موازنہ کرنے اور مناسب فیصلہ کرنے کی صلاحیت فراہم کرتی ہے، جو موثر مسئلہ حل کرنے کے لیے ضروری ہے (National Research Council, 2000).

حقیقی زندگی کے مسائل سے ربط

اس پروگرام میں تدریسی سرگرمیوں کو روزمرہ زندگی کے مسائل سے جوڑا جاتا ہے، جس سے طلبہ اپنے حاصل کردہ علم کو عملی حالات میں استعمال کرنا سیکھتے ہیں اور ان کی عملی مسئلہ حل کرنے کی مہارت میں اضافہ ہوتا ہے۔(Minner, Levy, & Century, 2010)

فعال شرکت اور خود اعتمادی میں اضافہ

استفساری تدریس طلبہ کو سوال کرنے، اظہارِ خیال کرنے، تحقیق کرنے اور نتائج پیش کرنے کے مواقع فراہم کرتی ہے، جس سے ان کی فعال شرکت، خود اعتمادی اور سیکھنے میں دلچسپی بڑھتی ہے(Bell et al., 2005)

باہمی تعاون کے ذریعے مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت

گروہی سرگرمیوں اور مباحثوں کے ذریعے طلبہ ایک دوسرے کے خیالات سے استفادہ کرتے ہیں، مختلف نقطۂ نظر کو سمجھتے ہیں اور اجتماعی طور پر مسائل کا موثر حل تلاش کرتے ہیں۔(Vygotsky, 1978)

موجودہ دور میں تعلیم کا بنیادی مقصد طلبہ کو محض معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ ان میں ایسی فکری، علمی اور عملی صلاحیتیں پیدا کرنا ہے جو انہیں زندگی کے مختلف مسائل کا موثر انداز میں سامنا کرنے کے قابل بنا سکیں۔ استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام اسی مقصد کے حصول کی ایک موثر تدریسی حکمت عملی ہے، جو طلبہ کو سوال کرنے، تحقیق کرنے، مشاہدہ کرنے، تجزیہ کرنے اور منطقی بنیادوں پر نتائج اخذ کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس تدریسی طریقۂ کار کے ذریعے طلبہ نہ صرف اپنے علمی تصورات کو بہتر انداز میں سمجھتے ہیں بلکہ انہیں حقیقی زندگی کے حل میں بھی موثر طور پر استعمال کرنا سیکھتے ہیں۔

تحقیق پر مبنی سیکھنے کا رجحان

استفساری تدریس طلبہ میں تحقیق، مشاہدہ، تجربہ اور شواہد پر مبنی نتائج اخذ کرنے کی عادت پیدا کرتی ہے، جس سے ان کی سائنسی سوچ اور مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت مزید مضبوط ہوتی ہے(Dewey, 1938)

تعلیمی کامیابی میں بہتری

تحقیقی مطالعات سے معلوم ہوا ہے کہ استفساری تدریسی پروگرام کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ، روایتی تدریسی طریقوں کے مقابلے میں تعلیمی کامیابی اور مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں:(Bell et al., 2005; Minner et al., 2010).

اکیسویں صدی کی مہارتوں کی ترقی

استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام طلبہ میں تنقیدی فکر، تخلیقی صلاحیت، موثر ابلاغ، تعاون، تحقیق اور مسئلہ حل کرنے جیسی اکیسویں صدی کی بنیادی مہارتوں کو فروغ دیتا ہے، جو جدید تعلیم کے اہم مقاصد میں شامل ہیں۔(Ministry of Education, 2020)

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام طلبہ کی مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت کو فروغ دینے کا ایک موثر اور جدید تدریسی طریقۂ کار ہے۔ یہ پروگرام طلبہ میں تجسس، تنقیدی و تخلیقی سوچ، منطقی استدلال، فیصلہ سازی، باہمی تعاون اور تحقیق پر مبنی سیکھنے کے رجحان کو مضبوط بناتا ہے۔ اس کے نتیجے میں طلبہ نہ صرف تعلیمی مسائل کو بہتر انداز میں حل کرنے کے قابل ہوتے ہیں بلکہ حقیقی زندگی کے مختلف چیلنجز کا بھی اعتماد اور دانش مندی کے ساتھ سامنا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا موجودہ تعلیمی نظام، خصوصاً ثانوی سطح پر، استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام کو تدریسی عمل کا موثر حصہ بنانا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ طلبہ میں اکیسویں صدی کی مطلوبہ مہارتوں کی موثر نشوونما یقینی بنائی جا سکے۔

اختتامیہ

موجودہ دور میں تعلیم کا بنیادی مقصد طلبہ کو محض معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ ان میں ایسی فکری، علمی اور عملی صلاحیتیں پیدا کرنا ہے جو انھیں زندگی کے مختلف مسائل کا موثر انداز میں سامنا کرنے کے قابل بنا سکیں۔ استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام اسی مقصد کے حصول کی ایک موثر تدریسی حکمتِ عملی ہے، جو طلبہ کو سوال کرنے، تحقیق کرنے، مشاہدہ کرنے، تجزیہ کرنے اور منطقی بنیادوں پر نتائج اخذ کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس تدریسی طریقۂ کار کے ذریعے طلبہ نہ صرف اپنے علمی تصورات کو بہتر انداز میں سمجھتے ہیں بلکہ حقیقی زندگی کے مسائل کے حل میں بھی موثر طور پر استعمال کرنا سیکھتے ہیں۔ اس مقالے میں پیش کی گئی بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام ثانوی سطح کے طلبہ کی مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت، تنقیدی فکر، تخلیقی سوچ، منطقی استدلال، فیصلہ سازی اور باہمی تعاون جیسی اہم مہارتوں کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ مختلف قومی اور بین الاقوامی تحقیقی مطالعات بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ استفساری تدریس طلبہ کی تعلیمی کامیابی اور اعلیٰ سطحی علمی صلاحیتوں میں مثبت اور بامعنی بہتری پیدا کرتی ہے۔

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ثانوی سطح کے تعلیمی اداروں میں استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام کو تدریسی منصوبہ بندی، نصاب، اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت اور تشخیصی نظام کا موثر حصہ بنایا جائے۔ اس سے نہ صرف طلبہ کی مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا بلکہ وہ اکیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق تخلیقی، تنقیدی اور خود مختار سیکھنے والے افراد کے طور پر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں گے۔ اس طرح استفساری تدریسی مداخلتی پروگرام ایک معیاری، بامقصد اور طلبہ مرکز تعلیمی نظام کے قیام میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

حوالہ جات

1. Bell, R. L., Smetana, L., & Binns, I. C. (2005). Simplifying inquiry instruction. The Science Teacher, 72(7), 30–33.
2. Bruner, J. S. (1961). The act of discovery. Harvard Educational Review, 31(1), 21–32.
3. Dewey, J. (1938). Experience and education. New York, NY: Macmillan.
4. Hmelo-Silver, C. E., Duncan, R. G., & Chinn, C. A. (2007). Scaffolding and achievement in problem-based and inquiry learning: A response to Kirschner, Sweller, and Clark (2006). Educational Psychologist, 42(2), 99–107. https://doi.org/10.1080/00461520701263368
5. Jonassen, D. H. (2011). Learning to solve problems: A handbook for designing problem-solving learning environments. Routledge.

Md Jamshed Alam
M.M. Memorial Urdu+2 School
Turkahan Gopalganj (Bihar), Pin-841428
Mob.: 8292432487
Email: jamshedalam2487@gmail.com

خواجہ حیدر علی آتش یا آتِش



احمد محفوظ

خواجہ حیدر علی آتش کے تعلق سے ایک اہم مسئلہ جو عرصۂ دراز سے بنائے اختلاف رہا ہے، وہ ان کے تخلص یعنی لفظ ''آتش'' کی ملفوظی صورت سے متعلق ہے۔ چونکہ یہ لفظ سوم مفتوح اور سوم مکسور دونوں صورتوں کے ساتھ بولا جاتا ہے، یعنی اس کا تلفظ آتَش اور آتِش دونوں طرح زبانوں پر ہے، اور دونوں صورتیں صحیح سمجھی جاتی ہیں، اس لیے یہ فیصلہ کرنا ایک مدت سے مشکل کا سبب بنا ہوا ہے کہ خواجہ صاحب کے تخلص کی کون سی صورت درست قرار دی جائے۔ یعنی خواجہ حیدر علی آتَش کہنا درست ہے یا خواجہ حیدر علی آتِش کہنا صحیح ہے۔

واضح رہے کہ یہاں اصل بحث طلب مسئلہ خواجہ صاحب مذکور کے تخلص کی درست ملفوظی صورت کی تحقیق ہے۔ لیکن چونکہ لفظ ''آتش'' کے تلفظ کا اختلاف آج بھی بہت عام نہ سہی، لیکن زبانوں پر موجود ہے، لہٰذا اس اختلاف کی صورت حال پر کچھ روشنی ڈال دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ جو لوگ لفظ ''آتش'' کے تلفظ کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ نہیں ہیں، ان میں سے کچھ لوگ سوم مفتوح یعنی 'آتَش' کو ہی درست سمجھنے کے قائل ہیں، اور جن کی زبانوں پر سوم مکسور یعنی 'آتِش' ہے، وہ اسی تلفظ کے صحیح ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے اپنے استعمال کے مطابق لوگ خواجہ صاحب کے تخلص کی ایک صورت کو صحیح اور دوسری صورت کو غلط قرار دینے پر چاہے اصرار نہ کریں، لیکن اس پر مائل ضرور نظر آتے ہیں۔ ملحوظ رہے کہ لفظ ''آتش'' کے تلفظ کی اختلافی صورت حال پر شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی کتاب ''لغات روزمرہ'' میں کارآمد بحث کی ہے، اور اردو فارسی کی کئی مستند لغات کا حوالہ دے کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ لفظ بفتح سوم یعنی ''آتَش'' کی صورت میں درست اور مرجح ہے۔ اس لفظ کی بحث کا آغاز کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''اردو میں لفظ ''آتش'' کا تلفظ بروزن ''ترکش''، بفتح سوم ہی رائج اور درست ہے۔ بعض لوگ اس لفظ میں سوم مکسور (بروزن ''بارش'') بولتے ہیں۔ رائج تلفظ بفتح سوم (بروزن ''ترکش'') ہے اور اب یہی مرجح ہے۔''[1]

جیسا کہ درج بالا اقتباس سے ظاہر ہے، فاروقی صاحب اس لفظ کے دونوں تلفظ کے استعمال کے قائل ہیں، لیکن بفتح سوم یعنی ''آتَش'' کی صورت کو اس لیے درست اور قابل ترجیح قرار دیتے ہیں کہ ان کے خیال میں اب یہی تلفظ زیادہ رائج ہے۔ اس بحث کو سمیٹتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''مختصر یہ کہ دہلی میں اب بھی ''آتش'' بروزن ''بارش'' رائج ہے، چاہے بہت عام نہ ہو۔ دہلی کے باہر بول چال میں ''آتش'' بروزن ''ترکش'' ہی عام ہے۔ ''آتش'' سے بننے والے الفاظ میں بھی ''آتش'' اب زیادہ تر بفتح سوم ہی بولا جاتا ہے۔''[2]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''فرہنگ آصفیہ'' کے مولف مولوی سید احمد دہلوی نے اپنی فرہنگ میں نہ صرف ''آتش'' کو بطور لغت درج کیا ہے، بلکہ اس لفظ کی اصل اور تلفظ کے بارے میں بھی تفصیل سے کلام کیا ہے۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ''آتش'' سے متعلق صاحب آصفیہ کا اندراج یہاں نقل کر دیا جائے تاکہ تلفظ کے اختلاف کی مکمل صورت حال ہمارے پیش نظر رہے۔

آتش۔ اسم مؤنث۔ قدیم فارسی (آدیش، آدر، آتمیش) ژ (آتَرس) ت (ادت) س (اگنی) ہندی (آگ)

تبدیل حروف اور علم زبان سے ان سب صورتوں کی اصل ایک ثابت ہوتی ہے۔ البتہ لفظ آتش کے تلفظ میں اختلاف ہے۔ اکثر فرہنگ نویسوں نے تو بکسر تا اور بفتح تا دونوں طرح روا رکھا ہے، مگر بعض نے صرف اخیر صورت کو مانا ہے، بلکہ پہلی صورت کی نسبت، گو زیادہ ہی کیوں نہ بولتے ہوں، ہمیں بھی تامل ہے، کیونکہ جہاں تک شعرائے فارس کے اشعار ہماری نظر سے گذرے، ہم نے برابر سرکش اور مشوَش وغیرہ کے ساتھ آتش کا قافیہ پایا۔

آہ تن سوز دروں سے شکل آتش ہے مرا
دل کسی آتش کے پرکالے پہ جوغش ہے مرا
(جرأت)

حریص و جہاں سوز و سرکش مباش
ز خاک آفریدندت آتش مباش
(سعدی)

دیوانہ ام ز خانہ مشوَش برآمدہ
طوفانم از تنورِ پر آتش برآمدہ
(نظیری)

البتہ صاحب فرہنگ جہانگیری نے مولوی معنوی کا یہ شعر جس میں بکسر تائے فوقانی باندھا ہے، سنداً بیان کیا ہے:

گفت آتش من ہمانم آتشم
اندر آ تا تو بہ بینی تاشم

مگر ہم اس موقع پر قدیم فارسی کے موافق ضرورت شعر کے باعث بکسر تا قافیہ باندھ دینا جائز خیال کر سکتے ہیں، نہ کہ اس کو ٹکسالی مانیں۔ کیونکہ زبان ژند سے بھی، جس پر فارسی زبان کا مدار ہے اور نہایت پرانی زبان ہے، جس کے الفاظ نے مرور زمانہ کے باعث اس قسم کی تبدیلیاں اختیار کی ہیں، ثابت ہوتا ہے کہ لفظ آتَرس بفتح تائے فوقانی یہ لفظ حسب قاعدہ رائے مہملہ گر کے آتَس ہوا، پھر بشین معجمہ آتَش ہو گیا۔ بلکہ یہی وجہ ہے کہ شعرائے فارس نے اپنے کلام میں بفتح تا ہی اس کا استعمال زیادہ کیا ہے۔ اس جگہ ہمیں صاحب فرہنگ جہانگیری سے کلی اتفاق نہیں ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی ہم انھیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ قدیم فارسی اس امر کا بخوبی ثبوت دے رہی ہے کہ آتِش بکسر تائے فوقانی کی اصل آدیش یا آتمیش ہے۔[3]

صاحب آصفیہ کے اس طویل اقتباس کو یہاں نقل کرنے کا مقصد یہی تھا کہ لفظ ''آتش'' جو فارسی الاصل ہے، اس کی ابتدائی شکلوں کو بھی دیکھ لیا جائے، اور اس لفظ کے تلفظ میں زبر اور زیر کا جو اختلاف ہے، اس کی حقیقت بھی ظاہر ہو جائے۔ واضح رہے کہ نور اللغات میں ''آتش'' کے دونوں تلفظ کو صحیح کہا گیا ہے، لیکن کلام میں استعمال کے معاملے میں اس لغت کے مولف بھی صاحب آصفیہ کے ہم خیال ہیں۔ اس ضمن میں نور اللغات کی عبارت حسب ذیل ہے:

''آتش۔ (ف) ژند کا لفظ آتَرس تھا، قدیم فارسی میں اتمیش اور اس سے آتش ہو گیا۔ بکسر تا و بفتح تا دونوں طرح صحیح ہے، لیکن اساتذہ کے کلام میں عموماً بفتح دوم پایا جاتا ہے۔''[4]

''فارسی کی ایک اہم لغت ''غیاث اللغات'' میں بھی آتش کو دونوں تلفظ کے ساتھ درست بتایا گیا ہے۔ اس لغت کا اندراج ذیل میں ملاحظہ کیجیے:

''آتش۔ تے کا زبر اور تے کا زیر دونوں طرح سے درست ہے بمعنی آگ، جہانگیری اور سراج اللغات سے اور برہان میں بکسر تا ہے۔''[5]

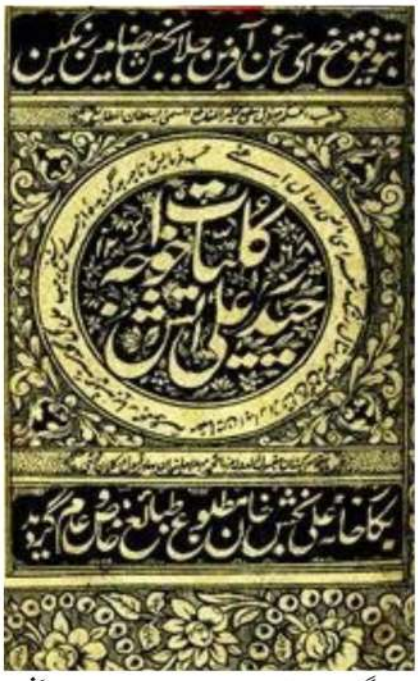
مندرجہ بالا حوالوں کی روشنی میں، اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ''آتَش'' اور ''آتِش'' دونوں تلفظ کے درست ہونے کا اندراج لغات میں موجود ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی زور دے کر بیان کی گئی ہے کہ اساتذہ کے کلام میں ''آتش'' کو بفتح سوم ہی استعمال کیا گیا ہے۔ اور اگر کہیں بکسر سوم یعنی آتِش کی مثال مل بھی جائے، تو اس کی حیثیت النادر کالمعدوم کی ہوگی۔ اوپر ''فرہنگ آصفیہ'' کی نقل کردہ عبارت میں ''آتَش'' بفتح سوم کے استعمال کی مثالیں ہم جرأت، سعدی اور نظیری کے اشعار میں دیکھ چکے ہیں۔ اس کی ایک اور مثال مولانائے روم کی غزل کے درج ذیل شعر میں ملاحظہ کیجیے:

در عشق آتشینش آتش نخوردہ آتش
بے چہرۂ خوشِ او در خوش ہزار ناخوش

جیسا کہ ظاہر ہے، یہ شعر غیر مردف غزل کا ہے۔ اس شعر کے پہلے مصرعے میں قافیہ ''آتَش'' ہے اور دوسرے مصرعے میں قافیے کا لفظ ''ناخوش'' ہے۔ بظاہر یہ دونوں الفاظ بطور قافیہ بالکل غلط معلوم ہوتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ دراصل لفظ ''خوش'' کو فارسی میں ''خَش'' کے تلفظ کے ساتھ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں مولانا نے اس لفظ کے اسی تلفظ یعنی ''ناخَش'' کے ساتھ آتَش کا قافیہ کیا ہے۔

لفظ ''آتش'' کے تلفظ کی دونوں صورتوں کے مستعمل ہونے کے باوجود یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ خواجہ حیدر علی آتش کے تخلص کو کس تلفظ کے ساتھ درست قرار دیا جائے۔ یعنی ہم یہ کس طرح طے کریں کہ خواجہ صاحب کے تخلص کے طور پر لفظ ''آتش'' کی صحیح صورت کیا ہوگی؟ اس معاملے میں راقم الحروف کو ایسی سند دستیاب ہوئی، جس سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو گیا۔ خیال رہے کہ خواجہ آتش کی وفات پر ان کے احباب

مندرجہ بالا حوالوں کی روشنی میں، اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ''آتَش'' اور ''آتِش'' دونوں تلفظ کے درست ہونے کا اندراج لغات میں موجود ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی زور دے کر بیان کی گئی ہے کہ اساتذہ کے کلام میں ''آتش'' کو بفتح سوم ہی استعمال کیا گیا ہے۔ اور اگر کہیں بکسر سوم یعنی آتِش کی مثال مل بھی جائے، تو اس کی حیثیت النادر کالمعدوم کی ہوگی۔ اوپر ''فرہنگ آصفیہ'' کی نقل کردہ عبارت میں ''آتَش'' بفتح سوم کے استعمال کی مثالیں ہم جرأت، سعدی اور نظیری کے اشعار میں دیکھ چکے ہیں۔



اور شاگردوں نے اردو اور فارسی میں بہت سی تاریخیں کہیں۔ ان میں مصحفی کے باکمال شاگرد اور خواجہ آتش کے استاد بھائی مظفر علی اسیر لکھنوی (1882-1801) کی فارسی میں دو ایسی تاریخیں مجھے دستیاب ہوئیں، جن سے خواجہ آتش کے تخلص کی درست صورت کا مسئلہ حل ہو گیا۔ واضح رہے کہ یہ تاریخیں اسیر لکھنوی کے فارسی دیوان ''گلشن تعشق'' میں شامل ہیں۔ ان تاریخوں میں ایک تاریخ کا مادہ کامل الاعداد ہے، اور دوسری تاریخ میں ایسی کمال کی فنکاری کی گئی ہے جو داد سے مستغنی ہے۔ پہلے وہ دونوں تاریخ ہائے وفات آپ ملاحظہ کریں:

(1)

عجیب شاعر بے مثل قانع و صابر
فصیح و صاحب ایجادِ معنیِ دلکش
سروش غیب چنیں گفت مصرع فوتش
نمودہ بزم جناں گرم جلوۂ آتش 6

1263 ہجری

(2)

دلم از مرگ آتش بود غم کش
ز آتش یافتم تاریخ آتش
زغم تا و الف خود را سہ تا ساخت
تپش از دامن شیں نقطہ انداخت 7

1263 ہجری

یہاں درج بالا دوسری تاریخ وفات کا ترجمہ اس لیے پیش کر دیتا ہوں تا کہ اس میں کارفرما فنکاری کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

(ترجمہ: میرا دل آتش کی موت سے غم میں مبتلا تھا۔ ایسے میں لفظ 'آتش' سے مجھے خواجہ آتش کی تاریخ وفات حاصل ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ پہلے غم کی وجہ سے حرف تا اور الف نے خود کو تین گنا کر لیا اور پھر شدت غم کی تڑپ نے تینوں نقطے شین کے دامن سے نیچے گرا دیے۔)

جیسا کہ آپ نے غور کیا ہوگا، درج بالا پہلے قطعۂ تاریخ کے دوسرے مصرعے میں ''دلکش'' کو ''آتش'' کا قافیہ کیا گیا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ چوتھے مصرعے میں ''آتش'' بطور تخلص استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح دوسری تاریخ کے پہلے شعر میں ''غم کش'' اور ''آتش'' ہم قافیہ الفاظ ہیں، اور یہاں بھی ''آتش'' کا قافیہ بطور تخلص لایا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ اسیر لکھنوی نے اس لفظ کو بفتح سوم یعنی ''آتَش'' ہی استعمال کیا ہے۔ چونکہ اسیر لکھنوی اور خواجہ آتش، مصحفی کے ارشد تلامذہ میں تھے، اس لیے اس بات کا ہرگز امکان نہیں کہ خواجہ صاحب خود کو ''آتِش'' کہتے ہوں، اور ان کے استاد بھائی انھیں ''آتَش'' سمجھتے ہوں۔ ایسے میں خواجہ صاحب کے تخلص کی درست صورت یعنی ''آتَش'' بفتح سوم کے لیے مزید کسی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

> اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ اگرچہ لفظ ''آتش'' کے تلفظ کی دونوں صورتیں درست قرار دی گئی ہیں، اور آتش بکسر سوم بہت عام نہ سہی، آج بھی بولا جاتا ہے، لیکن مظفر علی اسیر لکھنوی کی تاریخوں کی روشنی میں خواجہ حیدر علی آتَش کہنا ہی درست ہے، اور خواجہ حیدر علی آتِش کہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

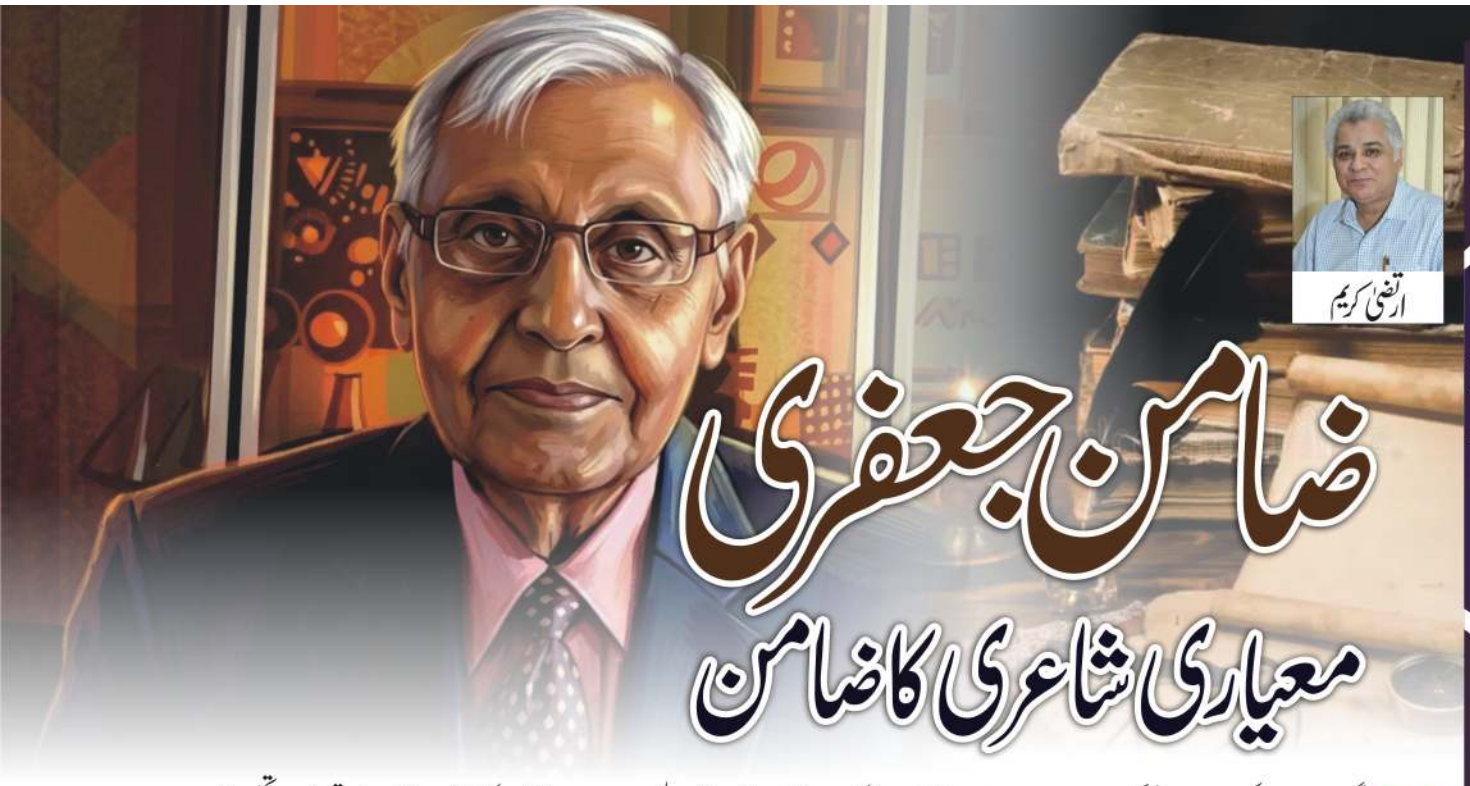
اب درج بالا دوسری تاریخ وفات میں اسیر لکھنوی کے فنکارانہ کمال کو بھی دیکھتے چلیں۔ خیال رہے کہ آتش کا سنہ وفات 1263 ہجری ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں کہا گیا ہے کہ شدت غم کی وجہ سے حرف تا اور الف نے خود کو تین گنا کر لیا، یعنی یہ حروف بھی غم زدہ ہیں اور ان کے غم میں تین گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ واضح رہے کہ حساب ابجد کی رو سے حرف تا کے عدد چار سو ہیں، اور الف کا عدد ایک ہے۔ اس طرح دونوں حروف کے اعداد کو تین گنا کرنے پر 1203 بنتے ہیں۔ شعر کے دوسرے مصرعے میں شین کے تین نقطوں کے گرنے کی بات کہی گئی ہے، اور اس کی توجیہ غم کی شدت میں حرف شین کے تڑپنے سے کی گئی ہے۔ چونکہ حرف شین کے عدد تین سو ہیں، اور جب نقطے گر گئے، تو وہ حرف سین رہ گیا، جس کے عدد ساٹھ ہوتے ہیں۔ اس طرح 1203 میں 60 جمع کرنے سے مطلوبہ عدد یعنی 1263 حاصل ہو جاتا ہے۔

اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ اگرچہ لفظ ''آتش'' کے تلفظ کی دونوں صورتیں درست قرار دی گئی ہیں، اور آتش بکسر سوم بہت عام نہ سہی، آج بھی بولا جاتا ہے، لیکن مظفر علی اسیر لکھنوی کی تاریخوں کی روشنی میں خواجہ حیدر علی آتَش کہنا ہی درست ہے، اور خواجہ حیدر علی آتِش کہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

حواشی:

1 لغات روزمرہ، شمس الرحمٰن فاروقی، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، تیسرا ایڈیشن 2011، ص 45
2 ایضاً ص 46
3 فرہنگ آصفیہ، مولوی سید احمد دہلوی
4 نور اللغات، مولوی نور الحسن نیر
5 نصیر اللغات ترجمۂ اردو غیاث اللغات، محمد نصیر الدین احمد خان، مطبع نول کشور لکھنؤ
6 گلشن تعشق، مظفر علی اسیر لکھنوی، مطبع نول کشور لکھنؤ، بار اول 1899، ص ص 214-213
7 ایضاً ص 214

Prof. Ahmad Mahfooz
Department of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
Mob: 9818952518
Email: amehfuz@gmail.com



ارتضیٰ کریم

ضامن جعفری

معیاری شاعری کا ضامن

29 اگست 2026 کی رات دس بج کر پچاس منٹ پر فون کی گھنٹی بجی۔ بیگم آسیہ جعفری صاحبہ کی سسکتی ہوئی آواز نے ہمیں احساس دلا دیا اور وہی خبر انھوں نے سنائی جس کے لیے میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا کہ: ''ارتضیٰ بھائی ضامن جعفری ہمیں چھوڑ گئے، میں تنہا رہ گئی۔'' ظاہری بات ہے کہ اس جملے نے مجھے بھی سکتے میں ڈال دیا مگر خود کو سنبھالتے ہوئے میں نے کہا: ''بھابی خدائے لم یزل کی مرضی کے آگے ہم سب مجبور ہیں۔ اس کی رضا میں ہم سب راضی ہیں مگر آپ خود کو ہرگز تنہا نہ سمجھیے۔'' حالانکہ یہ تشفی اور تسلی میں خود کو بھی دے رہا تھا کیوں کہ ضامن بھائی سے کم از کم بارہ پندرہ سال پرانے تعلقات تھے اگر چہ وہ ہم سے عمر میں بہت بڑے تھے اور علم میں بھی مگر انھوں نے کبھی اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہم لوگوں کے درمیان بہت بے تکلف گفتگو ہوا کرتی تھی۔ جب میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ڈائرکٹر تھا تو وہ کونسل کی دعوت پر عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے آسیہ بھابی کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ پھر لکھنؤ، پٹنہ اور کئی علاقوں میں خوب گھومے تھے۔ لکھنؤ پہنچ کر تو جیسے ان کے بچپن کے دن لوٹ آئے ہوں۔ آسیہ بھابی بھی لکھنؤ کے اس سفر کو بار بار یاد کرتی رہی ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ فون پر لکھنؤ کے سفر کی روداد سنائی۔

جب جب میں کینیڈا گیا تو انھوں نے بہت ضیافت کی۔ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ بہت محبت کرتے تھے۔ پچھلے دنوں ان کی کتاب 'عزم کا طواف' اور 'اثاثۂ جاوداں' نہایت تزک و احتشام کے ساتھ دہلی سے ہی شائع ہوئی، جس کی ادبی حلقوں میں نہ صرف ہندوستان، پاکستان بلکہ امریکہ اور یورپ میں بھی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اُن کے کئی شعری مجموعے ہیں جن میں 'گُل افشانیِ گفتار' اُن کی مزاحیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ وہ غزل کے شاعر تو ہیں ہی مگر طنز و مزاح پر اُن کی بہت اچھی گرفت ہے۔ اگر غزل کی بات کی جائے تو ان کا صرف ایک شعر ہی ان کی شناخت اور ابدی نیز ادبی زندگی کا ضامن ہے۔

طوفان کر رہا تھا مرے عزم کا طواف
دنیا سمجھ رہی تھی کہ کشتی بھنور میں ہے

کسی شاعر کے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی شعر اس کی زندگی ہی میں عالمگیر حیثیت حاصل کر لے اور ضرب المثل کے دائرے میں داخل ہو جائے۔ مذکورہ شعر کے خالق جناب ضامن جعفری ایسی ہی عظیم المرتبت شخصیتوں میں شامل ہیں۔ وہ ایک ایسے کہنہ مشق، قادرالکلام اور منجھے ہوئے تخلیق کار ہیں کہ جنھوں نے خوب سے خوب تر لکھنے کی سعیٔ کامیاب کی۔ ان کے شعری مجموعہ 'عزم کا طواف' میں اُن کی پوری زندگی کا ذہنی، مشاہداتی، ادراکی، ابعادی، شعوری اور لاشعوری نچوڑ شامل ہے۔ ضامن جعفری جس طرح کی شعری کائنات خلق کرتے ہیں اور جیسے نادر، نازک، جدید اور محظوظ کرنے والے استعارات، تشبیہات، تلازمات اور معنی خیز علامات کا استعمال کرتے ہیں وہ انہی کا خاصہ اور طرۂ امتیاز ہے۔ اُن کے تجدد میں تقدم ہے اور تقدم میں تجدد پیوست رہتا ہے۔ یہ پیوستگی اور امتزاج ہی اُن کے کلام کو تفاخر اور تقدس نیز تغزل اور تجمل کے زمرے میں داخل کر دیتی ہے۔ لہٰذا ان کی شعری بساط قدیم اور جدید کا ایک خوبصورت سنگم ہے۔ وہ نہ تو روایت پرست ہیں اور نہ روایت شکن بلکہ وہ ان دونوں کا احترام بھی کرتے ہیں اور اپنی شاعری میں ان کے التزام کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنی غزلوں کے لیے انوکھی ردیفیں اور قافیے کا استعمال کرتے ہوئے نئی زمینوں کی بھی تلاش کرتے ہیں جس سے اردو غزل میں اُن کا انفراد قائم رہتا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کے کئی شعری مجموعے مثلاً 'گل افشانیِ گفتار'، 'عزم کا طواف'، 'اثاثۂ جاوداں' وغیرہ ہند و پاک سے شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔

ضامن جعفری کی شخصیت اور ان کے احوال و آثار پر نظر ڈالنے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کبھی میر انیس نے اپنے تعلق سے یہ کہا تھا کہ۔

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

اس شعر کا اطلاق ضامن جعفری پر بھی ہوتا ہے۔ خود ان کے الفاظ ہیں:

''میرے والد سید موسیٰ جعفری مرحوم، کولون تعلقدار کالج لکھنؤ (Colvin Taluqdar's College) میں فارسی کے استاد تھے۔ اس سے قبل حمیدیہ کالج کابل میں پڑھاتے رہے۔ انھوں نے انگریزی اور فارسی میں ایم اے اور ایم او ایل اور بی ٹی کی اسناد حاصل کی تھیں۔ 1942 میں رائل انڈین آرمی میں شمولیت اختیار کی اور

ضامن جعفری کا تعلق ماضی کے ترقی اردو بورڈ سے بھی تھا جو آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی شکل میں موجود ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ ان کا رشتہ قلم و قرطاس سے مرتے دم تک قائم رہا۔ وہ 28 فروری 1938 کو بھرت پور سابق راجپوتانہ، موجودہ راجستھان ہندوستان میں پیدا ہوئے اور تقریباً 88 سال کی عمر میں 29 اگست 2026 کو مالک حقیقی سے جا ملے۔

پھر راجپوتانہ رائفلز میں چلے گئے جہاں سے ان کو دوسری جنگ عظیم کے دوران محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ جنگ میں شدید زخمی ہونے کے بعد ان کا آرمی ایجوکیشن کور میں تبادلہ کر دیا گیا۔ 1947 میں تقسیم ہند کے موقعے پر ان کا تبادلہ پاکستان ہو گیا جہاں وہ 1957 میں فوج سے سبکدوش ہو گئے اور بعد میں سیالکوٹ کے ایڈمنسٹریٹر (میئر) ہوئے۔ میری انگریزی، اردو اور فارسی کی بنیادیں میرے والد اور میرے دادا نے رکھیں اور مضبوط کیں۔ دادا سید محمد علی جعفری مرحوم لاہور میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ لکھنؤ میں والد کے مولانا صفی لکھنوی، ظریف لکھنوی اور قبلہ ناصر حسین صاحب یعنی تین نابغۂ روزگار شخصیت سے بہت قریبی مراسم تھے۔ میں نے صرف صفی لکھنوی کو دیکھا باقی دو میری پیدائش سے قبل رحلت فرما چکے تھے۔ گھر میں بھی بچپن سے شعر و ادب کا ماحول تھا۔

تعلیم کے بعد جوش ملیح آبادی مرحوم مجھے ترقی اردو بورڈ یعنی موجودہ اردو لغت بورڈ میں ملازمت دے کر لے آئے جہاں اُن دنوں وہ لسانی مشیر (لینگویج ایڈوائزر) تھے۔ وہاں مجھے جوش صاحب کے ساتھ ساتھ شان الحق حقی مرحوم اور نسیم امروہوی مرحوم کی سرپرستی حاصل ہوئی جو بعد میں زندگی بھر میرے کام آئی لیکن ایک عجیب بدقسمتی یہ ہے کہ ایسے علمی اداروں میں بھی رقابت و سیاست کا ماحول اکثر فضا کو مکدر کر دیتا ہے اور کیے رہتا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد میں نے ایئر لائن کی ملازمت اختیار کر لی۔ 1970 کا آغاز تھا کہ میں وہاں سے بھی دل برداشتہ ہو کر انگلستان چلا گیا۔

اگرچہ اس سے قبل بھی میرا بسلسلہ ملازمت کئی مرتبہ لندن آنا جانا ہو چکا تھا لیکن اس دفعہ کا آنا بہت مختلف نوعیت کا تھا۔ نہ کوئی ملازمت تھی، نہ کوئی ٹھکانہ تھا۔ میں کشتیاں جلا کر آیا تھا۔ شاید قدرت مجھے مستقبل میں پیش آنے والے مشکل وقت سے نبرد آزما ہونے کے لیے پہلے سے تیار کر چکی تھی۔ عین ممکن ہے کہ میرے عناصر اربعہ کے ہمراہ سیمابیت کا عنصر بھی اسی سبب سے میری فطرت میں شامل کر دیا گیا ہو۔ والد سے خوشنویسی اور بعد ازاں مشہور زمانہ خطاط محمد یوسف دہلوی سے خطاطی میں رہنمائی حاصل ہوئی۔ ماضی کے یہ تمام شوق ذرائع روزگار بن کر لندن کے ابتدائی ایام میں میرے بہت کام آئے۔

ایسیکس کاؤنٹی (Essex County) کے اے ڈویژن کی ٹیم میں تین دن مستقل پریکٹس میں بلا کر بیٹنگ اور باؤلنگ دیکھ کر مجھے ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ بعد ازاں جلد ہی کمیونٹی ریلیشنز کمیشن (سی۔آر۔سی) اور ریس ریلیشنز بورڈ (آر۔آر۔بی) میں انگریزی زبان سے نابلد اردو بولنے والے تارکین وطن کے لیے برطانوی قوانین اور معلومات کا انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کا جز وقتی کام متواتر ملنے لگا۔ کچھ عرصہ بعد شیفیلڈ ایجوکیشنل کمیٹی کے تحت یوتھ سینٹرز میں یوتھ لیڈر اور کرکٹ کوچ کے فرائض انجام دیے اور ساتھ ساتھ بی بی سی ریڈیو یورشیفیلڈ کے مختلف پروگراموں میں مہمان کی حیثیت سے شرکت کا موقع ملا۔ دو سال کی مستقل خانہ بدوشی اور تگ و دو کے بعد مجھے لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر ایک کینیڈین ایئر لائن ہینڈلنگ کمپنی میں ملازمت مل گئی اور میں واپس لندن آ گیا۔

ایک طرف تو لندن میں ستر کی دہائی کا آغاز برطانیہ کی ٹرانسپورٹ اینڈ جنرل ورکر یونین نامی بے تحاشا طاقتور مزدور یونین سے ہوا تھا۔ کینیڈین کمپنی بہت تیز رفتاری سے اپنے قدم جما رہی تھی اور یہ بات نہ وہاں کی قومی ایئر لائن کو گوارا ہوئی نہ لیبر یونین نے برداشت کی۔ معاملات عدالت اور پھر ہڑتال تک جا پہنچے۔ آخر کار کمپنی انگلینڈ میں اپنے دروازے بند کر کے مجھے انگلینڈ سے کینیڈا لے گئی اور پھر کینیڈا ہی میرا مستقل مسکن بن گیا جہاں میں مختلف کاروباری سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ قرطاس و قلم سے رابطہ کبھی نہیں ٹوٹا ہمیشہ قائم رہا۔''

مذکورہ بالا عبارت سے ضامن جعفری صاحب کی شخصیت پر جہاں کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے وہیں یہ بھی حقیقت سامنے آتی ہے کہ ضامن جعفری کا تعلق ماضی کے ترقی اردو بورڈ سے بھی تھا جو آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی شکل میں موجود ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ ان کا رشتہ قلم و قرطاس سے مرتے دم تک قائم رہا۔ وہ 28 فروری 1938 کو بھرت پور سابق راجپوتانہ، موجودہ راجستھان ہندوستان میں پیدا ہوئے اور تقریباً 88 سال کی عمر میں 29 اگست 2026 کو مالک حقیقی سے جا ملے۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے ان کے شعری مجموعے 'عزم کا طواف' پر بات کیجیے یا 'اثاثۂ جاوداں' پر یا ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے مجموعے 'گل افشانیٔ گفتار' کو موضوع بحث بنائیے۔ یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کی شاعری اہل فکر و نظر کو متوجہ بھی کرتی ہے اور اردو شاعری کی معیاری روایت کو آگے بھی بڑھاتی ہے۔

غالب نے مومن کے اس شعر:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا



کے عوض اپنا پورا دیوان مومن کے نام کرنا چاہا تھا۔ ظاہر ہے مومن کے اس شعر میں سادگی کے ساتھ جس درجہ بلاغت اور معنی آفرینی ہے اسی نے غالب کو اس حد تک متاثر کیا تھا۔ ادبی تاریخ میں ایسے کئی شعرا ہیں جو صرف اپنے ایک شعر کی بنا پر ادب میں دوامی زندگی پا چکے ہیں۔ مثلاً رام نرائن موزوں کا یہی شعر:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پر کیا گزری

انہیں بقائے دوام بخش گیا۔ اس نوع کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ بالکل اسی طرح ضامن جعفری کا ایک شعر جو ان کے شعری مجموعے کا نام بھی ہے یعنی 'عزم کا طواف' اس کا یہ شعر:

طوفان کر رہا تھا مرے عزم کا طواف
دنیا سمجھ رہی تھی کہ کشتی بھنور میں ہے

ایسا شعر ہے جس کی بنا پر یہ بات بلاخوف وتردید کہی جاسکتی ہے کہ اگر وہ اس شعر کے علاوہ کچھ بھی نہ کہتے جب بھی شعری ادب میں ان کا مقام محفوظ رہتا کیوں کہ یہ نہایت غیر معمولی شعر ہے اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے کہ: ''نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں''۔ اس شعری مجموعے 'عزم کا طواف' کا طواف کرتے ہوئے یہ احساس توانا ہوتا جاتا ہے کہ اس کا شاعر طواف شعر کے ارکان سے بخوبی واقف ہے۔ اس کے شاعر کو اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ وہ موضوعات کو شعری پیکر عطا کرنے میں کامیاب اور کامران نظر آتا ہے۔ چند اشعار مشت نمونہ از خروار ملاحظہ کیجیے اور غور فرمائیے کہ ان اشعار کو جدید اور قدیم شعری روایت کی توسیع ہی کا تو عنوان دیں گے۔

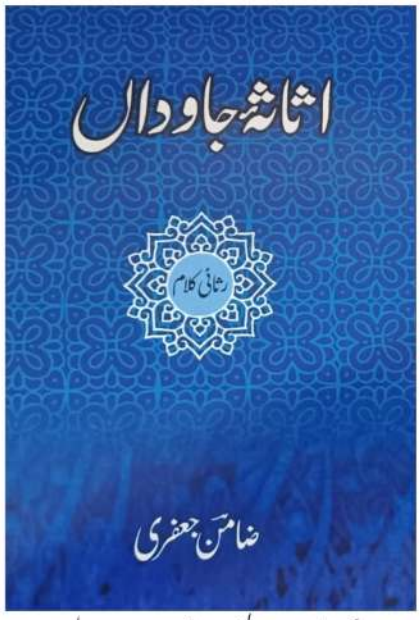
چشم گریاں سے ٹپک پڑتا ہے ضامن یہ سوال
کیسا گلشن ہے غزل خواں نہیں ہوتا کوئی

پردہ تو امتحان نظر کا ہے ایک نام
بینا ہے وہ جسے پس پردہ دکھائی دے

سایے کے بھلا کیا قد و قامت سے الجھنا
سورج سے تو نمٹو جو ہے دیوار کے پیچھے

لوگ نفرت علی الاعلان کیا کرتے ہیں
ہم گنہگار ہوئے ہیں کہ محبت کی ہے

ضامن جعفری کی شعری کائنات قاری کو قرأت کی بار بار دعوت دیتی ہے۔ اس مقام پر ان کے رثائی کلام کے مجموعے 'اثاثۂ جاوداں' پر بھی مختصر سی گفتگو ضروری ہے۔ 'اثاثۂ جاوداں' میں ضامن جعفری کے ساتھ ساتھ ان کے خاندان کے بارہ افراد کا کلام بھی شامل ہے جس میں خاص طور پر اُن کے والد محترم سید موسیٰ جعفری زار اور والدہ ماجدہ خورشید زہرا رضوی بھی شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے جذبات وخیالات واحساسات کو مختلف صنف کے توسل سے صفحۂ قرطاس پر مرتسم کرنے کی بلیغ سعی کی ہے۔ انھوں نے اہل بیت، پیغمبر علیہ السلام کے افرادِ خاندان اور شہدائے کربلا کو رثائی رنگ و آہنگ میں بڑی خوبصورتی اور دل آویزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے پہلے بارگاہِ خداوندی میں چند حمد تحریر کی ہیں۔ بعد ازاں رثائی کلام کے لیے نعت، منقبت، نوحہ، سلام اور دیگر اصناف سخن یعنی رباعی وغیرہ میں بھی رثائی عناصر کو بحسن وخوبی قلم کی گرفت میں لے کر اہل بیت بالخصوص شیر خدا حضرت علی اور امام حسن اور حسین کو خراجِ عقیدت پیش کی ہے۔ انھوں نے مذکورہ تمام شعری اصناف میں جہاں کردار نگاری اور سیرت نگاری سے کام لیا ہے وہیں شاعر نے صنعتِ تلمیح کا جگہ جگہ استعمال کرتے ہوئے تاریخی واقعات اور حادثات کو بھی شعری پیراہن عطا کیا ہے۔ ضامن جعفری کا یہ کام اس اعتبار سے بھی الگ نوعیت کا حامل ہے کہ انھوں نے اپنے افرادِ خاندان کے تمام شاعروں کے رثائی کلام کو بھی 'اثاثۂ جاوداں' میں شامل کر کے رثائی ادب کے دامن کو وسعت، معنویت اور کشادگی بخشی ہے۔

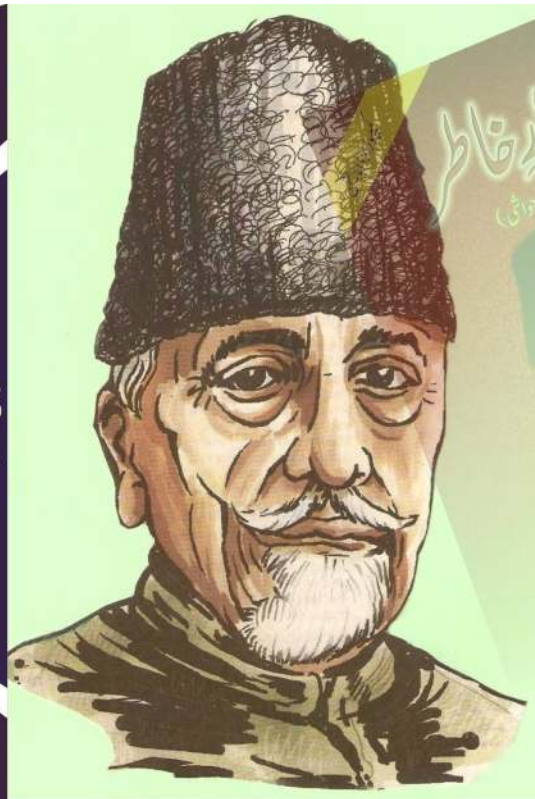


اسی طرح 'گل افشانیٔ گفتار' ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل کلام کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے طنزیہ اور مزاحیہ کلام کہتے ہوئے اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو اور نہ تو ابتذال کی کوئی صورت پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ 'گل افشانیٔ گفتار' کے مطالعے سے قاری ایک طرف سماج کی ناہمواریوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور دوسری طرف سماج میں موجود مختلف مزاج کے کرداروں کی نفسیات سے بھی روبرو ہوتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ضامن جعفری کے شعری سرمائے کا سنجیدگی سے مطالعہ اس استنباط کو تقویت بخشتا ہے کہ ان کی شاعری ہماری ادبی تاریخ کے مستقبل کی بہترین اور مضبوط ضامن ہے۔ چلتے چلتے اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ضامن جعفری کے نثری مضامین پر مشتمل کئی کتابیں زیر طبع ہیں۔ دراصل ایک مختصر مضمون میں ان کی



شخصیت اور ادبی فتوحات کا احاطہ کار مشکل ہے۔ ان پر تحقیقی مقالے لکھے جائیں تاکہ ان کے احوال وآثار پر اچھی، معلوماتی اور طویل گفتگو ہو سکے۔ اس کے بعد اردو کے ارباب فکر ونظر ضامن جعفری کی ادبی حیثیت کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ میرا جہاں تک مطالعہ ہے میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ضامن جعفری کو اردو معیاری شاعری کا ضامن کہا جاسکتا ہے۔

Prof. Irteza karim
45,Lekh Ram Road, Near Mother Diary,
Hindi Park, Daryaganj,
New Delhi-110002
Mob:9910074933
E-mail:karim.irteza@gmail.com





فیروز بخت احمد

مولانا ابوالکلام آزاد
ایک وطن دوست رہنما

تقسیم ہند سے قبل اور بعد کے حالات کے تناظر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت بہت ہی اہم ہے۔ انھوں نے پارٹیشن کو ہولناک خیال کیا۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے مسائل کا حل پاکستان قطعی نہیں تھا۔ پاکستان قدرتی طور پر تمام مسلمانوں کا مسکن نہیں بن سکتا تھا اور نہ ہی تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات استوار رہ سکتے تھے۔ مولانا کے نزدیک اصل مسئلہ معاشی تھا ساتھ ہی مسئلہ جماعتوں کے بیچ اختلافات کا نہیں بلکہ طبیعتوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کا تھا۔ مولانا نے اپنے سیاسی ساتھیوں پر زور دیا کہ تقسیم کا نتیجہ مفید نہ ہوگا، نفرت بالآخر باہمی جنگ کا سرد آغاز ہوگی۔ جو چیز نفرت پر بن رہی ہو اس کے متعلق کوئی مثبت رائے قائم کرنا مشکل ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انجام کیا ہوگا، دونوں کے مابین سرد جنگ چلتی رہے گی۔

بقول مولانا آزاد کے بھتیجے نورالدین احمد (راقم الحروف کے والد ماجد) جن کو انھوں نے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا، مولانا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی کو نہ تو برا کہتے اور نہ ہی کسی کی غیبت کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا کہ جب تحریکِ پاکستان زور شور سے رواں دواں تھی تو مولانا ابوالکلام آزاد دہلی سے الہ آباد جا رہے تھے تو راستے میں علی گڑھ اسٹیشن پر ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا۔ نورالدین صاحب نے بتایا کہ جب پنڈت سُندر لال نے دوسرے روز اخبار میں پڑھا کہ مولانا صاحب کے ساتھ یہ حرکت ہوئی تو فوراً وہ الہ آباد اسٹیشن پہنچے اور مولانا کی دلجوئی کی کہ یہ نہایت ہی افسوس کی بات ہے کہ آپ کے ساتھ بدسلوکی کی گئی تو مولانا بجائے غصّے کے مسکرائے اور بولے، ''پنڈت جی کیا کیا جائے، اپنی ہی اولاد ہے، ہوگئی شرارت۔ اب اس پر افسوس کرنے سے کیا حاصل۔ ہم کو کام تو ان سے ہی لینا ہے۔'' الغرض مولانا کی زبان سے کوئی بُرا کلمہ یا شکوہ شکایت یا کوئی ناگوار بات کسی نے نہ سنی۔ 90 سالہ مالک رام جو ''ترجمان القران'' کے مدیر ہیں، فرماتے ہیں، ''مولانا آزاد کے کردار کے اندر جو دو چیزیں لاجواب تھیں، وہ یہ تھیں کہ وہ اپنے مخالف کو برا کہنا جانتے ہی نہ تھے۔ مالک رام نے بتایا، ''مولانا کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا گیا، کیا کچھ نہیں کہا گیا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی زبان سے قائد اعظم، لیاقت علی خان یا مسلم لیگ کے دوسرے لیڈر یا خود مسلم لیگ کے متعلق بدگوئی سنی ہی نہیں۔ حالانکہ ''قومی تقسیم کی تحریک والے رہنماؤں نے مولانا پر الزام تراشی کی بوچھار سی کر رکھی تھی۔''

جہاں تک مولانا آزاد کی ذاتی زندگی کا تعلق ہے، وہ ایماندار اور صاف گو انسان تھے۔ باوجود اس کے کہ جب وہ وزیر تعلیم تھے، ان کے باورچی خانہ میں چھ چائے کے کپ ایک جیسے نہیں تھے کہ اگر کچھ لوگ آجائیں تو ایک جیسے کپوں میں چائے دے دی جائے۔ ایمانداری ایسی کہ لوگ دانتوں تلے انگلی دباتے اور ان کے اپنوں کو اکثر شکایت ہو جاتی۔ ایک مرتبہ ہوا یہ کہ آئی سی ایس آر کہ جس کے وہ پہلے چیئرمین تھے، وہاں لائبریرین کی کوئی اسامی خالی تھی۔ اس دوران مولانا دہلی سے باہر تھے۔ جہاں تک نورالدین صاحب کا تعلق تھا، وہ کوئی ملازمت یا بزنس نہیں کرتے تھے، کیونکہ طبیعتاً کچھ آرام طلب تھے۔ حالانکہ اچھے خاصے کوالی فائڈ تھے مگر اس بات کی عادت پڑ گئی تھی کہ وزیر کے بھتیجے ہیں، ان کے ساتھ رہتے ہیں، تو زندگی آرام سے ہی گزر رہی ہے۔ بہت سے لوگ بھی ان کے تعلق سے یہی سوچتے تھے، مگر کلکتہ کے سینٹ زیویئرز کالج سے فارغ ہونے کے بعد وہ خود بھی کسی کام سے جڑنا چاہتے تھے۔ جب مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری، جناب محمد اجمل خان کے ذریعہ انھیں پتہ چلا کہ ایک لائبریرین کی پوسٹ خالی ہے، تو انھوں نے اجمل صاحب سے عرض کیا کہ وہ ملازمت انھیں دے دی جائے۔ فوراً دفتری میمو بنا اور انھیں لائبریرین کی پوسٹ پر فائز کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب مولانا آزاد کو پتہ چلا تو وہ بڑے تیغ پا ہوئے اور انھوں نے اس بات کا برا مانا کہ اجمل خاں نے انھیں وہ پوسٹ دلوا دی۔ اجمل خاں نورالدین صاحب کو بہت پسند کرتے تھے اور باوجود اس کے کہ انھوں نے مولانا سے نورالدین صاحب کی وکالت کری کہ لڑکا کوالی فائڈ ہے اور آخر کار ان کے بیٹے کی طرح ہے تو اس ملازمت میں کیا حرج ہے۔ اس پر مولانا نے جواب دیا کہ تبھی تو وہ نہیں چاہتے کہ ان کا بھتیجا، کسی سرکاری ادارے میں، جس کے سربراہ وہ ہیں، ملازمت

کرے۔ لوگ کہیں گے کہ مولانا اقربا پروری کر رہے ہیں۔ لہٰذا مولانا نے فوراً آرڈر دیا کہ نورالدین کو نوکری سے ہٹایا جائے اور جتنے دن انھوں نے کام کیا ہے، اس کے بدلے انھیں ایک روپیہ کا معاوضہ دیا جائے۔

ہندوستان کے مسلم رہنماؤں میں بہادر شاہ ظفر کے بعد مولانا واحد ایسے لیڈر تھے جنھوں نے آزادی ہند کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کیا تھا۔ انگریزوں کا ہندوستان پر قبضہ ایک لمحہ بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اپنی ایک تقریر میں انھوں نے کہا تھا کہ انگریزوں کے غلام رہ کر مسلمان ہندوستان میں زندگی بسر کریں، یہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے ''الہلال'' کے ذریعے مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ آزادی کی راہ میں قربانی اور جاں فروشی ان کا قدیم ورثہ ہے۔ ان کا فرض یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں اپنے پیچھے چھوڑ دیں۔ انھوں نے کہا کہ ان کی صدائیں بیکار نہ گئیں۔ مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور جین بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں گے۔ جب انگریزی بیوروکریسی نے دیکھا کہ یہ آدمی تو تمام ہندو اور مسلمانوں کو متحد کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے تو یہ بات وہ برداشت نہ کر سکے۔ اس لیے مولانا کے اخبار 'الہلال' کو ضبط کر لیا گیا اور اس کی تمام ضمانت کا پیسہ بھی ضبط ہو گیا۔ پھر جب (البلاغ) کے نام سے دوبارہ جاری کیا گیا تو 1916 میں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ بقول انگریزوں کے مولانا اس اعتبار سے بہت خطرناک تھے کہ انھوں نے انگریزوں کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر دیا تھا۔

تقسیم کو آخری وقت تک روکنے کی کوشش رہی مولانا کی۔ مولانا سے جب کسی نے دریافت کیا کہ پارٹیشن کے بارے میں وہ کیا سوچتے ہیں تو انھوں نے کہا، ''کیا تلوار سے پانی کے دھارے کو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟'' مولانا کے خلاف خود مسلمانوں اور بعض مسلم رہنماؤں کے ذریعہ شخصیت کی غلط تصویر پیش کی گئی، تاہم انھوں نے اس کی پروا کیے بغیر ماؤنٹ بیٹن سے کئی ملاقاتیں کیں مگر ملک کی تقسیم سے متعلق اس نے اپنی بات کو بالاتر رکھا اور ملک کو دو ٹکڑے ہونے سے بچانے کی تمام تدبیریں مولانا کو ناکام ہوتی نظر آئیں۔

مولانا کا دل اس بات سے بالکل بیٹھ چکا تھا۔ ایک ہندوستان، متحد اور بڑا ہندوستان اور ہندو مسلم دوستی کا ضامن ہندوستان پارٹیشن کا شکار بن گیا تھا، فرقہ وارانہ ذہنیت کا لقمہ بن رہا تھا اور ان کے خوابوں کی دنیا اُجڑ چکی تھی۔ جشنِ آزادی میں وہ شریک تو ہوئے، مگر آدھے دل سے کیونکہ وہ مشن جس کے لیے وہ تمام عمر کوشاں رہے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ کسی بھی قسم کی قربانی کے ذریعہ انھوں نے ہندوستان کی تقسیم کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جیلوں میں اذیت جھیلی، اپنی

جب انگریزی بیوروکریسی نے دیکھا کہ یہ آدمی تو تمام ہندو اور مسلمانوں کو متحد کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے تو یہ بات وہ برداشت نہ کر سکے۔ اس لیے مولانا کے اخبار 'الہلال' کو ضبط کر لیا گیا اور اس کی تمام ضمانت کا پیسہ بھی ضبط ہو گیا۔ پھر جب (البلاغ) کے نام سے دوبارہ جاری کیا گیا تو 1916 میں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ بقول انگریزوں کے مولانا اس اعتبار سے بہت خطرناک تھے کہ انھوں نے انگریزوں کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر دیا تھا۔

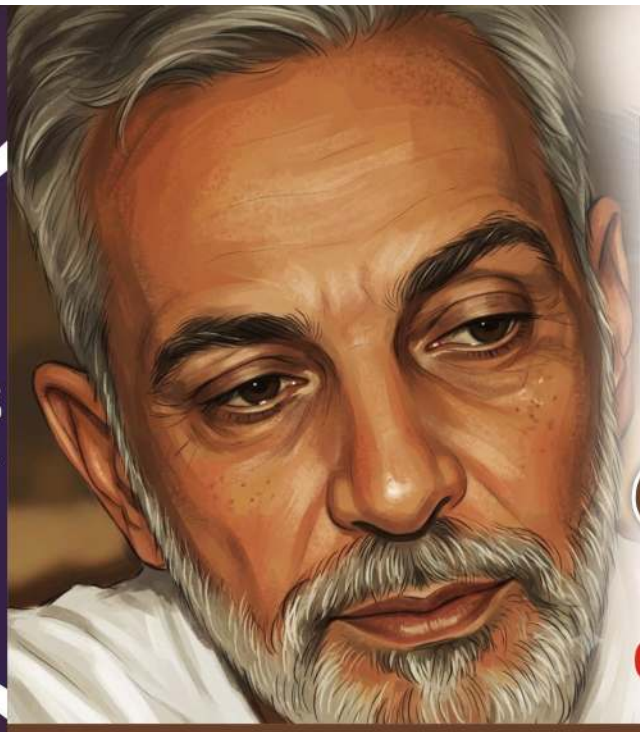
شریک حیات زلیخا بیگم کے جنازے تک میں شریک نہ ہو سکے۔ یہ سب قربان کرنے پر بھی انھیں ان کے خوابوں کا ہندوستان حاصل نہ ہو سکا۔

ان کو مسلمانوں سے متعلق شکوہ تھا کہ یہ تاریخ و تجزیہ کے انسان نہیں بلکہ افتاد و ہنگامہ کی مخلوق ہیں۔ ہندو پاک کی آزادی خون میں ڈوب کر طلوع ہوئی۔ فرقہ وارانہ فسادات برطانوی مِشن کے زمانہ میں ہی شروع ہو چکے تھے۔ جب مشن ہندوستان میں تھا تو اس نے بھی اس جانب عدم توجہی کا ثبوت دیا کہ چلو آپس ہی میں مر کٹ رہے ہیں، نواکھالی، سلہٹ، بہار، گڑھ مُکتیشر، امرتسر، لاہور، راولپنڈی، غرض کہ کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں خون نہ بہا ہو۔ مولانا نے ان دنوں دہلی کی شاہی جامع مسجد میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے ایک دل گداز تقریر کی تھی، ''..... میں نے تمھیں پکارا، تم نے میری زبان قطع کر لی۔ میں نے قلم اٹھایا، تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیے۔ میں نے چلنا چاہا، تم نے میرے پاؤں توڑ دیے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی، تم نے میری کمر توڑ دی۔ تم نے غفلت و انکار کی وہ تمام یادیں تازہ کر دیں جو روبہ انحطاط قوموں کا مقدر ہوتی ہیں۔''

آج نہ صرف مسلمان کو بلکہ ہندوستان کی تمام قوموں کو مولانا آزاد جیسے رہنما کی ضرورت ہے۔ ایک ایسی ہی تقریر کی ضرورت ہے جو انھوں نے دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں سے کی تھی اور جس کا ردِ عمل یہ ہوا تھا کہ مسلمانوں کی ٹوٹتی ہوئی ہمت سنبھل گئی تھی مایوسی دور ہونے لگی تھی، ان کے حوصلے اور عزائم جاگ اٹھے تھے اور ایک بڑے طبقہ کا سوچنے کا ڈھنگ بدلا تھا، انداز بدلے تھے۔ مسلمانوں کے فیصلوں میں تبدیلی آئی۔ آج ملک کا صالح ذہن محسوس کرتا ہے کہ مولانا آزاد بڑے محبِّ وطن اور قومی رہنما بھی تھے۔ ان کا سیاسی نظریہ ہندو مسلم اتحاد کا امین بھی رہا اور ہندوستان کی جنگ آزادی کی راہ کے لیے روشن چراغ کا کام بھی انجام دیتا رہا ہے اور آج بھی موجود ہے۔ آئندہ بھی ملک کی سالمیت اور ترقی کے لیے ان کے افکار و خیالات، ان کے حوصلے و عزائم، ان کا صبر و ضبط اور جنگِ آزادی کی منزلوں میں ان کے نقشِ قدم ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے اور مضبوط اور خوشحال ہندوستان بنانے میں معاون ثابت ہوتے رہیں گے۔ مولانا ایک عالم دین، مفکر، دانشور اور ادیب کی حیثیت سے نہایت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ گو ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ سیاست کی نذر ہوا، پھر بھی 'ان کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی اور سماجی تحریریں میں انھیں صنف اوّل کے مصنّفین میں جگہ دلانے کے لیے کافی ہیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اور حقائق سامنے آتے جائیں گے ان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا اور وہ عظیم سے عظیم تر ہوتے جائیں گے۔

■

Firoz Bakht Ahmad
A-202, Adeeba Market & Apts
Near Rahmani Masjid, Main Road
Zakir Nagar, Okhla, Road
New Delhi-110025
Mob.:9810933050
Email: firozbakhtahmed08@gmail.com







عبدالسمیع

علی امام نقوی کے افسانے

علی امام نقوی کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے فکر وفن سے جدید اردو افسانے کی دنیا کو وسعت بخشی۔ وہ 9 نومبر 1945 کو ممبئی میں پیدا ہوئے۔ گھر کی معاشی حالت اچھی نہ ہونے کے سبب اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد والد کے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ والد کے کاروبار سے بیزار ہوئے تو ممبئی میں مختلف قسم کے روزگار سے وابستہ ہوکر اپنی معاشی حالت میں بہتری لانے کی کوشش کی۔ آخر کار ایران قونصلیٹ میں ملازم ہوگئے اور وہاں سے 1997 میں سبکدوش ہوئے۔

رسمی تعلیم سے محروم ہونے کے باوجود علی امام نقوی نے اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ ان کے اندر پوشیدہ تخلیقی جوہر کا اظہار اسکول کے زمانے میں ہی ہونے لگا تھا لیکن اشاعت کا مرحلہ 1960 کے بعد طے ہوا۔ ملازمت کے دوران گھریلو حالات جب معمول پر آنے لگے تو انھوں نے افسانہ نگاری پر توجہ دی اور مختلف رسائل واخبارات کو اپنی تخلیقات ارسال کیں۔ ان کے ابتدائی افسانے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے لیکن رفتہ رفتہ ان کے افسانوں میں درآئی صلابت اور پختگی، مدیران اور قارئین کی توجہ منعطف کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ وقفے وقفے سے ان کے افسانوں کے 5 مجموعے اور 2 ناول منظر عام پر آئے۔

علی امام نقوی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'نئے مکان کی دیمک' 1980 میں شائع ہوا۔ اس میں 18 افسانے شامل ہیں۔ 21 افسانوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ 'مباہلہ' 1988 میں چھپا۔ اس مجموعے میں شامل افسانے علی امام نقوی کی افسانہ نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔ ان افسانوں نے ان کی ادبی شناخت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا، نیز یہ افسانے جدید اردو افسانہ کی تاریخ میں منفرد اور اہم افسانے قرار پائے۔ 1991 میں ان کا ناول 'تین بتی کے راما' منظر عام پر آیا، جس نے علی امام نقوی کو بطور ناول نگار نئی شناخت عطا کی۔ ان کے 15 افسانوں پر مشتمل مجموعہ 'گھٹتے بڑھتے سائے' 1993 میں شائع ہوا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے ایک سال بعد 1998 میں افسانوں کا چوتھا مجموعہ 'موسم عذابوں کا' منظر عام پر آیا۔ ان کا دوسرا ناول 'بساط' 2000 میں اور ان کے افسانوں کا آخری مجموعہ 'کہی ان کہی' 2012 شائع ہوا۔ 10 مارچ 2014 کے دوپہر کو ممبئی میں علی امام نقوی کا انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

علی امام نقوی کی افسانہ نگاری کا آغاز گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صنف افسانہ فکری اور فنی سطح پر کئی تجربوں سے ہمکنار ہوکر نئی آب وتاب کے ساتھ اپنی جڑوں سے رشتہ قائم کر رہی تھی۔ اس عہد کے تقریباً تمام افسانہ نگار فکر وخیال میں ندرت پیدا کرنے کے ساتھ اظہار اور بیان کے نئے راستے دریافت کرنے میں مصروف تھے۔ علی امام نقوی نے بھی ان تجربوں سے استفادہ کیا اور اردو افسانے کو ایک نئی راہ دکھانے کی کوشش کی۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'نئے مکان کی دیمک' شمیم پبلی کیشن ممبئی سے 1980 میں شائع ہوا۔ اس کا انتساب والدین اور بڑی بہن کے نام ہے۔ ابتدا میں افسانہ نگار کا مختصر تعارف موجود ہے جس سے نام، ولدیت، پتہ، تاریخ پیدائش وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔

'نئے مکان کی دیمک' میں شامل افسانوں کا تعلق مختلف موضوعات سے ہے۔ مثلاً 'رام بجار' انسان کے دہرے جذبے یعنی ہمدردی اور ریاکاری سے عبارت ہے۔ اس میں خلوص اور ڈھونگ کو مخصوص نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے جب کہ 'نئے مکان کی دیمک' میں حیات وکائنات کی پراسرار پرتوں کو کھولنے کی سعی کی گئی ہے۔ 'دانتوں میں گھری زبان' احساس وجود کی اور خوداعتمادی کی عمدہ مثال ہے۔ اس مجموعے کے دوسرے افسانے بھی اپنے موضوع اور پیش کش کے لحاظ سے متاثر کن ہیں۔

علی امام نقوی کو بھی احساس تھا کہ 'نئے مکان کی دیمک' اہم اور متاثر کن افسانہ ہے۔ اس کی انفرادیت کے سبب ہی اسے مجموعے کا نام دیا گیا ہے۔ زمان ومکان اور وجود وعدم کے مباحث ہماری علمی روایت میں اہم موضوع کی صورت میں ازل سے موجود ہیں۔ شعروادب میں بھی ان کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ اس لیے یہ موضوعات نئے تو نہیں کہے جاسکتے لیکن افسانے میں انھیں اس طرح پیش کرنا کہ زمان ومکان اور وجود وعدم کی سرحدیں ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہوجائیں کہ انھیں الگ کرنا ممکن نہ ہو اور قصہ گوئی کا فن بھی متاثر نہ ہو، فکشن کی تاریخ میں کم ملتی ہیں۔ ایسے مباحث کو افسانے کا حصہ بنا دینا تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ فکر

وخیال اور زمان ومکان کے مباحث سے گہری واقفیت کا متقاضی ہے۔ 'نئے مکان کی دیمک' میں افسانہ نگار نے کائنات اور کائناتی وجود کے ساتھ جو تخلیقی رویہ اختیار کیا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے شادعظیم آبادی کے درج ذیل شعر کی معنویت ذہن کے نہاں خانوں میں روشن ہونے لگتی ہے۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

'نئے مکان کی دیمک' کا ابتدائی حصہ ملاحظہ کیجیے:

''ہڈیوں کے اس پنجرے پر گوشت پہلے منڈھا گیا تھا یا گوشت کے اس پیکر میں پنجرہ بعد میں رکھا گیا، اس کا اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ البتہ وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ وہ اس پنجرے اور اس پہ منڈھے گوشت میں گذشتہ اٹھائیس برسوں سے قید ہے۔''1

روح وجسم کی کشاکش اور ہم آہنگی سے متعلق بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ انسانی وجود بلکہ تمام مخلوقات کی اصل اس کی روح ہے اور روح کے بغیر مادّی وجود باقی نہیں رہتا۔ انسان روح کے بغیر ہار مونس کا صرف مجسمہ رہ جاتا ہے۔ یعنی جسم کی حیثیت ثانوی ہے اور روح کے بغیر اس کی ثانوی حیثیت بھی برقرار نہیں رہتی۔ اس کے برعکس روح آزاد ہوتی ہے اور جسم سے آزاد ہوکر بھی اس کی حرکت وعمل میں تعطل اور جمود واقع نہیں ہوتا۔ روح کے تعلق سے جو باتیں کہی جاتی ہیں انھیں مابعدالطبیعاتی مطالعات کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ روح ایک ماورائی اور تصوراتی شے ہے جس کے بارے میں کوئی ٹھوس اور قطعی بات کہنا یا کوئی حتمی مفروضہ قائم کرنا مناسب نہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں جسم کی اہمیت اور اس کے قائم بالذات ہونے پر اصرار کیا جانے لگا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جسم کے بغیر روح بھی اپنا وجود ثابت نہیں کرسکتی۔ اس لیے دونوں کی ثنویت اور دوئی والے مباحث اب بہت بامعنی نہیں رہے۔ علی امام نقوی نے دونوں نظریات کو سامنے رکھا ہے کہ روح جسم میں مقید بھی ہوتی ہے اور اس سے آزاد بھی۔ روح کا آزاد اور قائم بالذات وجود ہے یا نہیں، اس خالص علمی اور مابعدالطبیعاتی بحث کے کسی ایک نظریے کو تخلیقی سطح پر درست یا غلط بتانے سے وہ گریز کرتے ہیں۔ افسانے کا حسن اسی نکتے میں پوشیدہ ہے کہ افسانہ نگار کسی ایک رخ پر اصرار نہیں کرتا۔ انسان کب اور کیسے وجود میں آیا، یہ عقدہ آج تک لاینحل ہے۔ مذاہب کی اپنی دلیلیں ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے متعلق کوئی سائنٹفک نظریہ حتمی نہیں ہے۔ زمان ومکان اور وجود وعدم کی بحث جتنی قدیم ہے اتنی ہی پیچیدہ ہے۔ 'نئے مکان کی دیمک' اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

'نئے مکان کی دیمک' بظاہر خودکشی اور اسلامی تصور زمان ومکان اور دونوں جہان سے وابستہ فلسفے پر مشتمل ہے جس میں زندگی، موت، جسم، روح غرض ہر

> **علی امام نقوی کو بھی احساس تھا کہ 'نئے مکان کی دیمک' اہم اور متاثر کن افسانہ ہے۔ اس کی انفرادیت کے سبب ہی اسے مجموعے کا نام دیا گیا ہے۔ زمان ومکان اور وجود وعدم کے مباحث ہماری علمی روایت میں اہم موضوع کی صورت میں ازل سے موجود ہیں۔**

چیز کی ایک حد مقرر ہے، جس کی پابندی لازمی ہے۔ اس سے انحراف کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ اگر کوئی اس حد کی پامالی کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے اپنے اعمال پر نظرثانی کرنا لازمی ہے۔ افسانہ نگار نے اسلامی تصور جسم و روح، فنا و بقا اور نظام الٰہی سے استفادہ کرتے ہوئے اس افسانے کی تشکیل کی ہے۔ اس میں اس نکتے کو نمایاں کیا گیا ہے کہ انسان کو وقتی اختیار اور قدرت حاصل ہے مگر یہ اختیار اور قدرت بھی کسی بڑے اختیار اور قدرت کے زیردست ہے۔

'دانتوں میں گھری زبان' ہندوستان میں آباد اقلیتی اور اکثریتی فرقے کی نفسیات پر مبنی ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ تقسیم ہند اور پھر نقل مکانی کے نتیجے میں بہت سے خاندان بکھر گئے۔ یہ افسانہ ٹوٹے ہوئے ایک خاندان کی روداد پیش کرتا ہے۔

مجموعہ میں شامل آخری افسانہ 'منھ زور گھوڑیاں' فسادات پر مبنی ایک دردناک کہانی ہے جس کا انتساب معروف شاعر زکی انور کے نام ہے۔ کہانی مختلف نسل کی گھوڑیوں اور ایک شہسوار کی ہے لیکن اسے پڑھتے ہوئے زکی انور کی شخصیت اور ان کی شہادت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات میں زکی انور نے جو رویہ اختیار کیا تھا اسے ایک جری اور باہمت شخص بھی انجام دینے سے کتراتا ہے۔

'کانفرنس' کا شمار علی امام نقوی کے نمائندہ افسانوں میں ہوتا ہے۔ عالمی انسانی تاریخ میں کانفرنس کی کئی شکلیں ملتی ہیں۔ مختلف سیاسی، معاشرتی، مذہبی، اقتصادی، معاشی، تہذیبی اور ادبی موضوعات پر کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ علی امام نقوی نے اس افسانے میں جانوروں کی کانفرنس منعقد کی ہے۔ ہماری ادبی تاریخ میں ایسی کانفرنس کی روایت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ پنچ تنتر اور کلیلہ ودمنہ کی حکایتوں میں بھی ایسی کانفرنس کا تذکرہ ملتا ہے۔ ادبی تنقید میں ایسے قصوں کو تمثیلی داستان کا نام دیا جاتا ہے۔ علی امام نقوی نے اس روایت سے استفادہ تو کیا ہے لیکن یہاں تمام جانور اپنی اصل شکل میں موجود ہیں۔ تنقیدی زبان میں اسے تمثیلی اور تجریدی عمل قرار دیا جاسکتا ہے مگر جانوروں کو ان کی اصل شکل میں نہ دیکھنے سے افسانہ کی اثر انگیزی متاثر ہوسکتی ہے۔ پھر اس افسانے کا طنزیہ لب ولہجہ بھی غیر متاثر ہوجائے گا۔ اس لیے جانور کو اس کی اصل خوبیوں کے ساتھ دیکھنا، افسانے کی معنوی دنیا کو وسیع کرتا ہے۔ جانور جب انسانوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں تو اس کا اثر کانفرنس میں موجود جانوروں پر کیا ہوتا ہے؟ ایک اقتباس دیکھیے:

''یہ کیسی انسانوں کی سی باتیں کرنے لگے؟''
جیگورنے آنکھیں پھیلا کر مداخلت کی۔
''کیوں حرج ہی کیا ہے؟''

''ان کی بات نہ کرو دوستو، ورنہ نت نئی آفتوں سے دوچار ہونا پڑے گا کہ جب جب بھی وقت کی باگ ان کے ہاتھوں نے سنبھالی تب تب تباہیاں نازل ہوئی ہیں۔ ہماری دُہائیاں، فریادیں کچھ بھی تو ان پر اثر نہیں کرتیں۔ کرگس پر بیٹھ کر آتشیں بیٹ سے یہ آبادیاں ویران کرتے ہیں.....ہماری اپنی تو کیا حیثیت، ان کے اپنے ان کے رحم وکرم پر جیتے ہیں! اور ہماری اموات .....اس پر ان کا تبصرہ صرف اتنا ہوا کرتا ہے کہ ہر مفضول افضل کا ہدیہ ہوا کرتا ہے۔''2

جانوروں کی کانفرنس میں ایک جانور کی زبان سے

انسان کے بہیمانہ رویے پر جو تبصرہ کیا گیا ہے اس کی صداقت سے انکار ممکن نہیں۔انسان جب جب بے لگام ہوا ہے ظلم وجبر اور خاک وخوں کا طوفان بے تمیزی اٹھ کھڑا ہوا ہے۔اس نے اپنی ذاتی منفعت اور خودغرضی کے لیے پوری کائنات کا نقصان کیا ہے۔زمین پر بسنے والے جانوروں اور انسانوں کی فریادیں بے اثر ثابت ہوئی ہیں ۔ ایسے میں جنگل اور انسانی آبادیوں کے قوانین یکساں ہوجاتے ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''کس انسان کی بات ہورہی ہے؟ وہ جس کی سرشت میں بددیانتی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، مکر اور دغا جس کا اوڑھنا اور بچھونا ہے''۔

''نہیں، میں اس کا ذکر کررہی ہوں جس نے امن کا نعرہ دیا ہے، جس نے عالمی سطح پر ہمدردی کی تحریکیں چلائی ہیں''۔

''اس میں اس کا اپنا مفاد تھا۔اس نے اپنے فوق البشر ہونے کا اعلان لاشوں پر کھڑے ہوکر کیا ہے۔''3

علی امام نقوی نے جانوروں کے کردار سے انسانی معاشرے پر جو شب خون مارا ہے وہ بڑا ہی کاری اور دیرپا ہے۔کسی ٹھوس نتیجے پر پہنچے بغیر خون خرابہ کے ساتھ کانفرنس کا اختتام ہوجاتا ہے۔انسانی تاریخ کے اوراق سے ایسی کئی کانفرنسیں بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں جو خون خرابے پر ختم ہوئیں۔اس کے باوجود پُرامن کانفرنس یا امن وامان کی بحالی اور علم وادب کے فروغ کے عمل میں کانفرنس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دیکھنے، سننے اور اخذ وجذب کرنے کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔اس ضمن میں افسانے کا یہ جملہ بڑا معنی خیز معلوم ہوتا ہے:''آنکھ دیکھنے سے، کان سننے سے اور زمین بارش سے نہ کبھی سیر ہوئی نہ ہوگی۔''

'نئے مکان کی دیمک' میں شامل تمام افسانوں پر گفتگو ایک مختصر تحریر میں ممکن نہیں لیکن اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اس میں شامل افسانوں کے مطالعے سے علی امام نقوی کے مشاہدے کی گہرائی اور ایک خاص اسلوب کی دریافت کی کوشش کا احساس ہوتا ہے۔

علی امام نقوی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'مباہلہ' 1988 میں شائع ہوا۔اس کی اشاعت سے علی امام نقوی کی شناخت بطور افسانہ نگار مستحکم اور معتبر ہوئی۔اس مجموعے میں 22 افسانے ہیں۔ان میں سے بیشتر افسانے اس عہد کے مختلف رسالوں کی زینت بن چکے تھے۔ خاص طور سے 'ڈونگر واڑی کے گدھ' نے ادبی حلقے کو متوجہ اور متاثر کیا۔یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو افسانے کی تاریخ میں علی امام نقوی اپنے صرف اس افسانے سے ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔

'ڈونگر واڑی کے گدھ' اپنی نوعیت کا منفرد افسانہ ہے۔'ڈونگر واڑی کے گدھ' کا اسلوب اسطور اور دیومالا سے قریب ہے۔ آخر کے چند جملے حذف کردیے جائیں اور مکالمے کی زبان کو راست بیانیہ میں منتقل کر دیا جائے تو اسے اساطیری کہانیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔افسانہ نگار کا مقصد اسطور کی بازیافت اور دیومالا کی تخلیق نو نہیں ہے بلکہ اس کے سایے میں معاشرے کا بدنما اور خوفناک چہرہ دکھانا ہے۔گدھ وہیں آتے ہیں جہاں انھیں مردہ گوشت ملتا ہے۔ گدھوں کو دیکھ کر اندازہ ہوجاتا ہے کہ آس پاس کہیں کوئی مردار موجود ہے۔یہ افسانہ اتنا بلیغ اور جامع ہے کہ اس کی ہر سطر کچھ کہتی نظر آتی ہے۔افسانے کا بیشتر حصہ مکالمے پر مشتمل ہے۔فنی سطح پر ایسے افسانوں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا لیکن اس موضوع کا تقاضہ یہی تھا کہ اسے مکالمے کی صورت میں پیش کیا جائے۔

افسانہ 'سراب' ایک مختلف قسم کا افسانہ ہے۔ موضوع کی سطح پر اسے جنسی افسانہ کہا جاسکتا ہے۔علی امام نقوی نے اسے ابہام کے پردے میں کمال خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔جنس اور اس کی لفظیات سے ناآشنا قاری اس سے محظوظ نہ ہوسکے گا بلکہ اس کی بہتر تفہیم بھی نہ کرسکے گا۔دو عورتیں ایک خاص قسم کے درد سے بے چین ہوتی ہیں، حکیموں اور ڈاکٹروں کی دواؤں کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ایک درویش صفت شخص انھیں یہ بتاتا ہے:

''تمھارا درد اس صورت میں زائل ہوگا جب تم کسی ٹنڈ منڈ خرمے کے درخت کے قریب پہنچو اور اپنے جسم کے زیریں حصہ کو اس بے برگ وبار درخت سے مس کردو۔تمھارے جسم کے تمسک سے وہ بے برگ وثمر درخت مزین ہوگا، اس پر خرمے آجائیں گے اور تم درد سے نجات پاجاؤ گی۔''4

'سراب' کی فضا دھندلی ہے اور افسانہ نگار نے تخلیقی سطح پر اس دھند سے بہت کام لیا ہے۔قاری آخر تک یہی سوچتا رہتا ہے کہ آخر یہ خرمے کا درخت کہاں ہے اور شیخ سے ملاقات کے بعد جب خود سپردگی کی گھڑی آتی ہے تو قاری کچھ کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

'مباہلہ' میں شامل کہانیوں کی زبان ان کی دیگر کہانیوں سے بہت الگ تو نہیں ہے مگر اس میں شامل بیشتر افسانوں میں زبان ایک مخصوص لہجے میں ڈھلتی نظر آتی ہے اور مکالمے نسبتاً چست اور رواں ہوگئے ہیں۔ کرداروں کے مطابق وہ خالص بمبیا اردو لکھنے میں یقین رکھتے ہیں مگر بیانیہ میں ان کا اسلوب تخلیقی نثر میں ڈھل جاتا ہے۔مباہلہ میں شامل افسانے علی امام نقوی کی ادبی شناخت میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

'گھٹتے بڑھتے سائے' علی امام نقوی کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے جسے تخلیق کار پبلشرز، دہلی نے 1993 میں شائع کیا تھا، اس میں پندرہ افسانے شامل ہیں۔علی امام نقوی نے اس مجموعے کا انتساب اپنے بھائی قدرت اللہ نقوی اور اپنے بچوں کے نام کیا ہے اور نیچے مصحفی کا بہت ہی خوبصورت شعر درج ہے:

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا یہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

غلام ہمدانی مصحفی کا یہ شعر علی امام نقوی کے تقریباً تمام افسانوں پر صادق آتا ہے۔علی امام نقوی ان فنکاروں میں سے ہیں، جو اپنے مستقبل سے مایوس نظر نہیں آتے۔ان کے افسانوں میں غصہ، بے چینی اور کبھی کبھی بے یقینی نظر آتی ہے مگر یہ جذبات مجموعی تاثر میں منقلب نہیں ہوتے۔علی امام نقوی کا افسانہ 'ایک لمبی سڑک' غصہ اور بے چینی کی تصویر کشی پر مشتمل ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش انسانی سرشت کا حصہ ہے۔ اسی تلاش وجستجو میں وہ فریب کا شکار بھی ہوتا ہے۔اس کہانی میں ممبئی کے نام نہاد مہذب اور پاکیزہ معاشرہ کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔دو متضاد معاشرے اور محل وقوع کی پیش کش سے علی امام نقوی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جگہ یا مقام اہم نہیں ہوتا بلکہ اس سے وابستہ لوگ اور ان کا سلوک اہم ہوتا ہے۔ انسانیت اور شرافت میخانوں میں بھی بحال رہتی ہے جب کہ عبادت گاہوں اور تعلیم گاہوں میں جرائم کا ارتکاب ممکن ہے۔

علی امام نقوی کے افسانے پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے فرد کو صالح معاشرہ کا احترام کرنا سکھاتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ بحیثیت انسان وہ جس ماحول میں سانس لے رہا ہے اسے اپنے بُرے اعمال واقدام سے آلودہ نہ کرے۔

'شائبہ' اور 'جھب' نفسیاتی پیچیدگی اور ذہنی مرض پر مشتمل عمدہ افسانے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں

افسانوں کے کردار بھی یکساں ہیں۔ دونوں میں ذکو اور شبنم موجود ہیں۔ گھرانہ ایک جیسا ہے۔ علی امام نقوی کی زندگی اور سوانح سے آشنا قاری یہ سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں کہانیوں کا تعلق ان کی بستی سے ہے۔ کیونکہ جس گاؤں کا ذکر ہے اس کا نام عبداللہ پور ہے اور اتفاق سے ان کا آبائی وطن بھی عبداللہ پور، ضلع میرٹھ ہے۔

'موسم عذابوں کا' پندرہ افسانوں پر مشتمل علی امام نقوی کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے جسے تخلیق کار پبلشرز، دہلی نے 1998 میں شائع کیا تھا۔ پیش لفظ کے عنوان سے اس مجموعے میں شامل تحریر پر افسانے کا گمان ہوتا ہے۔ پیش لفظ کے آخری پیراگراف کی پہلی سطر سے معلوم ہوتا ہے کہ علی امام نقوی کے یہاں شناخت اب بھی ایک اہم مسئلے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے حصول کے لیے مزید لکھنا چاہتے ہیں۔ عمر کی اس منزل میں بھی ان کے تخلیقی سوتے خشک نہیں ہوئے۔

علی امام نقوی کے افسانے ممبئی کی بے حد مصروف زندگی کی ایسی تصویریں ہیں جن کا مشاہدہ ہم آئے دن کرتے ہیں مگر کبھی ان پر غور وفکر کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ افسانہ 'ریپ' کا مواد روزنامہ اخباروں میں شائع ہونے والی سرخیوں سے ماخوذ ہے۔ ریپ کی خبروں پر غصہ آنا فطری ہے لیکن اپنے غصے کا رخ زیادتی کی شکار ان عورتوں اور لڑکیوں کی طرف کرتے ہوئے اور انہی کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آخر دیر رات خواتین کو گھر سے نکلنے کی ضرورت کیا ہے؟ وہ گھر میں کیوں نہیں رہتیں؟ اس 'کیا' اور 'کیوں' کا جواب نہیں ہوتا۔ خود کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی مضحکہ خیز جواز تلاش کرلیا جاتا ہے۔ علی امام نقوی نے افسانے میں جس سچویشن کو پیش کیا ہے اس سے لرزہ طاری ہوجاتا ہے کہ شیطان کس طرح مسیحاؤں کو بھی اپنا شکار بنالیتا ہے۔

افسانہ 'دیوث' کا موضوع بھی عام زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ علی امام نقوی کی زبان 'بمبیا اردو' میں بہت گل وبوٹے کھلاتی ہے۔ 'دیوث' اس کی بہترین مثال ہے۔

علی امام نقوی کے اکثر افسانوں میں انسانی قدروں اور تہذیبی اشتراک کے تئیں جو والہانہ جذبہ ملتا ہے اسے فنکار کی انسان دوستی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ممبئی ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہندوستان کی ملی جلی تہذیب سڑکوں اور کارخانوں میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہر طرح کے کردار پیش کیے ہیں۔ 'دیوث' میں خالص بمبیّا بولنے والا بابو ہے تو 'لقا کبوتر' میں پوربیا بولنے والی منڈلی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ علی امام نقوی ہر قسم کی زبان لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں:

''ہم لوگن کو تُہری فکر تھی، ای واسطے تُہار جیسے منئی کو ہم سب بھرت ہیں۔ ناہی تو خود ہی سوچ سرو! تو سے حجام گیری ناہووت ہے۔ ای بمبئی ماسارے! اچھے اچھے چیں بول جات ہیں اور تو، کم بختی مارے! دادا بنے کا سوچت ہے۔''5

یہ خالص پوربیا لہجہ ہے۔ بمبیّا زبان کا ایک نمونہ دیکھیے:

''یہ جو اپن تیرے تھوبڑے پہ تھوکا ہے نا۔ یہ سمجھائے گا تیرے کو۔ ابے جھوپڑی کے! ابھی تھوڑا ٹائم آگے اپن تیرے کو بولا ہوتا کہ پون پل پر اپن بھڑوا گیری کرتا ہے۔ بولا تھا کہ نہیں؟ اکھّی دنیا، سالی میرے کو بھاڑو بولتی ہے۔ ڈھیّوث بولتی۔''6

علی امام نقوی کے افسانوں میں بیانیہ اور کرداروں کے مکالمے سے یکساں طور پر کام لیا گیا ہے۔ وہ حسب ضرورت کرداروں سے مکالمے ادا کراتے ہیں۔ یہ کردار اپنی مخصوص زبان اپنے ساتھ لاتے ہیں اور اپنے سلوک، رویے اور سرگرمیوں سے افسانے کو اہم اور یادگار بناتے ہیں۔ 'لقا کبوتر' میں سجاد خان بہت اہم اور دیر تک یاد رہنے والا کردار ہے۔ علی امام نقوی کبھی کبھی سچویشن ہی کو کردار کی شکل میں پیش کردیتے ہیں جس سے کہانی میں دلچسپ ابہام پیدا ہوجاتا ہے اور کہانی کشمکش کے بعد بالکل آخر میں قاری پر کھلتی ہے۔ اس قسم کے افسانوں میں 'مسیحائی' اور 'ریپ' شامل ہیں۔

علی امام نقوی نے اپنی تخلیقات کے ذریعے جدید اردو فکشن کی سمت و رفتار متعین کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے اردو فکشن کو نئے موضوعات اور جدید تکنیک سے روشناس کرایا۔ ان کی کہانیاں جدید اردو فکشن میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ جدید اردو فکشن پر جب بھی گفتگو یا بحث کی جائے گی تو علی امام نقوی کا ذکر ناگزیر ہوگا۔

علی امام نقوی کے افسانوں کا آخری مجموعہ 'کہی ان کہی' 2012 میں شائع ہوا جس میں 14 افسانے ہیں۔ ان افسانوں کا کینوس نہایت وسیع ہے۔ ان افسانوں میں ایک وسیع سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کی تصویر موجود ہے۔

علی امام نقوی کے افسانوں کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ وہ ماضی یا مستقبل سے زیادہ حال میں زندہ اور درپیش مسائل کو حل کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ وہ ماضی کی بھول بھلیوں اور مستقبل کی خوش کن تصویریں ابھارنے کے بجائے انسانی دکھ اور معاشرتی پریشانیوں کو اپنے فکر وخیال کا حصہ بناتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے افسانوی اسلوب اور تجربے سے متاثر بھی ہوئے اور ابتدائی دور میں مبہم، علامتی افسانے بھی تخلیق کیے لیکن وقت کے ساتھ ان کے فن میں تبدیلی آتی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ہر سطح پر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے اہم افسانوں میں نہ تو ابہام ہے اور نہ ہی روایتی انداز بیان۔ اس لیے ان کا قاری الجھن کا شکار نہیں ہوتا۔ علی امام نقوی کی افسانہ نگاری اردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھاتی ہے اور عصری حقائق وحسیت سے اپنے عہد کے قاری کو روشناس بھی کراتی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ علی امام نقوی نے اپنی تخلیقات کے ذریعے جدید اردو فکشن کی سمت و رفتار متعین کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے اردو فکشن کو نئے موضوعات اور جدید تکنیک سے روشناس کرایا۔ ان کی کہانیاں جدید اردو فکشن میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ جدید اردو فکشن پر جب بھی گفتگو یا بحث کی جائے گی تو علی امام نقوی کا ذکر ناگزیر ہوگا۔

حواشی

1. علی امام نقوی، نئے مکان کی دیمک، ممبئی، شمیم پبلی کیشنز، 1980، ص33
2. ایضاً، ص65
3. ایضاً، ص66-67
4. ایضاً، ص54
5. ایضاً، ص55
6. ایضاً، ص144

Dr. Abdus Sami
Assistant Professor
Department of Urdu, BHU
Varanasi-221005
Mob:9891553520
Email: abdussami0543@gmail.com





شاہ عالم

اختر الایمان کے ادبی تصورات

بیسویں صدی میں اردو نظم میں موضوع اور ہیئت واسلوب کی سطح پر غیر معمولی تبدیلی واقع ہوئی۔ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے زندگی کے مسائل کو دیکھا اور انھیں اپنی تخلیقات میں پیش کیا۔ ترقی پسند شعرا نے خارجی اور اجتماعی زندگی کے مسائل کو بہت اہمیت دی اور حلقے کے شعرا نے داخلی مسائل اور انفرادی زندگی کے مسائل کو اپنی فکر کا مرکز بنایا۔ ان شعرا نے زندگی اور اس سے وابستہ مسائل کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں مکتبِ فکر کے ادیبوں کے یہاں مجموعی زندگی کے مسائل کی ترجمانی نہیں ہو سکی اور ان شعرا کی شاعری زندگی کی وسعت اور ہمہ گیری کا احاطہ کرنے سے قاصر رہی۔ لیکن ان شعرا کی کوششوں سے نظم میں مختلف النوع موضوعات در آئے اور ہیئت واسلوب اور زبان و بیان کی سطح پر بھی زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔

اختر الایمان اس اعتبار سے بھی منفرد ہیں کہ انھوں نے کسی نظریے کی پابندی کو قبول کیے بغیر حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی اور آشوب زیست کو آزادانہ طور پر پیش کیا۔ اسی لیے ان کی شاعری کو کسی مخصوص نظریے کی ترجمان شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کے لیے الجھن کا سبب بنی رہی۔ ان کے یہاں موضوع سیاسی ہو یا سماجی، اقتصادی ہو یا تہذیبی، خارجی ہو یا داخلی، انفرادی ہو یا اجتماعی ہر ایک کی کارفرمائی ہے۔ بلا شبہ اختر الایمان کے یہاں اس عہد کے اہم رجحانات کی بازگشت بھی موجود ہے۔ ان کی شاعری مروجہ رجحانات کے کسی زمرے میں پوری طرح نہیں آتی۔ اس لیے کہ اختر الایمان نے اپنی شاعری کو پابند رسوم نہیں بننے دیا۔ ان کی شاعری میں زندگی کا وسیع تر منظر نامہ سامنے آتا ہے۔ اختر الایمان نے خود اپنی شاعری کے بعض پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ دو اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اس (شاعری) کے اجزا میں زندگی کی جمالیاتی قدریں بھی شامل ہیں سماجی، معاشی، سیاسی، اور اخلاقی قدروں کی اتھل پتھل بھی۔ دن پر دن پیش آنے والے حالات کا محاکمہ اور محاسبہ بھی خوشگوار تصورات کی ترویج اور تنقید بھی۔ مختصر یہ کہ جتنی بڑی اور لامتناہی زندگی ہے اتنی ہی بڑی چیز شاعری ہے۔ خصوصاً آج کی شاعری جس کا پس منظر اب قومی نہیں بین الاقوامی ہو گیا ہے کوئی واقعہ حادثہ، یا سانحہ کہیں بھی ہو، زمین کے کسی بھی گوشے میں وہ ہمارا واقعہ، حادثہ یا سانحہ ہے۔''[1]

''یہ شاعری مشین میں نہیں ڈھلی ایک ایسے انسانی ذہن کی تخلیق ہے جو دن رات بدلتی ہوئی سیاسی معاشی اور اخلاقی قدروں سے دوچار ہے۔ جو اس معاشرہ اور سماج میں زندہ ہے جسے آئیڈیل نہیں کہا جا سکتا، جہاں عملی زندگی اور اخلاقی قدروں میں ٹکراؤ ہے تضاد ہے۔''[2]

اختر الایمان بلند پایہ شاعر تو تھے ہی شعر وادب کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ادبی منظر نامے پر جو کچھ رونما ہو رہا تھا اس پر ان کی گہری نظر تھی۔ اختر الایمان اردو کی ادبی روایت سے پوری طرح باخبر بھی تھے۔ ان کے مجموعوں کے پیش لفظ، مذاکرات، انٹرویوز اور دیگر بیانات سے ان کی ادبی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اختر الایمان نے ''آب جو'' سے ''زمین زمین'' تک اپنے سبھی مجموعوں کے پیش لفظ تحریر کیے جس میں انھوں نے اپنی شاعری کے بارے میں اس عہد کی ادبی صورت حال کے بارے میں بڑی معنی خیز اور توجہ طلب باتیں کہی ہیں۔ مثلاً شاعری کیا ہے؟ شاعری کو کیسا ہونا چاہیے؟ آج کی شاعری کس نوع کی شاعری ہے؟ شاعری سے زندگی کا کیا رشتہ ہے؟ آج کے سماج میں شاعری کا کیا رول ہونا چاہیے؟ ان کی شاعری کا پس منظر کیا ہے؟ ان کی شاعری کن کن مسائل سے سروکار رکھتی ہے؟ شاعر کو اپنے معاشرے میں کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟ وغیرہ۔

اختر الایمان نے اپنے پیش لفظ میں ان وضاحتوں سے اپنی شاعری کا جواز پیش کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری کا اپنے عہد کے مسائل اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اپنی شاعری کی توجیہات کے ساتھ اس عہد کے ادبی رجحانات اور تحریک پر بڑی بے باکی سے اظہار خیال کیا

ہے۔ انھوں نے شاعری کی صالح قدروں کو سراہا بھی ہے اور خامیوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ ترقی پسند اور جدید شاعری نیز پورے عہد کی ادبی صورت حال کے بارے میں انھوں نے جو نشاندہی کی ہے اس سے ان کی بصیرت اور ادبی نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن اس پہلو پر نظر ڈالنے سے پہلے اختر الایمان کے ادبی تصورات پر نظر ڈالتے ہیں۔ یہ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''اگر کوئی پوچھے شاعری ہے کیا تو اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں۔ سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کہہ سکتے ہیں یہ ایک ایسا مرکب ہے جو ذہن کے دارالعمل میں تیار ہوتا ہے اور اس کے اجزا میں زندگی کی جمالیاتی قدریں بھی شامل ہیں۔ سماجی ،معاشی، سیاسی اور اخلاقی قدروں کی اتھل پتھل بھی۔ دن پر دن پیش آنے والے حالات کا محاکمہ اور محاسبہ بھی اور خوشگوار اور ناخوشگوار تصورات کی ترویج اور تنقید بھی۔ مختصر یہ کہ جتنی بڑی اور لامتناہی زندگی ہے اتنی ہی بڑی چیز شاعری ہے۔''[3]

شاعری سے متعلق ایک اور اہم بات یہ کہوں گا جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ اس وقت نہیں لکھا جب ان تجربات اور محسوسات کی منزل سے گذر رہا تھا جو میری نظموں کا موضوع ہیں۔ انھیں اس وقت قلمبند کیا ہے۔ جب وہ تجربات اور محسوسات یادیں بن گئے تھے۔ جب ہر نشتر کے لگائے ہوئے زخم مندمل ہو گئے تھے۔ ہر طوفان گذر کر سطح ہموار ہو گئی تھی۔ اور ہر رفتہ اور گذشتہ تجربے کی صدائے بازگشت مجھے یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے ان سے وابستہ بھی ہوں اور نہیں بھی۔ یہی وجہ ہے میری شاعری میں ایک یاد کا سا رنگ ہے اور یہ شاعری بیک وقت داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔[4]

''شاعری میرے نزدیک ''ذات'' کے اس اظہار کا نام ہے جو تلمیحات، استعارات، علامتوں اور لفظی تصویروں یا امیجری کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے''[5]

''یہ پوری شاعری واحد متکلم کی شاعری ہے۔''[6]

''میری شاعری کا بیشتر حصہ علامتی شاعری پر مشتمل ہے''[7]

ان وضاحتوں سے یہ عندیہ بھی ملتا ہے کہ اختر الایمان اپنی شاعری کو مروجہ شاعری سے الگ محسوس کرتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید ان وضاحتوں کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ اختر الایمان کے عہد کے ادبی منظر نامے پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کسی ایسے شاعر کے لیے جو کسی تحریک سے وابستہ نہ ہو اس کا اس عہد کے ادبی منظر نامے پر اپنے وجود کو قائم رکھنا کس قدر مشکل اور صبر آزما ہے۔

اختر الایمان کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ نظم کی سنجیدہ تفہیم اور قرأت کا حلقہ غزل کے مقابلے میں بہت محدود ہے۔ جس طرح ادبی جلسوں اور مشاعروں میں غزل کی پزیرائی ہوتی ہے نظم کے لیے ابھی تک ایسی فضا ہموار نہ ہو سکی۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ نظم سننے کی نہیں پڑھنے کی چیز ہے۔ غزل کے دو مصرعوں کے مقابلے میں نظم کئی مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے ظاہر ہے نظم کو سن کر اس کی فوراً تفہیم مشکل امر ہے۔ یہی سبب ہے کہ مشاعروں کا مزاج نظم کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ اختر الایمان کو دکھ یہ تھا کہ ہماری ادبی فضا پر ابھی بھی غزل کا رنگ غالب ہے۔ اور عام طور سے نظم کی تفہیم میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو غزل کے لیے مستعمل ہے۔ انھوں نے اپنے قاری سے غزل کی فضا سے نکل کر اپنی نظموں کی قرات کا مطالبہ کیا۔ اختر الایمان کی بے اطمینانی اور شکایت صرف اپنے عہد کی شاعری کو لے کر نہیں تھی بلکہ پوری شاعری اور ادبی صورت حال سے تھی۔ انھوں نے کہا:

> اختر الایمان نے اپنے پیش لفظ میں ان وضاحتوں سے اپنی شاعری کا جواز پیش کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری کا اپنے عہد کے مسائل اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اپنی شاعری کی توجیہات کے ساتھ اس عہد کے ادبی رجحانات اور تحریک پر بڑی بے باکی سے اظہار خیال کیا ہے۔

''ہماری شاعری کے مزاج میں ابھی تک سنجیدگی نہیں آئی اور اس کا اظہار ابھی رومانی ہے۔ ہمارے بڑے بڑے شاعروں کی کوشش یہ ہے جو غم ہوا سے غم جاناں بنا دے۔ بات چاہے جہاں سے نکلے اسی کی جوانی تک پہنچ جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پوری شاعری ابھی دل لگی بازی کی نذا ہو رہی ہے۔ یار لوگ بیٹھے ہیں معشوق کے قصے سنتے ہیں اور گھر چلے جاتے ہیں۔ نہ کوئی سنجیدہ بات سننے آتے ہیں نہ کچھ گرہ میں لے جاتے ہیں۔ یہ بات ان کے ذہن ہی میں نہیں آتی ہماری شاعری کا ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں سے کوئی دور کا واسطہ بھی ہے جو کچھ بھی ہے ابھی تک حسن و عشق کا نعرہ ہے''[8]

اس اقتباس سے اختر الایمان کی بے اطمینانی صاف ظاہر ہے۔ اختر الایمان کے ان خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن انھوں نے جن پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آج بھی غزل گو شعرا کے یہاں زندگی کے گوناگوں تجربات اور اپنے عہد کے مسائل کے ادراک کے باوجود حسن و عشق کا پہلو ان سب پر غالب ہے۔ چونکہ شہرت کا بہترین ذریعہ غزل تھی اس لیے انھوں نے اس طرف زیادہ توجہ دی۔ غزل اردو شاعری کی نمائندہ بن گئی۔

اختر الایمان کے نزدیک شاعری کو مکمل زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے۔ اس لیے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر پیدا ہونے والے مسائل اور تجربات کے اظہار کے لیے نظم کو وسیلۂ اظہار بنایا جائے۔ شاعری میں محض حسن و عشق کا اظہار نہیں ہے، بلکہ شاعری میں تمام تلخ و شیریں تجربات کا اظہار ہونا چاہیے۔ اختر الایمان کے نزدیک غزل جو آج بھی ہماری سب سے مقبول صنف سخن ہے لیکن اپنے خاص مزاج کے سبب وہ آج بھی روایتی حسن و عشق کے موضوعات سے باہر نہ نکل سکی۔ زندگی کی مختلف سطحوں پر جو تغیرات اور تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اس کے لیے دو مصرعے ہی کافی نہیں ہیں۔ اس کے مقابلے میں نظم ایسی صنف ہے جس میں زندگی کے مختلف تجربات و مشاہدات کو آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ 'زمین زمین' کے پیش

لفظ میں لکھتے ہیں:

''نظم ایسی صنف ہے جس کا احاطہ کرنا مشکل ہے زندگی سے متعلق کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر نظم نہیں کہی جاسکتی، اخلاقی، سیاسی، معاشی، سماجی، نفسیاتی، روحانی کوئی بھی موضوع ہو نظم کا کینوس اتنا بڑا ہے کہ اس پر جو رنگ فنکار ڈھنگ سے استعمال کرے گا اچھا لگے گا''9

بلاشبہ نظم کی ہیئت میں بہت وسعت ہے کہ حیات وکائنات کے مختلف مسائل اور تجربات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن غزل کے حوالے سے اختر الایمان کے تمام اعتراض کو تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ غزل کے مخصوص مزاج اور عشقیہ جذبات کے غالب ہونے تک تو بات کسی حد تک ٹھیک ہے لیکن صنف غزل پر ان کے دوسرے اعتراضات کو تسلیم کرنے میں تامل ہے۔

اختر الایمان نے نظم کی بھرپور حمایت کی اور اسے ہی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اختر الایمان نے اس بات کی تردید کی ہے کہ وہ غزل کے مخالف ہیں۔ دراصل اختر الایمان شاعری کا جتنا وسیع تصور رکھتے تھے اس لحاظ سے غزل کا دائرہ بہت محدود ہے۔ دوسرے اختر الایمان کا یہ ماننا تھا کی شاعری کرتے وقت اس پہلو پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ اس سے زبان و بیان کا دائرہ وسیع ہو۔ اختر الایمان کا اس بات پر اصرار تھا کہ بدلتی ہوئی زندگی اور اس کے مسائل کے اظہار کے لیے زبان وبیان کی وسعت ضروری ہے۔ بقول اختر الایمان:

''اگر آپ واقعی چاہتے ہیں کہ شاعری میں پھیلاؤ آئے اس میں نئے تجربات ہوں تو آپ کو نظم کی طرف توجہ دینی ہی پڑے گی''10

اختر الایمان شاعری میں تجربات کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موضوع کی مناسبت سے زبان و بیان کا پیرایہ تلاش کرنا چاہیے اور شاعری کے لیے ضروری ہے کہ ہیئت واسلوب اور زبان و بیان کی نئی راہیں تلاش کی جائیں لیکن یہ تمام تجربے اسی وقت بارآور ہوسکتے ہیں جب موضوع اس کا تقاضا کرے۔ اگر موضوع اور زبان وبیان میں ہم آہنگی نہیں تو یہ تمام تجربے شعبدہ بازی ثابت ہوں گے۔ بنیادی چیز یہ ہے کہ خیالات کے اظہار کے لیے مناسب پیرایہ تلاش کیا جائے جسے دیکھ کر یہ لگے کہ اس موضوع کی پیش کش کے لیے اس سے بہتر اور کوئی طریقۂ اظہار تلاش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ عروض اور ردیف و



قافیے کی پابندیاں ضرورت کے مطابق توڑی جاسکتی ہیں لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ شعری بیان پر قدرت بھی لازم ہے۔ اگر شعری بیان موثر اور طاقتور ہے تو تجربہ پسندی میں کوئی ہرج نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر تجربہ برائے تجربہ نہیں بلکہ اس سے شعری بیان کے ساتھ ساتھ فکر و خیال کے اظہار کے نئے دریچے وا ہوں تو مستحسن ہے۔ چنانچہ اختر الایمان کے یہاں معریٰ اور آزاد نظموں کے ساتھ نثری ساخت کے قریب کی نظمیں بھی موجود ہیں لیکن خیال ہیئت واسلوب سے پیوست ہے۔ زبان وبیان کے مختلف رنگ وآہنگ اسی سوچ کا نتیجہ ہیں۔

اختر الایمان نے شاعری کو مذہب سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے زندگی کے ساتھ ایسا کوئی سمجھوتا نہیں کیا جو ان کی شاعری کو مجروح کرتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اختر الایمان کسی تحریک یا رجحان کے پابند نہیں رہے۔ انھوں نے کسی نظریے کو بنیاد بنا کر یا خارجی دباؤ کے تحت شاعری نہیں کی۔ اختر الایمان کی شاعری کا ابتدائی دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ بیشتر شعرا اس تحریک سے وابستہ تھے۔ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک سے وابستگی شہرت کی ضمانت تھی۔ مگر اختر الایمان اس سے دور دور ہی رہے۔ بلاشبہ اختر الایمان کے یہاں اس طرح کے موضوعات ہیں جو ترقی پسند شعرا کو بہت محبوب رہے ہیں مگر اختر الایمان کی طرز فکر اور طرز اظہار ان سے مختلف رہا ہے۔ اختر الایمان اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظریے کے طور پر اشتراکیت کے قائل تھے لیکن اختر الایمان نے شعر وادب میں کسی نظریے کے جبر کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ انھوں نے کہا:

''ترقی پسند تحریک میں کوئی خرابی نہیں ہے اس کے چلانے والوں میں دیانت داری کی کمی تھی ان کی وجہ سے یہ تحریک نہ چل سکی 11

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ اختر الایمان اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظریے کے طور پر اشتراکیت کے قائل تھے لیکن شعر وادب کو کسی نظریے کے تابع کرنے کے خلاف تھے۔ دراصل ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جس قسم کی بلند بانگ اور کھوکھلے قسم کی شاعری کی جارہی تھی اختر الایمان کو اس سے اختلاف تھا۔ اختر الایمان کا کہنا تھا کہ ترقی پسند شعرا نے مارکس کے جمالیاتی تصور کو نظر انداز کر کے صرف کسانوں اور مزدوروں کی ہی زندگی کی پیش کش کو اپنی فکر کا مرکز بنالیا اور زندگی کے دوسرے مسائل کو نظر انداز کر دیا اور ان کی شاعری مارکس کے جمالیاتی فلسفے سے محروم ہوگئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری یک رخی ہو کر رہ گئی۔ اس تحریک کی نمائندگی کرنے والے شعرا کی شاعری چند موضوعات تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ترقی پسند شعرا کی شاعری پر اختر الایمان کا اعتراض یہ بھی تھا کہ یہ شعرا سوویت یونین کے مسائل اور وہاں کی سیاسی سماجی صورت حال کو بنیاد بنا کر شاعری کر رہے ہیں ان کی شاعری اپنے ملک کے حالات اور گرد وپیش کی زندگی سے صحیح ربط نہیں رکھتی۔ ترقی پسند

اختر الایمان شاعری میں تجربات کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موضوع کی مناسبت سے زبان و بیان کا پیرایہ تلاش کرنا چاہیے اور شاعری کے لیے ضروری ہے کہ ہیئت واسلوب اور زبان وبیان کی نئی راہیں تلاش کی جائیں لیکن یہ تمام تجربے اسی وقت بارآور ہوسکتے ہیں جب موضوع اس کا تقاضا کرے۔

شعرا نے ہنگامی موضوعات کو اولیت دی اور اسی کو اپنی شاعری میں نظم کیا۔

عام طور سے ترقی پسند شعرا کی شاعری داخلی تجربے کا حصہ نہ بن سکی۔ اختر الایمان بلند بانگ اور کھوکھلے قسم کی شاعری کے ہمیشہ خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ شاعری میں شاعر کا اپنا تجربہ ہونا چاہیے۔ اختر الایمان نے ہنگامی موضوعات پر بھی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ لیکن ان مسائل کو فوراً قلم بند نہیں کر دیا، بلکہ واقعات کے گزر جانے کے بعد جب وہ واقعہ ان کا تخلیقی تجربہ بن گیا ہے تب نظم تخلیق کی ہے۔

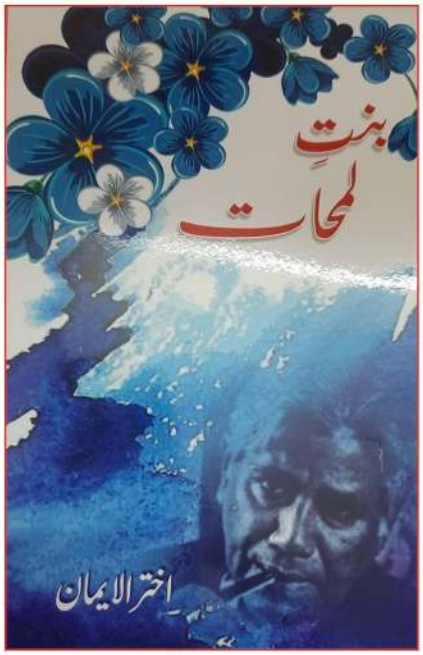
اختر الایمان کا اصرار اس بات پر تھا کہ اگر فن پارے کی تخلیق میں اپنی ذات اور خلوص شامل نہ ہو تو اچھی اور سچی شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔ ردیف اور قافیہ وزن اور بحر کی پابندی محض سے شاعری نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس میں شاعری کی جمالیاتی قدریں اور شاعرانہ عوامل کی کارفرمائی نہ ہو شاعری شاعری نہیں ہوسکتی۔ ترقی پسندوں کے بارے میں اختر الایمان کا یہ خیال ہے کہ ''اکثر ترقی پسندوں کی شاعری Versification یعنی کلام موزوں سے آگے نہیں جاتی'' تو اس کا سیدھا سا مطلب یہی ہے کہ ان کی شاعری میں ان کی اپنی ذات اور اپنا خلوص شامل نہیں ہے۔ انھوں نے شاعری کی جمالیاتی قدروں کو نظر انداز کر دیا جس سے ان کی شاعری اثر و تاثیر سے محروم ہوگئی۔ اختر الایمان نے شاعری کے لیے ایک اصطلاح وضع کی جسے وہ ''حصار'' کے اندر اور 'حصار'' کے باہر والی شاعری سے موسوم کرتے ہیں۔

''حصار'' کے اندر والی شاعری وہ ہے جو ہم اکثر مشاعروں میں سنتے ہیں۔

''حصار'' کے باہر والی شاعری وہ ہے جس میں نئے تجربات نئے میلانات اور نئے شعور کی ترجمانی اور نمائندگی ہوتی ہے۔ میں اس سلسلے کا آغاز غالب اور حالی سے کرتا ہوں۔ شاعری میں فکر کا عنصر یہیں سے شامل ہاتا ہے۔ اور بعد میں کچھ نئے تجربے آزاد عظمت اللہ خاں اور ڈاکٹر بجنوری نے بھی کیے تھے۔ میں اپنی شاعری کا شمارہ اسی ''حصار'' سے باہر والی شاعری میں کرتا ہوں''12

اختر الایمان نے اپنی شاعری کو ''حصار'' کے باہر والی شاعری کہا ہے۔ حصار کے باہر والی شاعری کیا ہے۔ جدید شعرا فکر و خیال اور زبان و بیان کی آزادی پر زور دینے کے باوجود چند چیزوں کے اسیر ہوگئے۔ جدید شاعروں کے یہاں بھی اظہار اور تجربے کی یکسانیت بہت زیادہ ہے۔ ترقی پسند تحریک کا زور کم ہونے کے بعد جدید یت کا دور شروع ہوا لیکن جدیدیت بھی اصولوں کی شکار ہوگئی۔ انھوں نے بھی بعض موضوعات کو پاؤں کی زنجیر بنا لیا۔ اختر الایمان نے نظریاتی وابستگی سے خود کو الگ رکھا۔ انھوں نے اپنی تخلیقی آزادی سے کوئی سمجھوتا نہیں کیا بلکہ اپنے شعور کی وساطت اور آزاد فکری رویے سے اپنا تخلیقی سفر طے کیا۔ ان تحریکوں کے حوالے سے انھوں نے ایک انٹرویو میں فرمایا:

''جدیدیت اور ترقی پسند تحریک دو مختلف سیاسی و نظریاتی ممالک کے تابع تھیں۔ دونوں ہی اپنے آقاؤں کے سامنے اپنی افادیت دیر تک قائم نہ رکھ سکیں۔''13



اختر الایمان کی شاعری آزاد فکری رویے کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری اور دوسری تحریروں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی شاعری کسی محدود دائرے کی شاعری نہیں ہے۔ دراصل اختر الایمان نے شاعری کو زندگی کے مماثل قرار دے کر شاعری کے دائرے کو بے کنار کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی سے وابستہ کوئی بھی واقعہ یا مسئلہ ان کی شاعری کا موضوع بن جاتا ہے۔ اور انھوں نے نئی شاعری کا مستقبل اس ادبی نسل سے وابستہ کیا ہے جو کسی تحریک سے وابستہ نہیں ہے۔

اختر الایمان کے ادبی تصورات کے جائزے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے یہاں فن کا تمام تر تصور تخلیقی عمل کے نصب العین کی بنیاد پر قائم ہے۔ انھیں یہ فکر بھی لاحق رہی کہ اردو شاعری غزل کے مخصوص موضوعات اور لفظیات کے حصار سے باہر نہیں آسکی۔ اختر الایمان نے شعری اظہار کے لیے نئے موضوعات کے ساتھ زبان و بیان کے نئے پیرائے بھی تلاش کرنے پر زور دیا جس سے اظہار کے نئے امکانات روشن ہوں۔ واضح رہے کہ یہ تمام شعری لوازمات بقول اختر الایمان تخلیقی فکر کے تابع ہوں۔ اختر الایمان تحریکوں اور رجحانوں والی شاعری سے متفق نہیں تھے تو اس لیے کہ یہ شعرا اس بے کنار زندگی سے وابستہ تمام طرح کے مسائل کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے مخصوص اور محدود دائرے میں ہی رہ کر زندگی کے حقائق بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مکمل زندگی کی ترجمانی نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے تقریباً پچاس سالہ تخلیقی سفر میں کسی تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے۔ بقول اختر الایمان انھوں نے زندگی کے ساتھ ایسا کوئی سمجھوتا نہیں کیا جو ان کی شاعری کو مجروح کرتا ہو۔

حواشی:

1 اختر الایمان: سروساماں (پیش لفظ)
2 اختر الایمان: آب جو (پیش لفظ)
3 اختر الایمان: سروساماں (پیش لفظ)
4 اختر الایمان: یادیں (پیش لفظ)
5 اختر الایمان: بنت لمحات (پیش لفظ)
6 اختر الایمان: نیا آہنگ (پیش لفظ)
7 اختر الایمان: یادیں (پیش لفظ)
8 اختر الایمان: بنت لمحات (پیش لفظ)
9 اختر الایمان: زمین زمین (پیش لفظ)
10 بیدار بخت: اختر الایمان سے ایک گفتگو، شب خون، الہ آباد، جون 1998، ص 3
11 عطاء الحق قاسمی: اختر لاایمان سے ایک گفتگو، عالمی ادب نمبر، 1997، ص 220
12 اختر الایمان: بنت لمحات (پیش لفظ)
13 اطہر فاروقی: گفتگوان کی، انجمن ترقی اردو ہند، 2006، ص 23

Prof. Shah Alam
Department of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
Mob. 9868669498
Email: salam8@jmi.ac.in



شفیع ایوب

اختر الایمان کی مختصر نظم میں ایک جائزہ

اختر الایمان اردو نظم کے ان اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے جدید اردو شاعری کو ایک نئی فکری جہت عطا کی۔ ان کی شاعری میں زندگی کی تلخ حقیقتوں، انسانی نفسیات، معاشرتی تضادات اور فرد کے داخلی کرب کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے عہد میں سامنے آئے، لیکن ان کی شاعری کسی مخصوص نظریے یا ادبی تحریک کی پابند نہیں رہی۔ ان کا انفرادی شعری اسلوب انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اردو کی نظمیہ شاعری کے حوالے سے وہ ایک ممتاز اور منفرد شناخت رکھتے ہیں۔

اختر الایمان کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا حقیقت پسندانہ رویہ ہے۔ وہ زندگی کو رومانوی تصورات کے بجائے اس کی اصل صورت میں دیکھنے اور پیش کرنے کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں ماضی کی یادیں، حال کی بے اطمینانی، انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں اور بدلتے ہوئے معاشرتی اقدار اہم موضوعات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جذبات کی شدت ضرور ہے، لیکن اس کا اظہار عموماً ضبط، تفکر اور غیر جذباتی لہجے کے ذریعے ہوتا ہے۔ وہ روزمرہ زندگی کے معمولی واقعات سے بھی گہرے انسانی اور سماجی معنی اخذ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مکالماتی انداز، بیانیہ تکنیک، ڈرامائی انداز کی خوبصورت مثالیں موجود ہیں۔ ان کے اہم شعری مجموعوں میں 'گرداب'، 'سب رنگ'، 'تاریک سیارہ'، 'آب جو'، 'یادیں'، 'بنتِ لمحات'، 'نیا آہنگ'، 'سروساماں'، 'زمین زمین' اور 'زمستاں سرد مہری کا' قابلِ ذکر ہیں۔ ان مجموعوں کے مطالعے سے ان کے فکری ارتقا، اسلوبی تجربات اور انسانی زندگی کے بارے میں ان کے بدلتے ہوئے نقطہ نظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی نظموں میں کردار نگاری اور واقعاتی تسلسل کے عناصر بھی ملتے ہیں، جو ان کے شعری اظہار کو ایک خاص ڈرامائی کیفیت عطا کرتے ہیں۔

اختر الایمان نے اردو نظم کو محض جذبات کے اظہار کا وسیلہ نہیں رہنے دیا، بلکہ اسے زندگی کے سنجیدہ مطالعے اور انسانی تجربات کی ترجمانی کا مؤثر ذریعہ بنایا۔ ان کی شاعری کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ قاری کو زندگی، معاشرے اور اپنی ذات پر نئے سرے سے غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ یہی فکری گہرائی اور فنی انفرادیت انھیں جدید اردو نظم کے اہم اور معتبر شعرا میں شامل کرتی ہے۔ وہ تقریباً پچاس سال تک ہندوستان کی فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ انھوں نے روزی روٹی کے لیے فلموں میں اسکرپٹ نگاری کی اور مکالمے لکھے۔ منفرد، ممتاز اور معتبر شاعر ہونے کے باوجود انھوں نے فلموں کے لیے نغمے نہیں لکھے۔ حالانکہ ان کے ہم عصروں میں شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی اور مجروح سلطان پوری وغیرہ اپنی فلمی نغمہ نگاری کے لیے ہی شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن اختر الایمان نے اپنی شاعری کو اپنا دین دھرم، ایمان بتایا۔ وہ شعری معیار سے کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ جن لوگوں نے ان کی نظموں کا سرسری طور پر جائزہ لیا انھیں ان نظموں میں دھند کی کیفیت نظر آئی۔ ان لوگوں نے اختر الایمان پر یہ بھی الزامات لگائے کہ وہ داخلی ہیں، شکست خوردہ ذہن رکھتے ہیں۔ مستقبل سے ناامید اور حال سے بے زار شاعر ہیں، لیکن محض اپنے عہد سے بے زاری کا احساس اور حزنیہ یا جذبات اضمحلال کا بیان اچھی یا بری شاعری کی پہچان نہیں ہوتا، بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کا تجربہ، تخلیقی اور فنی تجربہ بن پایا بھی ہے یا نہیں۔ اختر الایمان کی شاعری میں ان کیفیات نے تخلیقی تجربے کی صورت اختیار کی ہے اور اسی لیے اختر الایمان پر لگائے گئے یہ الزامات خود بخود رد ہو جاتے ہیں۔ اختر الایمان اپنی شاعری سے متعلق ''یادیں'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

''اپنی شاعری سے متعلق ایک اور اہم بات یہ کہوں گا جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ اس وقت نہیں لکھا جب ان تجربات اور محسوسات کی منزل سے گزر رہا تھا جو میری نظموں کا موضوع ہیں۔ انھیں اس وقت قلم بند

سچ بات یہ ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں اختر الایمان کو ایک منفرد و ممتاز مقام یوں ہی حاصل نہیں ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں جدید انسان کی نفسیاتی کیفیات، سماجی مسائل، تہذیبی تبدیلیاں، داخلی کشمکش اور زندگی کے تلخ تجربات کی عکاسی ملتی ہے۔ اختر الایمان نے نظم کی صنف کو اپنے منفرد اسلوب، فکری گہرائی اور حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کے ذریعے ایک نئی جہت عطا کی۔

کیا ہے جب وہ تجربات اور محسوسات یادیں بن گئے تھے۔ جب ہر نشتر کے لگائے ہوئے زخم مندمل ہو گئے تھے۔'

(پیش لفظ: یادیں)

اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی شاعری کے سب سے بڑے ناقد خود تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی شاعری کے متعلق جو بھی اظہار خیال کیا جائے وہ غور و فکر کے بعد کیا جائے۔ مجموعہ 'بنت لمحات' میں شامل ان کی ایک مشہور نظم ہے ''کل کی بات''۔ اس نظم کا جو پس منظر ہے وہ 1947 کا ہے۔ نظم لکھی گئی ہے 1962 میں۔ جن لوگوں نے اختر الایمان کی خود نوشت سوانح ''اس آباد خرابے میں'' کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کی اہلیہ سلطانہ ایمان سنہ 1947 میں فسادات کے وقت دہلی میں تھیں اور فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ کسی طرح ان کی جان بچی تھی اور وہ اختر الایمان کے پاس بمبئی پہنچی تھیں۔ لیکن اس حادثے کے تقریباً پندرہ سال بعد یہ نظم ''کل کی بات'' لکھی گئی ہے۔

کل کی بات

ایسے بیٹھے تھے اِدھر بھیا تھے دائیں جانب
ان کے نزدیک بڑی آپا شبانہ کو لیے
اپنی سسرال کے کچھ قصے، لطیفے، باتیں
یوں سناتی تھیں ہنسے پڑتے تھے سب
سامنے اماں وہیں کھولے پٹاری اپنی
منہ بھرے پان سے سمدھن کی انھیں باتوں پر
جھنجھلاتی تھیں کبھی طنز سے کچھ کہتی تھیں
ہم کو گھیرے ہوئے بیٹھی تھیں نعیمہ، شہناز
وقفہ وقفہ سے کبھی دونوں میں چشمک ہوتی
حسب معمول سنبھالے ہوئے خانہ داری
منجھلی آپا کبھی آتی تھیں کبھی جاتی تھیں
ہم سے دور ابا اسی کمرے کے اک کونے میں
کاغذات اپنے اراضی کے لیے بیٹھے تھے
یک بیک شور ہوا ملک نیا ملک بنا
اور اک آن میں محفل ہوئی درہم برہم
آنکھ جو کھولی تو دیکھا کہ زمیں لال ہے سب
تقویت ذہن نے دی، ٹھیرو، نہیں خون نہیں
پان کی پیک ہے یہ اماں نے تھوکی ہوگی!

نظم کے آغاز میں ایک سپاٹ بیانیہ ہے۔ لگتا ہے کوئی معلومی شاعر، کوئی معمولی واقعہ بیان کر رہا ہے۔ لیکن جب یک بیک شور ہوا، اور ایک نیا ملک بنا تو سرحد کے دونوں جانب زمین خون سے لال ہو چکی تھی۔ پہلے اس ڈرامائی انداز نے قاری کو چونکایا اور پھر آخر کے دو مصرعوں نے نظم کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ ''پان کی پیک ہے یہ اماں نے تھوکی ہوگی'' جیسا مصرع اختر الایمان ہی لکھ سکتے تھے۔ حادثہ چاہے جتنا بڑا ہو زندگی اس سے بڑی ہے۔ ہر حال میں زندگی چلتی رہتی ہے۔

اختر الایمان کے یہاں یادیں، ایک لڑکا، میرا نام اور کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام جیسی طویل نظمیں بھی ہیں اور کل کی بات، قبر، عہد وفا، تبدیلی، بیٹے نے کہا، شیشے کا آدمی، شفقی اور کتبہ جیسی مختصر نظمیں بھی ہیں۔ ان کی مختصر نظموں میں بھی بھرپور زندگی نظر آتی ہے۔ محض آٹھ دس مصرعوں کی نظم میں وہ بھرپور ڈرامائی کیفیت بھی پیدا کرتے ہیں اور طنز کے تیر بھی چلاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک مختصر نظم ہے ''بیٹے نے کہا''۔

بیٹے نے کہا

ایک شب خیز نے یہ سوچ کے اس دنیا کا
سلسلہ یوں ہے کہ جو باپ ہے بیٹا ہو وہی
اپنے ہمراہ لیا لختِ جگر کو اک رات
راہ ماری کے لیے چل پڑا تاریکی میں
دونوں چپ چاپ چلے جاتے تھے آگے پیچھے
جب نکل آئے بہت دور تو اک سمت کہیں
باپ نے رک کے کسی گھر کی طرف دیکھا، کہا
'وہ جو گھر ہے نا، دیا رکھا ہے کھڑکی میں جہاں
میں نے اس گھر کو کئی بار کیا ہے تاراج!'
سن کے بیٹے نے کہا باپ سے، 'لیکن بابا
پھر یہ کیوں ہے کہ اندھیرا ہے ہمارے گھر میں
اور اس گھر میں ابھی تک بھی دیا جلتا ہے؟'

ڈرامائی کیفیت سے بھرپور اس مختصر سی نظم میں زندگی کا کتنا بڑا پیغام پوشیدہ ہے۔ شب خیزی، اندھیرا اور روشنی کی علامتوں سے سجی ہوئی یہ نظم اپنے تاثر کے لحاظ سے بھی اور اپنے آفاقی پیغام کے لحاظ سے بھی بے حد کامیاب نظم ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں اختر الایمان کو ایک منفرد و ممتاز مقام یوں ہی حاصل نہیں ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں جدید انسان کی نفسیاتی کیفیات، سماجی مسائل، تہذیبی تبدیلیاں، داخلی کشمکش اور زندگی کے تلخ تجربات کی عکاسی ملتی ہے۔ اختر الایمان نے نظم کی صنف کو اپنے منفرد اسلوب، فکری گہرائی اور حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کے ذریعے ایک نئی جہت عطا کی۔ ان کی مختصر نظمیں بھی فنی اور فکری اعتبار سے اہم ہیں، کیونکہ ان میں کم الفاظ کے ذریعے زندگی کے وسیع تجربات اور گہرے احساسات کو پیش کیا گیا ہے۔



اختر الایمان کی مختصر نظموں کی ایک نمایاں خصوصیت اختصار اور معنویت ہے۔ وہ غیر ضروری تفصیلات اور لفظی آرائش سے گریز کرتے ہوئے اپنے موضوع کو مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں الفاظ کی سادگی کے باوجود معنی کی گہرائی موجود ہوتی ہے۔ شاعر بظاہر روزمرہ زندگی کے کسی معمولی واقعے، منظر یا تجربے کو موضوع بناتا ہے، لیکن اس کے ذریعے انسانی

زندگی کی پیچیدگیوں اور سماجی حقیقتوں کو نمایاں کرتا ہے۔ یہی خصوصیت ان کی شاعری کو عام بیانیہ انداز سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کی مختصر نظموں میں فرد اور معاشرے کے تعلق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے یہاں فرد محض ایک انفرادی وجود نہیں، بلکہ اپنے عہد کے سماجی، تہذیبی اور اخلاقی حالات سے متاثر ہونے والی شخصیت ہے۔ جدید شہری زندگی کی بے اطمینانی، انسانی رشتوں کی پیچیدگی، ماضی کی یادیں اور حال کی تلخ حقیقتیں ان کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ وہ انسانی تجربات کو جذباتی مبالغے کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی نظموں میں زندگی کی سچائی اور تجربے کی صداقت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ نظم ''تبدیلی'' میں انھی حقیقتوں کو اپنے خاص انداز میں بیان کرتے ہیں۔

تبدیلی

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں
جو مجھے راہ چلتے کو پہچان لے
اور آواز دے ''او بے ادسر پھرے''
دونوں اک دوسرے سے لپٹ کر وہیں
گرد و پیش اور ماحول کو بھول کر
گالیاں دیں، ہنسیں، ہاتھا پائی کریں
پاس کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر
گھنٹوں اک دوسرے کی سنیں اور کہیں
اور اِس نیک روحوں کے بازار میں
میری یہ قیمتی بے بہا زندگی
ایک دن کے لیے اپنا رخ موڑ دے!

فنی اعتبار سے اختر الایمان کی مختصر نظموں میں آزاد نظم کی روایت اور جدید اسلوب کی خصوصیات دیکھی جا سکتی ہیں۔ نظم معرا میں بھی انھوں نے اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔ وہ روایتی شعری پابندیوں کے مقابلے میں خیال اور تجربے کی فطری پیش کش کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں مکالماتی انداز، روزمرہ زبان، علامت، تلمیح اور ڈرامائی کیفیت کا استعمال بھی ملتا ہے۔ بعض نظموں میں بظاہر سادہ گفتگو کے ذریعے ایسے سوالات اٹھائے جاتے ہیں جو قاری کو انسانی رویوں اور معاشرتی اقدار پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی مختصر نظمیں محض جذبات کا اظہار نہیں کرتیں، بلکہ فکری تحریک بھی پیدا کرتی ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی کو

اخترالایمان کی شاعری کا ایک اہم پہلو ماضی اور حال کے درمیان کشمکش ہے۔ وہ ماضی کو محض رومانوی یادوں کے طور پر پیش نہیں کرتے، بلکہ اس کے حوالے سے موجودہ زندگی کے مسائل اور انسانی شعور کی تبدیلیوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مختصر نظموں میں تجربے کی گہرائی، مشاہدے کی قوت اور اظہار کی کفایت شعاری نمایاں ہے۔ یہی عناصر ان کی شاعری کو جدید اردو نظم کی روایت میں اہم مقام عطا کرتے ہیں۔

وہ اپنے خاص انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ دنیا فانی ہے، قبر کی تنگی اور قبر کے عذاب کے قصے ہم سنتے رہے ہیں۔ لیکن کیا بعض لوگوں کے لیے یہ دنیا ہی قبر کے مانند نہیں ہے؟ نظم قبر میں ایک معصوم بچے کی زبانی جو مکالمہ ادا کیا گیا ہے وہ ہمارے احساس کو برانگیختہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

قبر

عجم کے شہروں میں اک شہر کا ہے یہ قصہ
یہ رفت و بود کا اک سلسلہ جو قائم ہے
بھنور میں جس کے ہر اک چیز ڈوب جاتی ہے
سنا ہے اس میں کسی قصبہ کا رئیس بڑا
پھنسا کچھ ایسا کوئی چال کارگر نہ ہوئی
ہر ایک طبی مدد، ہر دوا، علاج، غرض
وہ سب جو قبضۂ انسان و ممکنات میں تھا
کیا، تمام مسیحا قریب و دور جو تھے
طلب کیے گئے، سب کو زرِ کثیر دیا
مگر خدا کو جو منظور تھا وہ ہو کے رہا
اجل نے بیٹے سے محبوب باپ چھین لیا
خبر یہ پھیل گئی دور، پاس پل بھر میں
ہر ایک روتا تھا زار و قطار سن سن کر
پسر کے بین کا دل پر اثر شدید ہوا
وہ سینہ پیٹ کے کہتا تھا بار بار، ''پدر
چلے ہو ایسی جگہ چھوڑ کر ہمیں سب کو
جہاں نہ دوست، نہ ہمدم، نہ کوئی مونس ہے
اندھیری کوٹھری ہوگی، اکیلے رہنا ہے
نہ کھانا پانی جہاں ہے، نہ روشنی کا گزر
وہاں پہ جیسے بھی گزرے گی خود ہی سہنا ہے
ہر ایک چیز کو ترسو گے ہائے ہائے وہاں
کوئی مدد کو نہ آئے گا، ایسی دنیا ہے''
غریب بھی کوئی شامل تھا اس جنازے میں
اور اپنے نورِ نظر کو بھی ساتھ لایا تھا
سنی جو آہ و بُکا اس نے کچھ نہیں سمجھا
پلٹ کے باپ سے پوچھا بہت ہی سادگی سے
ہمارے گھر لیے جاتے ہیں کیا انھیں بابا؟

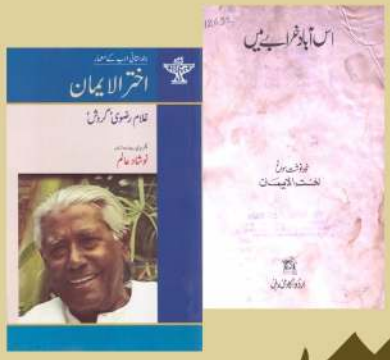
اس نظم قبر میں بھی بھرپور ڈرامائی کیفیت ہے۔ طنز بھی ہے اور زندگی کی تلخ حقیقت بھی ہے۔ اختر الایمان کی دوسری بہت سی نظموں کی طرح اس نظم میں بھی آخری مصرع نظم کی معراج ہے۔

اختر الایمان کی شاعری کا ایک اہم پہلو ماضی اور حال کے درمیان کشمکش ہے۔ وہ ماضی کو محض رومانوی یادوں کے طور پر پیش نہیں کرتے، بلکہ اس کے حوالے سے موجودہ زندگی کے مسائل اور انسانی شعور کی تبدیلیوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مختصر نظموں میں تجربے کی گہرائی، مشاہدے کی قوت اور اظہار کی کفایت شعاری نمایاں ہے۔ یہی عناصر ان کی شاعری کو جدید اردو نظم کی روایت میں اہم مقام عطا کرتے ہیں۔

مختصراً، اختر الایمان کی مختصر نظمیں موضوعاتی تنوع، فکر کی گہرائی، حقیقت نگاری اور فنی اختصار کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان نظموں میں جدید انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی اہمیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ مختصر شعری اظہار کے ذریعے وسیع انسانی تجربات کو معنی خیز بناتے ہیں۔ اسی بنا پر اختر الایمان کی مختصر نظموں کا مطالعہ جدید اردو نظم کے فکری ارتقا، اسلوبیاتی تبدیلیوں اور انسانی زندگی کی تفہیم کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

Dr. Shafi Ayub
Centre of Indian Languages
SLL & CS / JNU, New Delhi-110067 (India)
Email : shafiayub75@rediffmail.com







نوشاد عالم

اختر الایمان کا فنی طریقِ کار

اختر الایمان ہمارے ان باکمال نظم نگاروں میں شامل ہیں جن کی انفرادیت مسلم ہے۔ اختر الایمان کا شعری اسلوب ہمارے سامنے ایک توانا حوالے کے طور پر ابھر کر آتا ہے جس سے صرف نظر کر کے ان کی شاعری کی تفہیم نہیں کی جاسکتی۔ ان کے منفرد اسلوب کی اساس عام بول چال کی زبان اور نامانوس الفاظ کے خوبصورت اور ہنرمند استعمال پر قائم ہے۔

اختر الایمان کا شعری اسلوب ان کے موضوعات کی ہی طرح ہمہ جہت اور ہمہ گیری کے باعث اپنی انفرادیت کے گہرے نقوش ثبت کرتا ہے۔ یہ بھی خاطر نشان رہے کہ ان کا شعری اسلوب ایسا نہیں کہ اسے روایت سے کوئی علاقہ نہ ہو اور یہ یکسر جدید لسانی محاورے کا مظہر ہو بلکہ ان کے اسلوب کو روایت و جدت کا حسین امتزاج قرار دیا جاسکتا ہے۔ مختلف فنی اور تکنیکی طریق کار کی مدد سے وہ ایک ایسا دلآویز اسلوب وضع کرنے میں کامیاب ہوئے جو عام بول چال کی زبان سے نہ صرف کامل طور پر ہم آہنگ ہے بلکہ بعد کی نسل کے لیے اپنے اندر ثروت مند اندوختہ بھی رکھتا تھا۔ اس لیے ایسی شاعری اپنے انداز اور پیش کش کی تفہیم کا تقاضا کرتی ہے۔ اختر الایمان کے طریق اظہار کی تفہیم کے لیے پروفیسر عقیل احمد صدیقی نے بجا طور پر اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

اول۔ 'لیریکل' (غنائی)
دوم۔ بیانیہ' اور
سوم:۔ 'ڈرامائی' 1

اختر الایمان کے ابتدائی دور کی نظموں میں غنائی انداز پیش کش کو مرکزیت حاصل ہے۔ بعد کی نظموں میں بھی یہ غنائی طرز اظہار جا بجا ملتا ہے لیکن اسے وہ مرکزیت حاصل نہیں جو ابتدائی دور کی نظموں کا خاصہ ہے۔ غنائی انداز کی حامل نظموں میں ان کی مختصر نظموں کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس دور کی نظموں میں غنائیت کا سبب یہ ہے کہ ان میں تجربات، محسوسات اور تاثر کو پیکر سازی کے ساتھ ساتھ رمزیت و ایمائیت کے توسط سے پیش کرنے کی طرف میلان ملتا ہے۔ غنائی نظموں میں تاثر اور مرکزیت کو برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے علامت سازی اور پیکر سازی کی تکنیک سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

اسی غنائی نظموں والے ابتدائی دور میں ان کے یہاں اپنے معاصرین میراجی، ن۔م راشد اور فیض احمد فیض کے طریق اظہار کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اختر الایمان کی نظموں 'انجان'، 'پل پل روپ بھرے' اور 'اجنبی' میں میراجی کے نرم و نازک لہجے اور ہندی محاورے کا عکس صاف جھلکتا ہے۔ دوسری طرف اخترا لایمان کے یہاں راشد کے فارسی آمیز اثر کو سمجھنے کے لیے 'قلوبطرہ' اور 'پیمبر گل' کا مطالعہ مفید ہے۔ فیض کو اپنے معاصرین میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی اور اس عہد کے کم و بیش تمام شعرا نے ان کی پیروی کرتے ہوئے ان کے طرز میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ اختر الایمان کے شعری اسلوب میں بھی فیض کا انداز ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں:

فسانۂ گل رنگیں قبا و نغمۂ شوق
طویل ڈھلتی ہوئی رات، انتظار کے گیت
تڑپ کی آگ میں جلتے ہوئے زمان و مکاں
مئے نشاط میں بھٹکے ہوئے خمار کے گیت
مزہ نہ دیں گے ابھی، ان کو احتیاط سے چھیڑ
خزاں نصیب! ابھی تک ہیں کچھ بہار کے گیت
'پیمبرِ گل'

آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کردوں!
اپنے شوریدہ ارادہ کو اپاہج کرلوں
اپنی مجروح تمنا کو مداوا نہ کروں
اپنی خوابیدہ محبت کا المناک مآل
اپنی بے خواب جوانی کو سنایا نہ کروں
اپنے بے کیف تصور کے سہارے کے لیے
ایک بھی شمع سرِ راہ جلایا نہ کروں
اپنے بے سود تخیل کو بکھر جانے دوں
زندگی جیسے گزرتی ہے گزر جانے دوں!
'فیصلہ'

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ اختر الایمان کی انفرادیت اور ان کی شناخت کا معتبر اور توانا حوالہ غنائی نظمیں نہیں بلکہ ان کی وہ نظمیں ہیں جن میں بیانیہ اور ڈرامائی تکنیک بروئے کار لائی گئی ہے۔ اختر الایمان کے یہاں غنائی نظموں سے بیانیہ اور ڈرامائی طرز اظہار کی طرف جانے کا عمل بقول پروفیسر عقیل احمد صدیقی (اختر الایمان کے شعری مجموعہ) 'تاریک سیارہ' سے ہوتا ہے۔ غنائی اور بیانیہ نظموں کے درمیان فرق کی وضاحت اور دونوں کے اتصال کی طرف وہ ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں:

''بیانیہ نظموں میں عام طور پر ماضی کے کسی تجربے کا بیان ہوتا ہے جب کہ غنائی نظموں میں جو کچھ ہے اس کا تعلق زمانۂ حال کے تجربوں اور ان کی کیفیات سے ہے یا کہ ماضی کا کوئی تجربہ بہ صیغۂ حال بیان ہوا ہے۔ (وہ نظمیں جو بیانیہ ہوتے ہوئے بھی ڈرامائی ہیں جیسے ایک لڑکا، یادیں)۔''[2]

اختر الایمان کی شاعری متنوع اسالیب اور رنگا رنگ فنی تدابیر اور حکمت عملیوں کے توسط سے اپنا ہیولی تشکیل دیتی ہے۔ ان کی نظموں میں رومانی و غنائی اسلوب بھی جلوہ فگن ہے، علامتی و استعاراتی اسلوب بھی اپنی بہاریں دکھلا رہا ہے، تمثیلی و طنزیہ اسلوب بھی ہے، نثری ساخت بھی اپنی کشش سے دل لبھاتی ہے، بول چال اور غیر مانوس الفاظ سے تشکیل شدہ شعری تجربہ بھی (جسے ہم نارومانی اور کھردرا اسلوب کہتے ہیں) قاری سے ہم کلام ہے۔ مکالماتی اسلوب سے ڈرامائیت بھی پیدا ہو رہی ہے اور کبھی اظہار کے یہ جملہ پیرائے کسی نظم میں یکجا ہو کر کرشمے کا روپ دھار لیتے ہیں۔ غرض 'نئی دنیا کے شکستہ آدمی کی داستان' اسالیب کے اس نوع بہ نوع وسیلوں سے ترسیل کی آسودگی سے ہم کنار ہوتی ہے۔ وارث علوی نے اپنے مضمون 'اختر الایمان کی شاعری کے چند پہلو' میں اختر الایمان کے شعری اسلوب کی اسی خصوصیت کی نشان دہی کی تھی:

''ان (اختر الایمان) کے یہاں تجربات کے زیادہ سے زیادہ علاقوں کو زیر نگیں لانے کی حوصلہ مندی نے اختر الایمان کو کسی ایک طرز سخن کی پابندی قبول کرنے سے باز رکھا۔ اس معنی میں ان کی ہر نظم زبان لفظیات اور اسلوب، لب و لہجہ اور آہنگ کا ایک نیا ہنگام دروں بست پیش کرتی ہے اور اسی لیے ان کے یہاں تواتر، تکرار اور یک آہنگی کا وہ احساس نہیں ہوتا جو فیض اور راشد کی شاعری میں نظر آتا ہے۔''[3]

> **اختر الایمان کی شاعری متنوع اسالیب اور رنگا رنگ فنی تدابیر اور حکمت عملیوں کے توسط سے اپنا ہیولی تشکیل دیتی ہے۔ ان کی نظموں میں رومانی و غنائی اسلوب بھی جلوہ فگن ہے، علامتی و استعاراتی اسلوب بھی اپنی بہاریں دکھلا رہا ہے، تمثیلی و طنزیہ اسلوب بھی ہے، نثری ساخت بھی اپنی کشش سے دل لبھاتی ہے، بول چال اور غیر مانوس الفاظ سے تشکیل شدہ شعری تجربہ بھی (جسے ہم نارومانی اور کھردرا اسلوب کہتے ہیں) قاری سے ہم کلام ہے۔**

اختر الایمان نے جس نئی شعری لغت سے اپنا کھردرا اور ناتراشیدہ اسلوب مرتب کیا وہ روزمرہ کی زبان اور نامانوس الفاظ کے فن کارانہ تصرف پر استوار ہے۔ انھیں اپنے شعری تجربے کے اظہار کے لیے آرائشی انداز قبول نہیں۔ ان کے یہاں شعوری طور پر عام بول چال اور نامانوس الفاظ کے استعمال سے اردو شاعری کے روایتی قاری کو جھٹکا محسوس ہوتا ہے۔ فطری اور بے ساختہ لہجے کے برتاؤ نے ان کی شاعری میں ایک نوع کی موسیقیت کی فضا خلق کی ہے۔ عام بول چال کی زبان سے پیدا ہونے والے آہنگ کو نشان زد کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''اس رویے (آرائشی بیان سے شعوری گریز) نے ان کی نظموں میں ایک مختلف الجہات قسم کی موسیقیت کو راہ دی ہے۔ جیسے ڈھولک کی تھاپ پر کوئی کھردرا گیت گایا جا رہا ہو یا بنگال کے باؤل اپنے اکتارے کی دھن پر گانے کے علاوہ دیوانہ وار رقص بھی کرتے جاتے ہوں۔''[4]

اختر الایمان کی وہ نظمیں جن کی زبان نثری ترتیب، غیر روایتی اور غیر شاعرانہ لفظیات کے عمل سے تشکیل پاتی ہے ان میں 'عہد وفا'، 'بنت لمحات'، 'پس دیوار چمن'، 'ایک لڑکا'، 'باز آمد'، 'مفاہمت' اور 'رویائے صادقہ' شامل ہیں۔

اختر الایمان کا منفرد اسلوب جو عام بول چال اور نثریت سے قریب تر ہے اس کی تفہیم کے لیے ان کی نظموں 'مفاہمت' اور 'کارنامہ' کے چند ٹکڑے دیکھیں:

جب اس کا بوسہ لیتا تھا سگریٹ کی بو نتھنوں میں گھس جاتی تھی
میں تمبا کو نوشی کو اک عیب سمجھتا آیا ہوں
لیکن اب میں عادی ہوں، یہ میری ذات کا حصہ ہے
وہ بھی میرے دانتوں کی بدرنگی سے مانوس ہے، ان کی عادی ہے
جب ہم دونوں ملتے ہیں لفظوں سے بیگانہ سے ہو جاتے ہیں
کمرے میں کچھ سانسیں اور پسینے کی بُو، تنہا رہ جاتی ہے!
ہم دونوں شاید مردہ ہیں، احساس کا چشمہ سوکھا ہے
یا پھر شاید ایسا ہے یہ افسانہ بوسیدہ ہے
(مفاہمت)

عظیم کام کروں کوئی، ایک دن سوچا
کہ رہتی دنیا میں اپنا بھی نام رہ جائے
مگر وہ کام ہو کیا ذہن میں نہیں آیا
زمانے بعد سمندر کنارے بیٹھا تھا
عظیم شئے ہے سمندر بھی میرے دل نے کہا
وہ کیا طریقہ ہو میں اس کا بھاگ بن جاؤں
سمجھ میں آیا نہیں کوئی راستہ بھی جب
تو جھنجھلا کے سمندر میں کر دیا پیشاب
(کارنامہ)

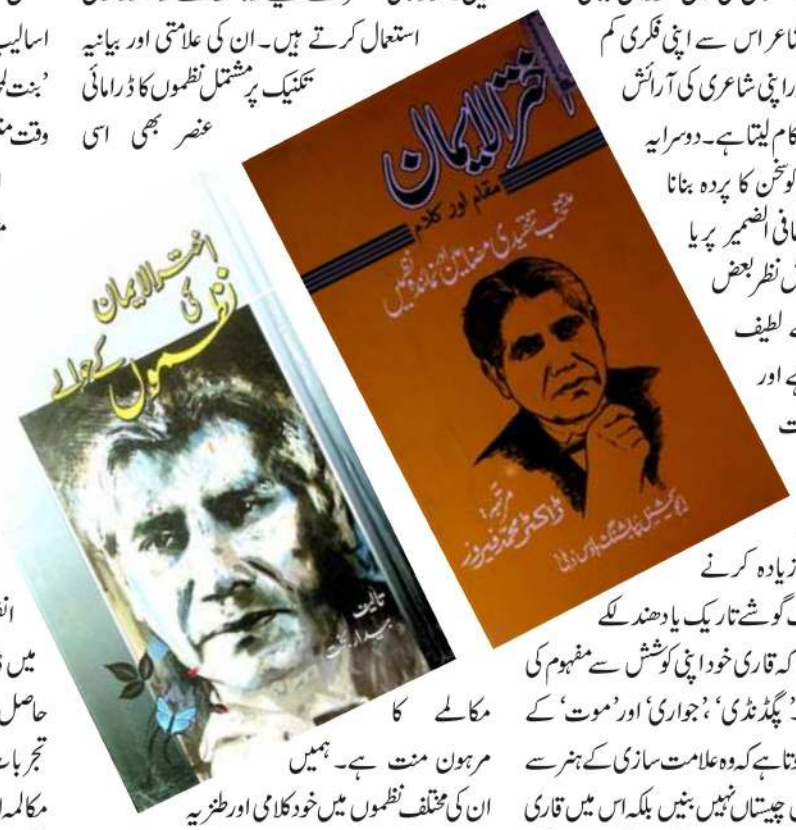
ان کا ایک اسلوب، ہمہ گیر استعاراتی و علامتی نظام پر مبنی ہے۔ ان کی علامتوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کی علامتیں انفرادی و اجتماعی اور داخلی و خارجی صورت حال کو پیش کرنے کا موثر وسیلہ ہیں۔ ان کے یہاں علامتی طرز اظہار کی متعدد صورتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اختر الایمان کے یہاں علامتی طرز اظہار کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی کردار کو بطور علامت استعمال کرتے ہیں۔ کبھی کسی سانحہ کو شعری تجربہ بنا کر علامتی پیرائے میں پیش کر دیتے ہیں۔ کہیں کہیں علامتوں کا استعمال لفظ کی سطح تک ہوتا ہے تو کہیں کہیں پوری نظم علامتی رنگ و آہنگ لیے سامنے آتی ہے۔ علامتی و استعاراتی اسلوب ان کا محبوب اسلوب ہے۔ علامتی اسلوب کی نمائندہ نظمیں 'مسجد'، 'تنہائی میں'، 'پرانی فصیل'،

موت‘ ’اعتماد‘ ’پگڈنڈی‘ اور ’جواری‘ ہیں۔ ان میں ’پگڈنڈی‘ اور ’جواری‘ کو عام طور پر ناقدین نے عمدہ علامتی نظم تسلیم کیا ہے جہاں علامت چیستاں نہیں بنی۔ اور وہ انفرادی واجتماعی دونوں سطحوں کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے۔

پروفیسر محمد حسن نے اپنے مضمون ’اختر الایمان کی شاعری‘ میں علامت کے استعمال کی تین صورتیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ شاعر اس سے اپنی فکری کم مائیگی کو چھپانے اور اپنی شاعری کی آرائش وزیبائش کرنے کا کام لیتا ہے۔ دوسرا یہ کہ شاعر علامت کو سخن کا پردہ بنانا چاہتا ہے اور اپنے مافی الضمیر پر یا تو مصلحت کے پیش نظر بعض دوسری وجوہ سے لطیف پردہ ڈالنا چاہتا ہے اور تیسرا طرز علامت کے استعمال کا یہ بتایا کہ شاعر صرف انبساط کو زیادہ کرنے کے لیے بعض لطیف گوشے تاریک یا دھندلکے ہی چھوڑ دیتا ہے تاکہ قاری خود اپنی کوشش سے مفہوم کی بازیافت کر سکے۔ ’پگڈنڈی‘، ’جواری‘ اور ’موت‘ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علامت سازی کے ہنر سے آگاہ ہیں۔ یہ نظمیں چیستاں نہیں بنیں بلکہ اس میں قاری خود کو شریک محسوس کرتا ہے۔ علامت کی ان تین صورتوں کی وضاحت کے بعد پروفیسر محمد حسن نے اختر الایمان کی علامت نگاری پر معنی خیز تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’ہر علامت Symbol دراصل ایک طرح کی کہہ مکرنی ہے، چیستاں یا پہیلی نہیں ہے۔ کہہ مکرنی کا جواب خود اسی کے اندر موجود ہوتا ہے اور سننے والا اس مشترکہ رابطہ تک ذرا سی کوشش کے بعد پہنچ سکتا ہے۔ دوسرے Symbol استعمال کرتے وقت شاعر کو ندرت احساس واظہار کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مشترک سماجی ذخیرۂ احساس سے اس کا رابطہ نہ ٹوٹے۔ ان دونوں باتوں کو جس قدر احتیاط کے ساتھ اختر الایمان نے برتا ہے، اس کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہمارے کامیاب ترین علامتی Symbolist شاعر ہیں‘‘۔[5]

اختر الایمان کی فنی ہنرمندی اور صناعی کا تیسرا رخ وہ اسلوب ہے جس میں ڈرامائیت کو مرکزیت حاصل ہے۔ ڈرامائی اسلوب کی حامل نظموں میں ’موت‘ ’تاریک سیارہ‘، ’خاک وخون‘، ’ایک کہانی‘ اور ’جب آنکھ کھلی‘ شامل ہیں۔ ان نظموں میں ڈرامائیت ان کے اختتامیے میں مضمر ہے اور کبھی کبھی ابتدائیوں میں بھی ڈرامائیت پیدا کر کے وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ڈرامائی عنصر کے لیے وہ مکالمے کو بطور ٹول استعمال کرتے ہیں۔ ان کی علامتی اور بیانیہ تکنیک پر مشتمل نظموں کا ڈرامائی عنصر بھی اسی



مکالمے کا مرہون منت ہے۔ ہمیں ان کی مختلف نظموں میں خود کلامی اور طنزیہ اسلوب کے ساتھ ڈرامائیت کے عناصر سے سابقہ پڑتا ہے۔ انھوں نے اپنے ڈرامائی اسلوب کو پرقوت بنانے کے لیے تمثیلی ڈرامائی عنصر کو بھی آزمایا۔ ڈرامائیت کی فضا کو مزید ثروت مند بنانے کے لیے انھوں نے تمثیلی عنصر پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ ان کے تمثیلی ڈرامائی عنصر سے آراستہ نظم ’اعتماد‘ ان کے تمثیلی تجربے کی عمدہ مثال ہے۔ ان کی ڈرامائی نظم ’تاریک سیارہ‘ (ایک کشمکش)، اس میں دو حریفوں خواب اور حقیقت کی کشمکش سے ڈرامائیت پیدا کی گئی ہے۔ اس کے دو بند دیکھیں:

جان من حجلۂ تاریک سے نکلو، دیکھو
کتنا دل کش ہے سیہ رات میں تاروں کا سماں
آسماں چھلکے ہوئے جام کے مانند حسیں
خلد میں دودھ کی اک نہر سی ہے کا ہکشاں
آسماں خود ہی نگوں سر ہے اسے کیا دیکھوں
رات کے پاس ہے کیا مرگ تبسم کے سوا
جس کے ذروں میں ہے اب تک مرے ماضی کا لہو
میں نے باندھا ہے اسی خاک سے پیمان وفا!

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اختر الایمان کے ڈرامائی اسلوب کا رنگ بیانیہ اور مکالماتی تکنیک پر مشتمل نظموں میں زیادہ واضح ہو کر ابھرا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ ان کی بعض نظمیں ایسی ہیں جو یک بت ہزار شیوہ کی مانند مختلف اسالیب سے آراستہ ہیں۔ ’عہد وفا‘، ’باز آمد‘، ’نیا آہنگ‘، ’بنت لمحات‘، ’ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر‘، اور ’تبدیلی‘ میں بیک وقت متنوع اسالیب جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں۔

ان کے یہاں علامتی اور بیانیہ تکنیک کی حامل نظموں مثلاً ’ایک لڑکا‘، ’یادیں‘، ’قبر‘، ’کل کی بات‘ وغیرہ میں ڈرامائی انداز نمایاں ہے جب کہ طنزیہ اسلوب اور خود کلامی پر مشتمل نظموں میں ڈرامائی عنصر کا رنگ مدھم ہے۔

اختر الایمان نے شعوری طور پر رومانی اور غنائی لہجے سے گریز کیا ہے۔ ایسا نہیں کہ ان کے یہاں مترنم لب ولہجہ نہیں ملتا تاہم ان کی انفرادیت اظہار کے جن وسائل پر استوار ہے ان میں ڈرامائیت اور بیانیہ کی تکنیک کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔ بیانیہ کی تکنیک کا راست تعلق شاعر کے تجربات و مشاہدات کے اظہار سے ہے۔ اس میں مکالمہ اور ڈرامائی عناصر سے کشش اور جاذبیت کو برقرار رکھنے کا کام لیا جاتا ہے۔ مکالمہ اور ڈرامائی عنصر کی شمولیت کے طفیل ان میں ایک نوع کی تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے جس کے باعث یہ نظمیں سپاٹ طریق اظہار سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ ان کی بیانیہ تکنیک کے حوالے سے پروفیسر عتیق اللہ انھیں اپنے دور کے ’باز گو‘ اور ’ڈرامہ کار باز گو‘ کہتے ہیں:

’’بیانیہ کی تکنیک ان کی دلچسپی کا خاص محور بن گئی۔ ان کی اکثر نظمیں ’محاضرہ‘ اور ’خود گزشت‘ جیسے عناصر کی شمولیت کے باعث ایک دم قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ ان میں بڑی فن کاری کے ساتھ ڈرامائی نقل اور بیانیہ عنصر کو شامل کر کے خلط ملط کر دیا گیا۔ اس معنی میں اختر الایمان ہمارے دور کے ’باز گو‘ بھی ہیں، ڈرامہ کار باز گو بھی۔ ڈرامائی عناصر کے اعتبار سے ہم ان کو اکثر نظموں میں دیکھنے کے عمل سے دوچار ہوتے ہیں اور باز گوئی کے عنصر کے باعث ہم انھیں سنتے ہیں‘‘۔[6]

انھوں نے بیانیہ کی تکنیک کو مختصر اور طویل دونوں طرح کی نظموں میں آزمایا ہے۔ یہ بات سامنے کی ہے کہ مختصر نظم میں بیانیہ کی تکنیک زیادہ کارآمد اور سودمند ثابت نہیں ہوتی لیکن اسے اختر الایمان کی صناعی کہہ سکتے ہیں کہ 'عہد وفا'، 'بیداد' 'شیشے کا آدمی، وقت کی کہانی' اور 'قبر' اختصار کے باوجود بیانیہ تکنیک کی عمدہ مثالیں قرار دی جاسکتی ہیں۔

طنزیہ اسلوب بھی اختر الایمان کی شعری انفراد و امتیاز کا ایک خاص نشان ہے۔ طنز کو ایک ادبی حربے کے طور پر برتنے کا رجحان اردو شاعری کی توانا روایت کا اہم حصہ ہے۔ تخلیق کاروں نے طنز کے وسیلے سے غم دوراں اور غم جاناں دونوں کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی سعی کی ہے۔ اختر الایمان کے یہاں طنز کے اسلوب کی مختلف سطحیں ہیں۔ کبھی وہ مجموعی انسانی صورت حال کو نشانۂ طنز و تشنیع بناتے ہیں اور کبھی انفرادی فکر اور ذاتی عمل پر طنز کے وسیلے سے اپنا کرب بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں طنز کی اس صورت سے بھی ہمارا سابقہ پڑتا ہے جہاں ہمیں اس کی ایک نیم فلسفیانہ سطح نظر آتی ہے اور زندگی کے المیہ آہنگ سے جس کا رشتہ بہت توانا اور مستحکم ہوتا ہے۔ 'فرار کی خواہش' کا حوالہ بھی ان کے طنزیہ اسلوب کی ایک جہت قرار پاتی ہے۔ طنزیہ اسلوب کی حامل نظموں میں 'عہد وفا'، 'پرانی فصیل'، 'قبر'، 'حسن پرست، میرا دوست ابوالہول' اور 'شیشہ کا آدمی، راہ فرار، 'ایک احساس' وغیرہ شامل ہیں۔ عام طور پر 'راہ فرار' اور 'ایک احساس' کو اس اسلوب کی نمائندہ اور کامیاب نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مری تنہائیاں مانوس ہیں تاریک راتوں سے
مرے رخنوں میں ہے الجھا ہوا اوقات دامن کا
مرے سائے میں حال و ماضی رُک کر سانس لیتے ہیں
زمانہ جب گزرتا ہے بدل لیتا ہے پیراہن
یہاں سرگوشیاں کرتی ہے ویرانی سے ویرانی
فسردہ شمعِ امید و تمنا لَو نہیں دیتی
یہاں کی تیرہ بختی پر کوئی رونے نہیں آتا
یہاں جو چیز ہے ساکت، کوئی کروٹ نہیں لیتی

اختر الایمان کے شعری اسلوب کو دریافت کرتے ہوئے ہماری نگاہ ان چھوٹی لیکن اہم فنی تدابیر پر بھی ہونی چاہیے جن سے ان کا منفرد طریق اظہار تشکیل پاتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ان کی نظموں کی ابتدا کیسے ہوتی ہے، وہ کس طرح انجام کو پہنچتی ہیں اور نظم کے داخلی آہنگ اور لہجے کی تعمیر میں کن عناصر سے استفادہ کیا گیا ہے وغیرہ۔

نظم نگاری کے دوران اختر الایمان جو اہم فنی تدابیر اختیار کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی نظموں کی ابتدا بغیر کسی تمہید کے یک لخت انداز میں کرتے ہیں۔ عام بول چال کی زبان اور نثر سے کامل طور پر ہم آہنگ غیر روایتی اور غیر رسمی شعری زبان سے وہ قاری کے لیے آزمائش کا توشہ تیار کرتے ہیں۔ نظم کے آغاز ہی سے ایک درشت و کرخت تاثر کو ابھارنا جیسے ان کی منصوبہ بند کوشش ہو۔ ان کی نظموں کی ایک بنیادی خصوصیت امیجری کا کمال ہے۔ انھیں لفظوں کی مدد سے اشیا کی صورت گری کا ہنر خوب آتا ہے۔ ایک تکنیک جس کا وہ ہنرمندانہ استعمال کرتے ہیں اس کا تعلق افسانوی تکنیک سے ہے۔ ان کی بعض نظموں کے ابتدائیوں کو پڑھ کر افسانوی صنف کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ نظم نگاری میں تیسری تکنیک جسے وہ بروئے کار لاتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان کی نظمیں بلا تمہید کے بقول پروفیسر عتیق اللہ Doggerel طریقے سے شروع ہوجاتی ہیں۔ چوتھی تکنیک کا تعلق بھی افسانوی تکنیک سے ہے۔ وہ اپنی نظموں کے اختتامیوں میں اینٹی کلائمکس کے تاثر کو ابھارتے ہیں۔ گویا وہ اپنی نظموں میں صرف شعری لوازمات کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ افسانوی تکنیک سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔

غرض اختر الایمان کے شعری اسلوب اور ان کے فنی طریق کار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے انتہائی ہنرمندی کے ساتھ متنوع طریق اظہار کو منتخب کیا ہے۔ انھوں نے رومانی و غنائی پیرایہ اظہار کو بھی برتا اور بیانیہ و ڈرامائی اسلوب پر بھی انتہائی سلیقہ مندی سے اپنی مہر ثبت کی۔ علامتی و استعاراتی طرز ادا، نثری ساخت سے مماثل اور طنز کا طریق اظہار کو بھی بروئے کار لائے۔ اسالیب کے تنوع کے ساتھ ساتھ مختلف فنی تدابیر کے استعمال سے اپنے یکتا و یگانہ اسلوب کو توانائی و استحکام عطا کیا۔ ان کے اسالیب اور دیگر فنی تدابیر کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا شعری اسلوب ان کی افتادِ طبع، تفکیری رویے، تخلیقی وفور سے سرشار ذہن اور روایت و جدت کے حسین امتزاج کا مستند اور کامیاب نمونہ ہے۔

اختر الایمان کے یہاں طنز کے اسلوب کی مختلف سطحیں ہیں۔ کبھی وہ مجموعی انسانی صورت حال کو نشانۂ طنز و تشنیع بناتے ہیں اور کبھی انفرادی فکر اور ذاتی عمل پر طنز کے وسیلے سے اپنا کرب بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں طنز کی اس صورت سے بھی ہمارا سابقہ پڑتا ہے جہاں ہمیں اس کی ایک نیم فلسفیانہ سطح نظر آتی ہے اور زندگی کے المیہ آہنگ سے جس کا رشتہ بہت توانا اور مستحکم ہوتا ہے۔

حوالہ جات

1 جدید اردو نظم: نظریہ و عمل، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ایڈیشن 2012 ص 345
2 ایضاً ص 347
3 وارث علوی 'اختر الایمان کی شاعری کے چند پہلو' مشمولہ 'سوغات' شمارہ 1991 ص 37
4 شمیم حنفی 'اختر الایمان کی شاعری' (محمود ایاز کی یاد میں) مشمولہ 'سہ ماہی اردو ادب' اختر الایمان نمبر، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، شمارہ 7-236 جلد 60-59 (اکتوبر -2015 تا مارچ 2016، ص 415
5 پروفیسر محمد حسن 'اختر الایمان کی شاعری' معیار 7 اختر الایمان نمبر، معیار پبلی کیشنز، دہلی 2000، ص 134-133
6 پروفیسر عتیق اللہ 'اختر الایمان: ایک متبادل نظم گو' مشمولہ سہ ماہی 'اردو ادب' اختر الایمان نمبر، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، شمارہ 7 - 236 جلد 60-59 (اکتوبر -2015 تا مارچ ص 490-489
7 کلیات اختر الایمان (مرتبہ) بیدار بخت۔ سلطانہ ایمان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2017

Dr. Naushad Alam
Academy of Professional Development of Urdu Medium Teachers (APDUMT)
Noam Chomsky Complex,
Jamia Millia Islamia New Delhi-110025
Mob.:9971260657
Email: naushadalam1@gmail.com



اختر الایمان کی نظموں کا بیانیہ نظام



لیاقت علی

شاعری کی اصل قوت موضوعات کی غیر معمولیت کے بجائے معمول کے اندر مضمر غیر معمول کو منکشف کرنے کی تخلیقی استعداد میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ زندگی اپنے ظاہری مظاہر میں جس قدر مانوس، مکرر اور غیر اہم دکھائی دیتی ہے، اس کے باطن میں انسانی وجود کی اتنی ہی پیچیدہ، متضاد اور ناقابلِ توضیح صورتیں متحرک رہتی ہیں۔ زندگی کی یہی دوہری ماہیت، اس کی ظاہری معمولیت اور داخلی پیچیدگی، اختر الایمان کے شعری بیانیے کی بنیادی اساس قرار پاتی ہے۔ اختر الایمان جدید اردو نظم کے ان اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کے مروجہ اسالیب اور موضوعاتی ترجیحات سے انحراف کرتے ہوئے اظہار و بیان کی ایک منفرد شعری جہت متعین کی۔ ''اختر الایمان کوئی معمولی شاعر نہیں تھا کہ تقلید اور تتبع کے اس رجحان میں یکسر بہہ جاتا اور اپنی نظم کو نعرہ بازی اور نظریاتی تبلیغ کے حوالے کر دیتا۔''[1] ان کی شناخت بنیادی طور پر ایک نظم نگار کی حیثیت سے قائم ہوئی۔ ان کے شعری مجموعوں میں ''گرداب''، ''تاریک سیارہ''، ''آبِ جو''، ''یادیں''، ''بنتِ لمحات'' اور ''نیا آہنگ'' نمایاں ہیں، جب کہ ان کا کلیات ''سرو ساماں'' کے نام سے شائع ہوا۔ مجموعہ کلام ''یادیں'' پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اختر الایمان کے یہاں شاعری زندگی سے ماورا کسی متخیل آرام گاہ کی تعمیر نہیں کرتی اور نہ ہی وہ تجربے کو کسی مجرد جمالیاتی آدرش کے تابع کر کے اس کی ناگوار حقیقتوں کو محو کرنے کی کوشش کرتی ہے، وہ زندگی کے ان منتشر، بظاہر غیر اہم اور روزمرہ مظاہر میں داخل ہوتی ہے جنھیں ہم دیکھنے کے باوجود محسوس نہیں کرتے۔ ان کی شعری بصیرت کا امتیاز اس انکشاف میں مضمر ہے کہ معمولی واقعہ اپنی ظاہری حدود کے اندر کبھی معمولی نہیں ہوتا، اس کے باطن میں تاریخ کی نامرئی تہیں، حافظے کے مدفون نقوش، انسانی رشتوں کے شکستہ امکانات اور شعور کی غیر ملفوظ کشمکشیں پوشیدہ رہتی ہیں۔ وہ زندگی کی پوشیدہ اس شعری حقیقت کو منکشف کرتے ہیں جس پر خود زندگی کی تکرار نے پردہ ڈال رکھا ہوتا ہے۔'' آبِ جو'' کے دیباچے میں اختر الایمان نے لکھا ہے:

''(میری شاعری) ایک ایسے انسانی ذہن کی تخلیق ہے جو رات دن بدلی ہوئی سیاسی، معاشی اور اخلاقی قدروں سے دوچار ہے، جو اس معاشرہ اور سماج میں زندہ ہے جسے Ideal نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں عملی زندگی اور اخلاقی قدروں کا ٹکراؤ ہے، جہاں انسان کا ضمیر اس لیے قدم قدم پر ساتھ نہیں دے سکتا کہ زندگی ایک سمجھوتہ کا نام ہے اور سماج کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی قدریں نہیں مصلحت ہے اور ضمیر کو چھوڑا اس لیے نہیں جا سکتا کہ اگر انسان محض حیوان ہو کر رہ گیا تو ہر اعلیٰ قدر کی نفی ہو جائے گی۔''[2]

اسی تناظر میں اختر الایمان کے شعری امتیاز کو متعین کرنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انھوں نے عام آدمی، معمولی واقعات، مانوس مناظر اور روزمرہ گفتگو کو اپنی نظموں میں کس طرح سے جگہ دی، ان کے یہاں روزمرہ تجربہ شعری تجربے میں کس طرح منقلب ہوتا ہے اور وہ کون سا جمالیاتی و ادراکی عمل ہے جس کے ذریعے ایک معمولی واقعہ اپنی فوری افادیت، خارجی شناخت اور واقعاتی محدودیت سے تجاوز کر کے ایک وسیع تر انسانی معنویت حاصل کر لیتا ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ زندگی کا نظم میں داخل ہو جانا یا نظموں کا موضوع بن جانا بذاتِ خود کوئی غیر معمولی فنی کارنامہ نہیں ہے، اصل تخلیقی مسئلہ ہے کہ شاعر روزمرہ کی مانوسیت کو کس طرح اپنے خلاف استعمال کرتا ہے، کس طرح ایک شناسا منظر کو اجنبیت کی ایسی روشنی میں رکھ دیتا ہے کہ قاری اس چیز کو بھی نئے سرے سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے جسے وہ پہلے سے جاننے کا گمان رکھتا تھا۔ اختر الایمان کے یہاں یہ عمل مشاہدے، حافظے، داخلی فاصلے اور بیانیاتی تنظیم کے اس باہمی تعامل سے تشکیل پاتا ہے جس میں واقعہ اپنی پہلی معنویت سے محروم ہوئے بغیر معنوی امکانات کی متعدد سطحوں میں منکشف ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ نظم ملاحظہ کیجیے:

گلاب کیکر پہ کب اگے گا
کہ خار دونوں میں مشترک ہے
میں کس طرح سوچنے لگا ہوں
مجھے رفیقوں پہ کتنا شک ہے
یہ آدمیت عجیب شے ہے
سرشت میں کون سا نمک ہے
کہ آگ، پانی، ہوا، یہ مٹی
تو ہر بشر کا ہے تانا بانا[3]

اختر الایمان کی شعری کائنات میں نظم کسی مجرد خیال کی توضیح، کسی جذبے کی لفظی ترجمانی یا کسی واقعے کی بیانیہ بازآفرینی نہیں، بلکہ تجربہ وجود کی اس پیچیدہ داخلی حرکت کا نام ہے جس میں واقعہ، حافظہ، زمان، مکان، ذات اور غیرِ ذات ایک دوسرے میں مدغم ہو کر معنی کی ایک ایسی متحرک ساخت تشکیل دیتے ہیں جسے موضوعاتی تناظر میں گرفت میں نہیں لیا جا سکتا۔ اختر الایمان کا بنیادی امتیاز جدید انسان کے المیے، تنہائی، شکستِ

رشتہ، تغیرِ اقدار یا احساسِ زیاں کو موضوع بنانے کہ ساتھ ایک ایسی شعری صورتِ حال میں منکشف ہے جس میں معنی قاری پر مسلط نہیں ہوتے بلکہ واقعے کی تہہ سے تدریجاً نمودار ہوتے ہیں۔ ان کی نظم میں خیال پہلے سے مرتب شدہ نظریے کی صورت میں وارد نہیں ہوتا، وہ کسی منظر کی جزئیات، کسی معمولی واقعے، کسی مکالمے، کسی غیر متوقع یاد یا کسی داخلی ارتعاش سے اپنی معنوی تشکیل کا آغاز کرتے ہیں۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

''اختر الایمان کے ہاں جو تہہ داری ہے، جو رمزیت اور اشاریت ہے وہ اس کی شاعری میں معنی و مفہوم کے کئی جلوے قاری کو دکھاتی ہے اور یہی چیز ہے جو اس کی نظموں میں سلیقہ اور الفاظ کے برتنے کے ڈھنگ پر روشنی ڈالتی ہے۔ وہ اپنے مشاہدات اور جذبات کے اظہار کے لیے سخت محنت کرتا ہے اور اپنی ساری صلاحیت اس بات پر صرف کر دیتا ہے کہ وہ نظم کو اول تا آخر مکمل تکنیکی آگاہی کے ساتھ پیش کر سکے جو موسیقی سے قریب ہو اور جس کے ذریعے خیال بھی بھر پور طریقہ پر ادا ہو جائے۔''4

اختر الایمان کے بیانیے میں انسانی اقدار کا زوال زندگی کے تجربے کو جانچنے کا ایک پیمانہ ہے۔ اختر ماضی کو اس لیے یاد نہیں کرتے کہ اسے غیر مشروط طور پر بہتر ثابت کیا جائے، بلکہ اس کے ذریعے حال کی معنویت، اس کی کمزوریوں اور اس کے تضادات کو نمایاں کیا جا سکے۔ ان کا مکالماتی بیانیہ ایک شعریاتی عمل ہے، کبھی حال اور ماضی ایک دوسرے کے بالمقابل آتے ہیں، کبھی موجودہ ذات اپنے ہی وجود کے روبرو ہوتی ہے، کبھی کوئی خارجی منظر حافظے کے اندر پوشیدہ کسی زمانے کو بیدار کر دیتا ہے، کبھی ایک کردار دوسرے کردار سے گفتگو کرتے ہوئے دراصل اپنے باطن کے کسی منقسم حصے سے مخاطب ہوتا ہے اور کبھی خاموشی خود ایک ایسی غیر ملفوظ گفتگو میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کی معنوی شدت کہے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اختر الایمان کے یہاں مکالمہ دو آوازوں کے اجتماع کے بجائے دو وجودی امکانات کا تصادم ہے۔ ان کی نظم میں ''میں'' بھی ایک واحد، غیر منقسم اور مستحکم وجود نہیں رہتا، وہ اپنے اندر متعدد زمانی اور نفسیاتی حوالوں کو مجتمع کیے ہوئے ایک ایسا منقسم شعور بن جاتا ہے جس میں ماضی کا شخص، حال کا شخص اور ممکنہ مستقبل کا شخص ایک دوسرے کو دیکھتے، پرکھتے اور کبھی کبھی مسترد کرتے ہیں۔ اس تناظر میں ان کی مشہور نظم ''ایک لڑکا'' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم کا لڑکا ایک زمانی پیکر ضرور ہے، مگر اس سے زیادہ وہ ذات کے اس مفقود امکان کا استعارہ ہے جو وقت کی مسلسل گردش میں کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔ شاعر اپنے گزرے ہوئے وجود کو یاد کرتا ہوا دراصل اس وجود کی بازیافت نہیں کرتا بلکہ اس سے اپنے حال کا محاسبہ کراتا ہے۔ ماضی کی یہ مراجعت اس لیے بھی معنی خیز ہے کہ وہ حال کو تسکین نہیں دیتی بلکہ اس کے اطمینان کو متزلزل کرتی ہے۔ بچپن کا لڑکا ایک گزرے ہوئے زمانے کی تصویر سے زیادہ اس سوال کی علامت ہے کہ انسان اپنی عمر کے مختلف مراحل سے گزر کر آخر کس مقام پر اپنی شناخت سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں زندگی کا بنیادی وصف حرکت ہے۔ لڑکا کبھی باغوں میں ہے، کبھی کھیتوں میں، کبھی جھیلوں کے پاس اور کبھی بستی کی گلیوں میں۔ لفظ ''کبھی'' کی تکرار یادداشت کے مختلف دریچوں کو کھولتی ہے:

کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سنوں کی رنگ رلیوں میں
کبھی میلوں میں ناٹک ٹولیوں میں ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گم تتلیوں کے سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں جلتی ریت یخ بستہ ہواؤں میں
(ایک لڑکا)

''اختر الایمان تم ہی ہو'' کا سوال نظم کی مرکزی معنوی گرہ ہے۔ اس میں صرف شناخت کی تصدیق مطلوب نہیں، بلکہ ماضی اور حال کے درمیان پیدا ہونے والے فاصلے کا حساب بھی پوشیدہ ہے۔ لڑکا گویا شاعر سے پوچھ رہا ہے کہ کیا موجودہ شخصیت واقعی اسی شخص کی توسیع ہے جس کے اندر کبھی آزادی، بیباکی اور تبدیلی کی آرزو موجود تھی؟ اس اعتبار سے نظم کا بیانیہ خود احتسابی کی ایک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ''ایک لڑکا'' میں شاعر اپنے ماضی کے کردار کو دفن کر دینے کا دعویٰ کرتا ہے:

میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاک عالم پھونک ڈالے گا

لیکن نظم کا اختتام اس دعوے کو قطعی نہیں رہنے دیتا:

یہ لڑکا مسکراتا ہے یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں

اس نظم کے بارے میں شمیم حنفی لکھتے ہیں کہ:

''یہ لڑکا سرد مہر فضا میں زندگی کی حرارت، توانائی اور مہم جوئی کی علامت بن کر مہذب انسان کے اجتماعی زوال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔''5

نظم ''ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر'' میں حافظہ تقسیم ہند کے تاریخی تجربے تک لے جاتا ہے۔ نظم میں ایک معمولی سا سوال ماضی کی ایک پوری دنیا کو متحرک کر دیتا ہے:

کون سا اسٹیشن ہے؟
ڈاسنہ ہے صاحب جی

اس کے بعد نظم کا مکالماتی بیانیہ بدلتی ہوئی بستی کے تناظر میں آگے بڑھتا ہے۔ ماضی کی آبادی اور موجودہ تجارتی صورتِ حال کے درمیان فاصلہ اس مکالمے میں نمایاں ہوتا ہے:

اس حقیر بستی میں
کون آ کے رہتا تھا
لیکن اب یہی بستی
بمبئی ہے دلّی ہے

نظم کے آخری حصے کو ملاحظہ کیجیے جو تقسیم کے تجربے سے مربوط اور تقسیم کے نتیجے میں بکھرنے والی زندگی اور ٹوٹنے والے تہذیبی روابط کا نوحہ ہے۔

ملک کا یہ بٹوارا
لے گیا کہاں اس کو

''ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر'' میں یہ مکالماتی اور زمانی شعریات اس معمولی خارجی واقعے کو اس طرح تہہ دار بناتی ہے کہ اسٹیشن جغرافیائی مقام نہ رہ کر حافظے کے ایک ایسے دروازے میں تبدیل ہو جاتا ہے جس سے ماضی حال میں داخل ہوتا ہے۔ سفر آگے کی طرف مگر شعور پیچھے کی طرف، جسم زمانی طور پر مستقبل کی سمت جب کہ حافظہ اسے اس مقام پر واپس لے جاتا ہے جہاں کچھ بھی وقوع پذیر ہوا تھا۔ یہی داخلی اور خارجی حرکت کا تضاد نظم کو اس کی ڈرامائی معنویت عطا کرتا ہے۔ اختر الایمان کے یہاں منظر نامہ بھی اسی مکالماتی نظام کا ایک فعال جزو ہے۔ اسٹیشن، راستہ، مکان، مسجد، گلی یا کوئی معمولی منظر اپنی خارجی ہیئت سے تجاوز کر کے انسانی شعور کے داخلی نقشے میں شامل ہو جاتا ہے۔ اختر الایمان کے شعری نظام میں مکان اور زمان ایک دوسرے سے الگ تصورات نہیں رہتے، مکان زمانے کو محفوظ کرتا ہے اور زمانہ مکان کو معنی عطا کرتا ہے۔ ''آخری ملاقات''

میں یہی شعری منطق کا تجربہ ایک پیچیدہ صورت اختیار کرتا ہے۔ یہاں محبت اور اس کی فنا، ماضی اور حال، قربت اور فاصلے کے درمیان ایک ایسا کشمکش آمیز تعلق ہے جس میں لفظ اپنے ظاہر سے زیادہ اپنے باطن میں معنی پیدا کرتے ہیں۔ ''جشنِ مرگِ محبت'' جیسی ترکیب میں معنوی تضاد اس داخلی شکست کی علامت ہے جہاں ایک تعلق کے خاتمے کو ماتم کے بجائے جشن کے استعارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ نظم کا مرکزی مصرعہ ہے:

آؤ کہ جشن مرگ محبت منائیں ہم!

یہاں محبت کی موت کا اعلان ایک ایسے تعلق کی معنوی تحلیل کا اظہار ہے جس کی توانائی اور تازگی باقی نہیں رہی۔ شاعر اس صورتِ حال کو یوں بیان کرتا ہے:

آتی نہیں کہیں سے دل زندہ کی صدا
سونے پڑے ہیں کوچہ و بازار عشق کے

اس نظم میں ماضی کی بازیافت کی خواہش موجود ہے، لیکن اختر اس حقیقت سے بھی آگاہ ہے کہ وقت گزرنے کے بعد پرانے تعلقات اپنی اصل صورت میں بحال نہیں ہو سکتے:

سوچا نہ تھا کہ آئے گا یہ دن بھی پھر کبھی
اک بار پھر ملے ہیں، ذرا مسکرا تو لیں!

اختر الایمان کے شعری بیانیے میں شکستہ ساختوں کا تصور مختلف سطحوں پر نمودار ہوتا ہے۔ یہ کبھی محبت کی موت ہے، کبھی ماضی کی گم شدگی، کبھی عمر کے اختتام کا احساس اور کبھی ایک پوری ساخت کے بکھر جانے کی صورت اختیار کرتا ہے۔ نظم ''آمادگی'' میں شکستہ ساخت یا انہدام کو اس منظر نامے کے ذریعے پیش کیا گیا ہے:

ایک اک اینٹ گری پڑی ہے
سب دیواریں کانپ رہی ہیں
ان تھک کوششیں معماروں کی
سر کو تھامے ہانپ رہی ہیں

نظم میں عمارت کی ساخت کے مختلف اجزا کا زوال ایک مسلسل عمل کے طور پر سامنے آتا ہے:

موٹے موٹے شہتیروں کا
ریشہ ریشہ چھوٹ گیا ہے
بھاری بھاری جامد پتھر
ایک اک کر کے ٹوٹ گیا ہے
لوہے کی زنجیریں گل کر
اب ہمت ہی چھوڑ چکی ہیں

نظم کا اختتام اس بکھراؤ کو انسانی تعلق کے امکان سے مربوط کرتا ہے:

سب کچھ ڈھیر ہے اب مٹی کا
تصویریں وہ دل کش نقشے
پہچانو تو رو دو گی تم

یہی شکستہ بیانیہ دوسری نظموں میں مختلف صورتوں میں بھی ملتا ہے۔ ''آخری ملاقات'' میں محبت کی روایت شکستہ ہے، ''ایک لڑکا'' میں ماضی کا شعلہ مردہ قرار دیا جاتا ہے، ''ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر'' میں ایک تہذیبی دنیا گم ہو چکی ہے۔ نظم ''موت'' میں احساس کی زنجیر ٹوٹنے، فریاد کے ابھرنے اور مایوسی کے چراغ کے ٹمٹمانے کی تصویریں ایک اضطرابی فضا تشکیل دیتی ہیں:

> **اردو شاعری کی ایک طویل روایت میں شعری زبان کی شناخت اکثر لغوی ندرت، استعاراتی تزئین، صوتی تناسب اور مخصوص طرزِ بیان کے ذریعے قائم کی جاتی رہی ہے، اختر الایمان اس روایت کو یکسر منسوخ کیے بغیر اس کے شعریاتی مفروضات پر نظرِ ثانی کی گنجائش پیدا کرتے ہیں۔**

ان نظموں کے باہمی مطالعے سے اختر الایمان کے شعری بیانیے کی وہ فکری جہات سامنے آتی ہیں جن میں فرد، معاشرہ، تاریخ اور وقت ایک دوسرے کے معنی متعین کرتے ہیں۔ ان کا شعری بیانیہ وجودی تشکیک، تاریخی آگہی اور تہذیبی محاکے کا مرکب ہے۔ اسی تناظر میں نظم ''کاوش'' میں زمانی شعور اور انسانی امکانات کی محدودیت، ''فیصلہ'' میں احساس سے گریز کی نفسیات، ''متاعِ رائیگاں'' میں اجتماعی شعور کا بحران، ''قلوبطرہ'' میں تاریخی و تہذیبی زوال، ''اتفاق'' میں تعلقات کی اتفاقی بازیافت، ''زندگی کے دروازے پر'' میں اجتماعی جمود اور ''اظہار'' میں داخلی احساس جیسے مسائل زیرِ بحث آتے ہیں۔ ان کے شعری بیانیہ میں وقت واقعات کی ترتیب یا عمر کے گزرنے کا پیمانہ نہیں ہے بلکہ انسانی امکانات کو محدود اور اس کی معنویت کو متغیر کرنے والی قوت ہے۔ نظم ''کاوش'' میں یہ کیفیت براہِ راست بیان ہوئی ہے:

نیا دن روز مجھ کو کتنا پیچھے پھینک دیتا ہے
یہ آج اندازہ ہوتا ہے کہ میں آہستہ آہستہ
ہزاروں میل کی دوری پہ تم سے آ گیا اور اب
دنوں سالوں مہینوں کو اکٹھا کر کے گم گشتہ
دیار میں بیٹھا ہوں نہ کچھ آگے نہ کچھ پیچھے

(کاوش)

جدید انسانی تجربے کا ایک بنیادی تضاد یہ ہے کہ شعور فرد کو اپنی صورتِ حال کا ادراک بھی عطا کرتا ہے اور اسی ادراک کی شدت اسے اس سے گریز پر بھی آمادہ کرتی ہے۔ اختر الایمان کی نظم ''فیصلہ'' میں احساس کو زائل کرنے کی خواہش اسی تضاد کی شعری تشکیل ہے۔ یہاں احساس سے نجات کسی حقیقی مسئلے کے حل کے بجائے داخلی کشمکش کو معطل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کر دوں
اپنے شوریدہ ارادے کو اپاہج کر لوں
اپنی مجروح تمنا کا مداوا نہ کروں
اپنی خوابیدہ محبت کا المناک مآل
اپنی بے خواب جوانی کو سنایا نہ کروں
اپنے بے کیف تصور کے سہارے کے لیے
ایک بھی شمع سر راہ جلایا نہ کروں

اختر الایمان کی نظم ''قلوبطرہ'' میں تاریخی و تہذیبی زوال کا بیان ایک ایسے شعری منظر نامے میں تشکیل پاتا ہے جس میں حسن، اقتدار، عشرت اور فنا کے عناصر باہم پیوست ہیں۔ نظم کے آخری حصے میں شاعر کا خطاب تاریخی کردار اور اس کی صورتِ حال کو ایک وسیع تر زوال کے تناظر میں پیش کرتا ہے:

عشرت پرویز میں کیا نالہ ہائے تیز تیز
اڑ گیا دن کی جوانی کا خمار
شام کے چہرے پہ لوٹ آیا نکھار
ہو چکے ہیں ہو رہے ہیں اور دامن داغدار
اس کا زریں تخت سیمیں جسم ہے آنکھوں سے دور
جام زہر آلود سے اٹھتے ہیں جھاگ
چونک کر انگڑائیاں لیتے ہیں ناگ
جاگ انطونی محبت سو رہی ہے جاگ جاگ

(قلوبطرہ)

جدید شہری اور سماجی زندگی میں انسانی تعلقات کی کمزوری اختر الایمان کی شاعری کا ایک نمایاں موضوع ہے۔ نظم ''اتفاق'' میں اجنبیت اور تعلق کی آرزو ایک ایسی

صورت میں سامنے آتی ہے جس میں ملاقات کسی طے شدہ منصوبے یا سماجی رسم کے بجائے اتفاق پر منحصر ہے:

دیار غیر میں کوئی جہاں نہ اپنا ہو
شدید کرب کی گھڑیاں گزار چکنے پر
کچھ اتفاق ہو ایسا کہ ایک شام کہیں
کسی اک ایسی جگہ سے ہو یونہی میرا گزر
جہاں ہجوم گریزاں میں تم نظر آجاؤ
اور ایک ایک کو حیرت سے دیکھتا رہ جائے!

(اتفاق)

اختر الایمان کی شاعری میں احساس اور اظہار کے درمیان تعلق ایک بنیادی فنی و فکری مسئلہ ہے۔ انسانی تجربہ ہمیشہ مکمل طور پر زبان میں منتقل نہیں ہو پاتا، بعض کیفیات داخلی شعور میں موجود رہتی ہیں، مگر نہ پوری طرح لفظ بنتی ہیں اور نہ کسی خارجی عمل میں ڈھلتی ہیں۔ نظم ''اظہار'' میں اسی نامکمل اظہار کی صورت سامنے آتی ہے:

دبی ہوئی ہے مرے لبوں میں کہیں پہ وہ آہ بھی جواب تک
نہ شعلہ بن کے بھڑک سکی ہے نہ اشک بے سود بن کے نکلی
گھٹی ہوئی ہے نفس کی حد میں جلا دیا جو جلا سکی ہے
نہ شمع بن کر پگھل سکی ہے نہ آج تک دود بن کے نکلی

(اظہار)

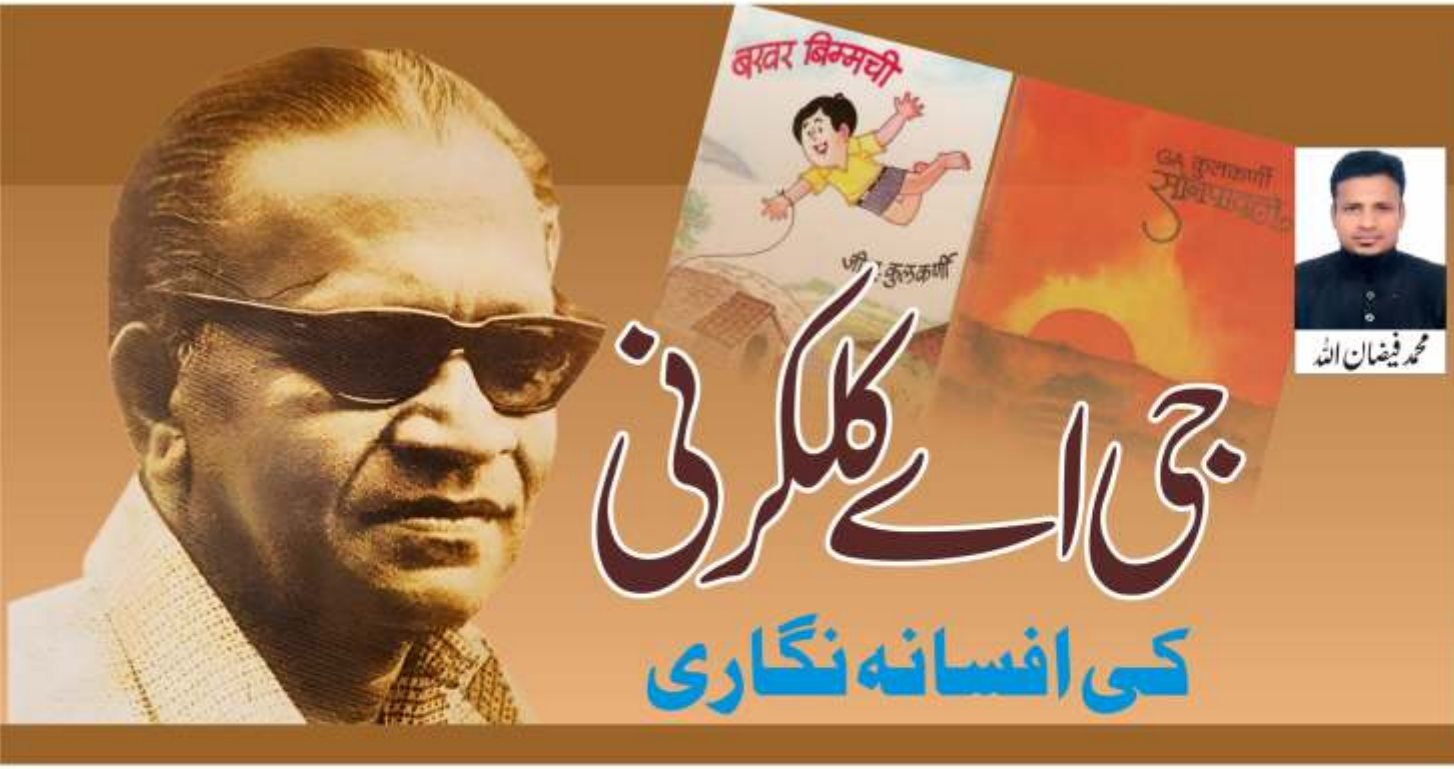
ان نظموں میں فرد نہ مکمل طور پر خود مختار ہے اور نہ محض خارجی حالات کا بے اختیار تابع۔ ان کی نظموں میں فرد کی داخلی شکست، بے حسی، معاشی جبر، جذباتی اقدار کی فرسودگی، حافظے کی اذیت اور مستقبل کے امکانات کی تحدید الگ الگ موضوعات کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ایک ایسے مربوط فکری نظام کی تشکیل کرتے ہیں جس میں انسان اپنی ذات اور اپنے عہد، دونوں کے سامنے جواب دہ ہے۔ نظم ''ایک لڑکا'' میں ماضی اور حال کے مابین قائم مکالمہ، ''آخری ملاقات'' میں محبت کی معنوی شکست، ''ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر'' میں تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تہذیبی گم شدگی، ''متاع رائیگاں'' میں اجتماعی بصیرت کا بحران، ''زندگی کے دروازے پر'' میں جمود اور حرکت کی متضاد کیفیات، ''راہ فرار'' میں تاریخی شعور سے گریز، اور ''کاوش'' و ''بے تعلقی'' میں وقت کے بدلتے ہوئے ادراک کی صورتیں، اسی وسیع تر شعری کائنات کے مختلف مظاہر ہیں۔ ان نظموں میں زندگی کی تفہیم کسی مجرد فلسفیانہ دعوے کے ذریعے نہیں، بلکہ تجربے کی داخلی پیچیدگی اور اس کے تضادات کے انکشاف سے ممکن ہوتی ہے۔ اختر الایمان کے شعری شعور کا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسانی صورتِ حال کو نہ رومانوی تسکین میں تحلیل کرتے ہیں اور نہ اسے مایوسی کے کسی قطعی فیصلے کے حوالے کرتے ہیں۔ ان کے یہاں شکست اپنی معنویت رکھتی ہے، مگر وہ زندگی کی آخری تعبیر نہیں بنتی، اسی طرح آرزو کی بقا بھی کسی غیر مشروط امید کا نام نہیں، بلکہ ایک ایسے شعور کی علامت ہے جو ناکامی، محرومی اور تاریخی جبر کے باوجود سوال کرنے کی صلاحیت محفوظ رکھتی ہے۔ اختر الایمان کی شاعری میں بقا اور زوال، آگہی اور فرار، آرزو اور انحطاط ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک ہی وجودی تجربے کے اجزا بن جاتے ہیں۔ اختر کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ فکری پیچیدگی کو مجرد خطابت کے بجائے مکالمے، علامت، بیانیہ، روزمرہ تجربے اور معنوی تکرار کے ذریعے شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کردار فکری موقف کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں، مناظر تاریخی اور نفسیاتی معنویت کے حامل ہو جاتے ہیں اور علامتیں کسی ایک متعین مفہوم میں محدود ہونے کے بجائے نظم کے مجموعی سیاق میں اپنے معنی پیدا کرتی ہیں۔ یہی اسلوب ان کی شاعری کو موضوعاتی اہمیت سے بلند کر کے ایک ایسی فکری و جمالیاتی ساخت میں تبدیل کرتا ہے جس میں زندگی کا تجربہ اپنی پیچیدگی سمیت محفوظ رہتا ہے۔ اسلوبیاتی سطح پر اختر الایمان کی اہمیت کا ایک بنیادی حوالہ ان کی زبان ہے، جس میں روزمرہ محاورے، عام گفتگو، غیر آرائشی جملوں اور بظاہر نثری ساختوں کو غیر معمولی شعری امکانات حاصل ہوتے ہیں۔ اردو شاعری کی ایک طویل روایت میں شعری زبان کی شناخت اکثر لغوی ندرت، استعاراتی تزئین، صوتی تناسب اور مخصوص طرزِ بیان کے ذریعے قائم کی جاتی رہی ہے، اختر الایمان اس روایت کو یکسر منسوخ کیے بغیر اس کے شعریاتی مفروضات پر نظرِ ثانی کی گنجائش پیدا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں لفظ کی شعریت ہمیشہ اس کی لغوی آرائش سے متعین نہیں ہوتی، بلکہ اس مقام سے متعین ہوتی ہے جہاں لفظ کسی تجربے کی داخلی ساخت کے ساتھ اس طرح مربوط ہو جاتا ہے کہ اس کی عام معنویت ایک نئی ادراکی جہت اختیار کر لیتی ہے۔ ان کی نظم میں ایک سادہ سوال، روزمرہ کا کوئی فقرہ یا گفتگو کا کوئی غیر رسمی انداز اس لیے شعری نہیں کہ اسے مصرعوں میں رکھ دیا گیا ہے، بلکہ اس کی شعری حیثیت اس بیانیاتی سیاق سے پیدا ہوتی ہے جو اس لفظ کو ایک خاص زمانی، نفسیاتی اور جذباتی تناؤ میں داخل کرتا ہے۔ اختر الایمان کی زبان کو سادگی کی زبان کہہ کر محدود کر دینا صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ یہ ایک ایسی سادگی ہے جس کے پس پشت انتخاب، حذف، توقف، معنوی انعطاف اور تجربے کی پیچیدہ تنظیم کارفرما ہے۔ بڑی شاعری زبان کو غیر مانوس بنانے سے نہیں، مانوس زبان کے اندر پوشیدہ نامانوس حقیقت کو آشکار کرنے سے جنم لیتی ہے۔ اختر الایمان زبان کو اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں لفظ اپنی آرائشی حیثیت کھو کر تجربے کی حرارت حاصل کر لیتا ہے۔ ان کے یہاں شعر کی موسیقیت صرف عروضی ترتیب سے نہیں پیدا ہوتی، کبھی واقعے کی رفتار، کبھی مکالمے کا توقف، کبھی جملے کی شکست اور کبھی خاموشی کے وقفے خود ایک غیر مرئی آہنگ تشکیل دیتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے بقول:

''لہجے کے حاکمانہ رنگ کی صلاحیت، مصرعوں کے دروبست ان کے توازن، لفظیات میں تکلف کی جگہ تقریباً شاہانہ بے پروائی اور معاصر دنیا کی خامی و خام کاری پر احتجاج اور برہمی، ان سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ 75 برس کی عمر میں بھی اختر الایمان کی شاعری نہ صرف یہ کہ زوال آمادہ نہیں ہے بلکہ اس میں ایک نئی قوت کا امکان پیدا ہو رہا ہے۔''[6]

حواشی:

1 ڈاکٹر محمد فروز: اختر الایمان: مقام و مرتبہ (منتخب تنقیدی مضامین اور نمائندہ نظمیں)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص29
2 عقیل احمد صدیقی: جدید اردو نظم: نظریہ اور عمل، ملتان بیکن ہاؤس بکس، 2014، ص221
3 کلیات اختر الایمان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2000، ص460
4 ڈاکٹر محمد فروز: اختر الایمان: مقام و مرتبہ (منتخب تنقیدی مضامین اور نمائندہ نظمیں)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص29
5 شمیم حنفی: نئی شعری روایت، دہلی، مکتبہ جامعہ، 1987، ص110
6 بحوالہ شاہد ماہلی (مرتب): اختر الایمان: عکس اور جہتیں، معیار پبلی کیشنز، دہلی، 2000، ص156

Dr. Liaqat Ali
Asst.Professor, Urdu
School of Humanities, IGNOU, Maidan Garhi, New Delhi-110068
Email: liaqatali@ignou.ac.in
Mob.:+91-7051446156



محمد فیضان اللہ

جی اے کلکرنی
کی افسانہ نگاری

بیسوی صدی کے نصف آخر میں جی اے کلکرنی (1923-1987) کی شناخت مراٹھی ادب میں ایک ممتاز اور صاحب اسلوب کہانی کار کی حیثیت سے قائم ہوئی، ان کی کہانیوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف زندگی کے روز مرہ احوال و کوائف کو ہی بیان نہیں کرتیں بلکہ انسانی وجود، تقدیر، مذہب، اقتدار، خوف، تنہائی، ناانصافی اور سماجی جبر و زیادتی جیسے بنیادی امور کو بھی اساطیری اور علامتی لبادے میں بیان کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں داستانوں کی سی فضا، ماورائی عناصر، مذہبی شناخت اور ہندو مذہب کے اساطیر کے علاوہ یونانی و افریقی اساطیر و ماحول بھی ملتے ہیں جو محض تزئینِ کلام کا آلہ ہی نہیں بنتے بلکہ انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل کی تفہیم کا وسیلہ بھی بنتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سلام بن رزاق نے مراٹھی کہانی کاروں میں جی اے کلکرنی کو "میرِ کارواں"[1] کا خطاب دیا ہے۔

کلکرنی کی کہانیوں کے اسلوب و مزاج کی تفہیم کے لیے ان کی مختلف کہانیوں کے حوالے سے گفتگو کرنا زیادہ مفید معلوم ہوتا ہے۔

یہاں ان کے سرفہرست اساطیری و مذہبی عناصر پر مشتمل کہانیوں پر خامہ فرسائی کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کا غالب رجحان اسی سمت رہا ہے، ان کی وہ کہانیاں جن میں مذکورہ خصوصیات ہی مرکزی نقطے پر مشتمل ہیں، وہ "سادھو"، "پرساد"، "مکتی"، "سوامی" اور "قاصد" ہیں۔ "قاصد" کہانی علامتی، اساطیری اور تہذیبی روایت کی شمولیت سے ایک ایسی دنیا تخلیق کرتی ہے جس میں قدیم ہندوستان، مذہبی اقدار و روایت، سیاسی نظام اور انسانی مفاد باہم متصادم دکھائی دیتے ہیں، رتھ، نیلا شاہی پرچم، راج ہنس، نیلی دھند، پگڈنڈی، مندر، دھرم شاسن، پروہت، بھکشو اور سمراٹ جیسے ہندوستانی عناصر، کہانی میں خالص قدیم ہندوستانی تہذیبی پس منظر کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

"تو پھر غور سے سنو! سمراٹ کا پیغام ایک ڈوم کے بارے میں ہی ہے۔ اُس ڈوم کا نام "کال مکھ" ہے۔ سمراٹ کو شیلیشور مندر میں بشارت ہوئی تھی کہ کال مکھ کو تین دن کے اندر اندر موت کی سزا نہ دی گئی تو پورے ملک پر زبردست آفتیں نازل ہوں گی۔ ملک پر غنیم کا حملہ ہوگا۔ بے گناہوں کا قتل عام ہوگا اور خون کی ندیاں بہیں گی۔ یہاں تک کہ خود سمراٹ بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے۔ سمراٹ نے فی الفور مجھے یہ پیغام دے کر روانہ کیا تھا کہ کال مکھ کی کھال کھینچ کر تمام رعایا کے سامنے اسے کھولتے تیل کے کڑھاؤ میں ڈال دیا جائے۔ آج سورج غروب ہونے سے قبل اس پر عمل ہونا لازم ہے کیوں کہ بشارت کے مطابق آج تیسرا اور آخری دن ہے۔ اب یہ پیغام جوں کا توں رعایا تک پہنچانا تمہارا فرض ہے۔ یاد رکھو اگر اس میں رتی بھر کوتاہی ہوگی تو خود تمہاری کھال کھینچی جائے گی اور تم کھولتے تیل کے کڑھاؤ میں ڈبو کر مار ڈالے جاؤ گے کال مکھے کا نام اچھی طرح ذہن نشین کرلو"۔[2]

اس تہذیبی منظرنامے کے پیچھے اصل سوال اقتدار اور سچائی کا ہے۔

اسی رنگ و روپ کی کہانی "سادھو" بھی ہے، ایک عمدہ کہانی ہونے کے علاوہ اس میں مزید مراٹھی دیہی زندگی کے ماحول، فلسفیانہ رنگ اور ماورائی فضا کا بیانیہ بھی ملتا ہے، ایک تھکے ہوئے سادھو کی گاؤں میں آمد اور اس کی مبہم و پراسرار ذات، شروع ہی سے کہانی کو قدیم عہد میں لے جاتی ہے،

وہ تھکا ماندہ سادھو اس گاؤں میں پہلی بار داخل ہوا تھا۔ مگر اس نے گاؤں کی حدود میں اس اعتماد سے قدم رکھا جیسے گاؤں کے سارے گلی کوچے اس کے دیکھے بھالے ہوں۔

گاؤں کے کنارے بہت ساری عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ جن میں بوڑھی، جوان، بھی شامل تھیں۔ ان مختلف العمر عورتوں پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک گیا زمانہ حال کی لمحہ بدلتی بساط پر جینے والے ان بے بضاعت لوگوں پر اسے بڑا ترس آیا۔ ان میں سے ایک ایک کے مستقبل کا احوال وہ کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتا تھا۔ خصوصاً اُس کی نگاہیں اُس دوشیزہ پر جم کر رہ گئیں جو کنویں کی مینڈھ پر جھکی ڈول سے پانی کھینچ رہی تھی۔ اس کے جھلمل کرتے لباس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک نو بیاہتا دلہن ہے۔

سادھو کے دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا چہرہ مسخ ہوگیا اور ہلدی کی گانٹھ جیسا پُرکشش بدن مردہ ڈھور کی مانند پھولنے لگا۔ سادھو نے گھبرا کر چہرہ دوسری جانب پھیر لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں ایک راہ گیر سے بولا" اس لڑکی کو دیکھتے ہو وہ ابھی کنویں میں ڈوب کر مر جائے گی۔ "۔۔۔۔۔" وہاں جو کچھ ہونا تھا اُس نے اپنی نگاہ

پیش بین سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔''[3]

اس طرح کی دوسری پیش گوئیاں بھی کہانی میں موجود ہیں جس سے ہندوستانی سماج میں بھوشیہ وانی کی اہمیت کا پتا ملتا ہے۔

اس کہانی میں ہندوستانی رزمیہ روایت، بالخصوص ''رامائن'' اور ''مہابھارت'' کے واقعات کی تلمیحات کا اشارہ ملتا ہے جس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسان اپنی اتھاہ کوشش کے باوجود تقدیر کے پیچیدہ جال سے نجات نہیں پا سکتا۔ چونکہ شروع میں ہی کلکرنی کے غالب رجحان و موضوع اور اسلوب کے تعلق سے یہ بات علم میں آ چکی ہے کہ وہ تقدیر، کرما، اور اساطیر کے گرد ہی کہانی کو بنتے ہیں۔

''مکتی'' کہانی بھی اسی طرز و اسلوب اور اساطیری عناصر پر مشتمل ہے، اس میں بھی بقیہ کہانیوں کی طرح ہندوستانی میتھولوجی کا ریپٹیشن تو ہے لیکن اس کا تخلیقی استعمال بڑی جدت سے کیا گیا ہے، کہانی میں مذکور کردار کو ''مہابھارت'' کے ''ایکلویہ'' کے کردار اور اس سے وابستہ تہذیبی روایت کو جدید انسانی لبادے میں پیش کیا گیا ہے، بس یہاں کرداروں کے نام ''شیوانگ'' اور ''بیراگی'' ہیں دونوں ہی مکتی کے متلاشی ہیں، شیوانگ کا کردار ایکلویہ کا مرکزی استعارہ ہے جو اپنی لیاقت و صلاحیت کے باوجود سماجی تعصب کا شکار ہے، اس کی تیر زنی میں دسترس اس کی ناموری اور عزت کا سبب بننے کے بجائے ''شراپ'' کا سبب بنتی ہے جس سے وہ جسمانی و روحانی اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس کے بالمقابل ''بیراگی'' بھی نجات کا خواہاں ہے مگر اس کا طریقہ کار مختلف ہے یوں دونوں کرداروں کی تلاش الگ الگ راستوں سے گزرتی ہوئی ایک ہی نقطہ پر پہنچتی ہے کہ، حقیقی مکتی کیا ہے؟ شیوانگ کی ماں کا آگ میں کود جانا ماں کی ممتا، سماجی ناانصافی اور نسلی وطبقاتی تعصب کے خلاف ایک شدید احتجاجی و علامتی عمل ہے گو اس کہانی میں کلکرنی قدیم اساطیر کو استعمال میں لا کر اپنے عہد میں انسانی حقوق اور سماجی انصاف کے لیے آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔

کلکرنی کی ''سوامی'' اور ''پرساد'' کہانی بھی اسی طرز کے اساطیری و مذہبی پیکر میں ملبوس ہے بس فرق یہ ہے کہ یہاں مذہبی پاکھنڈ اور تقدیر کے سامنے انسانی بے بسی کو بیان کیا گیا ہے، ''سوامی'' میں ڈھلتے سورج کا منظر اور آبائی گاؤں میں راوی کی اجنبیت اس تہذیبی زوال کا بیانیہ ہے جس میں نئے دور کا انسان ایسی زندگی گزار رہا ہے جہاں وہ اپنی جڑوں سے دور ہوتا جا رہا ہے، کہانی میں مٹھ کو مذہبی مرکزیت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ معاشی و سماجی طاقت بھی حاصل ہے۔ کہانی کے اختتام میں روشنی کا بجھ جانا اور راوی کا زیرِ زمین مندر میں دھکیل دیا جانا مذہبی اقتدار کے تاریک پہلو کا پتا دیتا ہے جب کہ ''پرساد'' کہانی کے کام سے ہی مذہبی رنگ نمایاں ہوتا ہے اور یہاں بھی بقیہ کہانیوں کی طرح مذہبی رنگ موجود ہے، مرکزی کردار پرساد کی غرض سے گاؤں میں داخل ہوتا ہے، پرساد جو عام طور پر برکت اور تقدس کی علامت ہوتا ہے، وہی پرساد کلکرنی کی کہانی میں پراسرار آزمائش کا پیش خیمہ ہے، مرکزی کردار کے پاؤں کا بے جان ہو جانا اسی مذکورہ تصور کا اعادہ ہے کہ انسان تقدیر کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔

اب تک یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کلکرنی تقدیر پر مبنی تصور کو کسی نہ کسی صورت کو مانتے ہی نہیں بلکہ وہی تصور ان کی دیگر کہانیوں ''طواف''، ''کیری''، ''باولا''، ''اہنکار'' میں بھی الگ الگ صورت میں موجود ہے لیکن ان کی یہ کہانیاں سابقہ کہانیوں سے ذرا مختلف ہے کیوں کہ ان میں مذہب، مندر اور اساطیر کے بجائے عام انسانی زندگی کو کہانی کا مرکزی موضوع بنایا گیا ہے، ان کہانیوں میں گھر، خاندان، سماجی رسوم اور سماجی رشتے مرکزی موضوع ہیں۔ ''طواف'' میں ''دادا صاحب'' کی موت کے بعد خاندان میں انتشار و بدنظمی پیدا ہو جاتی ہے، ''شانتکا'' کا کردار ہندوستانی عورتوں کی جدوجہد، ازدواجی مشکلات اور سماجی ناقدری کا مظہر ہے۔ یوں ''طواف'' میں مذہب صرف عبادت کا ہی درس نہیں دیتا بلکہ انسانی زندگی، خاندانی نظام، معاشرتی تعلقات اور اخلاقی رویوں کو بھی عبادت گردانتا ہے، کہانی میں موجود مورتی پوجا، پھول چڑھانا، تلسی کے پتے توڑنا اور بتی جلانا وغیرہ اوصاف مراٹھی ہندو گھرانے کے مذہبی ماحول سے آگاہ کراتے ہیں۔ اور ''کیری'' میں کلکرنی کا تہذیبی بیانیہ مزید دلچسپ ہو جاتا ہے یہاں دیہی معاشرے کے نچلے طبقے کی انسانی زندگی کے مصائب و آلام کا مشاہدہ ملتا ہے، اس میں کلکرنی نے غریب طبقے کی تنگی، عورت کے ساتھ ناانصافی، ازدواجی رشتوں کی ناقدری اور خود داری جیسے زندگی کے اہم موضوعات پر روشنی ڈالی ہے، بنا بٹن کی قمیص، جلی ہوئی راکھ، دھوئیں سے بھرا چولہا، پرانا سیتا پھل کا درخت، خاردار جھاڑیاں، منگل سوتر، تلسی کے پتے، دودھ بھات، کنواں، مور، درخت، دھنگروں کی جھونپڑیاں اور کمہار واڑہ جیسے عناصر اس کہانی کو مخصوص مراٹھی دیہی تہذیب سے جوڑتے ہیں، یہاں تہذیب صرف مذہبی امور میں نہیں بلکہ لباس، خوراک، رہن سہن، پیشوں اور سماجی طبقاتی تقسیم میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ''تانی ماؤسی'' جو کہانی کا مرکزی کردار ہے ظلم اور محرومی کے باوجود اپنی عزتِ نفس برقرار رکھتی ہے، ''میں نے اتنے دن برداشت کیا لیکن آج حد ہو گئی۔ اب اس گھر میں یا تو میں رہوں گی یا وہ رانڈر رہے گی''۔[4]

''بھاؤ راؤ'' کی بے وفائی اور خاندان کے نازیبا رویے عورت کے تئیں سماج میں ہونے والے ظلم اور ناقدری کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح کے عناصر ''باؤلا'' اور ''اہنکار'' بھی ہیں جس میں انسان دوستی، سماجی زندگی، فطرت نگاری اور تقدیر کے باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔

کلکرنی کی کچھ کہانیوں کا موضوع مختلف ہے جس میں سے ایک ''غلام'' ہے اس میں کلکرنی اپنے معمول سے ہٹ کر ہندوستانی تہذیب سے الگ جغرافیائی اور تہذیبی منظر تخلیق کرتے ہیں، کہانی میں مرکزی کردار مسافر بظاہر ندی کے منبع کی تلاش میں ہے، کہانی میں ''المکتوب مکتوب'' کی تکرار کلکرنی کے اسی نظریے کا ریپٹیشن ہے جس میں انسانی کوشش کو پہلے سے طے شدہ فیصلے کے سامنے بے بس ہونا پڑتا ہے، غلام کا توانا جسم، کٹی ہوئی زبان اور بے جان چہرہ کہانی کے اختتام تک قاری کو باندھے رکھتی ہے، کلکرنی نے اس میں ریگستان، غلاموں کی منڈیاں، حبشی پہرے دار اور سنگِ مرمر کے معابد جیسے مختلف تہذیبی حوالوں کو یکجا کر کے قاری کو عربی افریقی دنیا میں داخل کر دیا ہے۔

ایمرا غلام کو لیے باہر آیا۔ غلام کے بدن پر چابک کے نشان تھے جو اب دھندلے پڑ گئے تھے اور اس کے سینے پر داغنے کا نشان تھا۔ جس کی شکل ہلال کی سی تھی۔ لیکن غلام کا چہرہ بے جان تھا۔ جیسے ابھی اُس میں خون اور جان ڈالنا باقی ہو۔

ہاں ایک بات ایمرا پوچھ رہا تھا۔ ''تمہیں غلام کو برتنے کا تجربہ تو ہے نا؟''

اُس سوال کو سنتے ہی مسافر کے جیسے تن بدن میں چنگاریاں بھر گئیں۔ اُس نے تیزی سے اپنی چھاتی کے

بٹن کھول دیے اس کے سینے پر ایک موٹا چمکیلا نشان تھا۔ چاقو سے لمبا گہرا زخم لگانے کے بعد اُس میں روزانہ خشک مٹی بھرتے رہیں تو موٹی رسی کی مانند ایسا اُبھرا ہوا نشان بن جاتا ہے۔ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی اُس نا قابل برداشت تکلیف کو یاد کر کے مسافر کانپ اٹھا۔ اُس نے اپنا بایاں پنجہ ایمرا کو دکھایا جس کی تین انگلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔

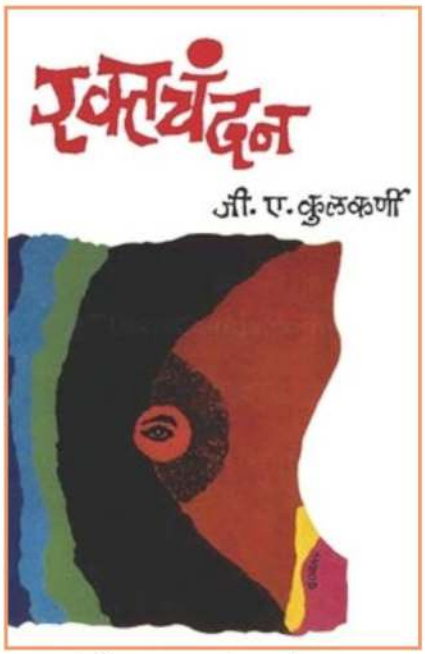
''غلام سے کیسا سلوک کیا جاتا ہے اس کا مجھے خوب تجربہ ہے۔ میں خود ایک خانہ بدوش جماعت کا غلام رہا ہوں۔ اس نے نہایت تلخی سے کہا۔ اس کے علاوہ میرے ساتھ میرا ایک رفیق بھی ہے۔ ایک بار اُس نے ایک بلبلاتے اونٹ کی گردن اپنی بغل میں دبا کر اُسے زمین بوس کر دیا تھا لہذا اس بابت تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''5

کلکرنی اپنی کہانی کے ڈکشن کو مزید وسعت دیتے ہوے ہندوستانی اور افریقی اساطیر وتہذیبی روایت سے آگے جا کر یونانی اساطیر کو بھی اپنی کہانیوں میں پیش کرتے ہیں۔ ''پرامتھیوس'' اور ''آرفی لیس'' اس کی شاندار مثال ہے، جس میں انہوں نے یونانی اساطیر کو مراٹھی تہذیب اور فکری جہات سے آراستہ کر کے کہانی میں نئے معنی پیدا کر دیے ہیں، ان کہانیوں میں اساطیری کردار محض ماضی کے دیومالائی کردار نہیں رہتے بلکہ انسانی وجود، محبت، فن، تقدیر اور داخلی کرب کی علامت بن کر ابھر آتے ہیں،'' پرامتھیوس'' میں دیومالائی روایت کے مطابق انسان کو آگ فراہم کرنے والا کردار جدید معنی اختیار کر لیتا ہے، آگ یہاں علم، شعور اور آزادی کی علامت بن جاتی ہے جس سے پرامیتھوس انسان کو جہالت سے نکال کر علم کی روشنی عطا کرتا ہے، لیکن ان تمام مادی اور علمی حصول کے بعد بھی انسان اپنی داخلی تنہائی سے مکمل طور پر نجات حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔

پرامتھیوس آگ لیے ہوئے زمین پر ایک سورج کی مانند طلوع ہوا جس نے مجبور اور بے بس انسانوں کی راتیں بھی روشن کر دیں۔ وہ جوں ہی آگ لیے ہوئے زمین پر اترا تاریکی سے بے شمار احسان مند، بے بس اور لاچار ہاتھ آگے بڑھے۔ اندھیرے میں شکر گزاری کے کلمات گونجے اور ان الفاظ کی لرزش سے رات کا عملی پردہ تھرتھرانے لگا۔

پرامتھیوس کا دل جوش مسرت سے بھر گیا۔

لیکن اُس مسرت کے لمحے میں بھی اُسے وہ فاقہ زدہ گدھ اچھی طرح یاد تھا جو اُس ویران بلند پہاڑی کی وادی میں دوسرے مردار خور گدھوں سے الگ، کا وتنہا بیٹھا تھا۔6 غرضیکہ کہ کلکرنی قدیم یونانی اساطر کا استعمال کر کے جدید انسان کے روحانی بحران کو بیان کرتے ہیں، یہ کہانی سوال بھی پیدا کرتی ہے کہ کیا علم اور مادی ترقی انسانی وجود کو سکون فراہم کرتی ہے؟



وہیں دوسری کہانی ''آرفی لیس'' میں یوریڈائس کی موت کے بعد آرفی لیس اپنی موسیقی کی قوت سے عالمِ اموات تک پہنچتا ہے، اس کی موسیقی ایسی روحانی تاثیر رکھتی ہے کہ پاتال کی طاقتیں بھی اس سے متاثر ہوتی ہیں لیکن یوریڈائس کو واپس لانے کی شرط کہ'' وہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھے''، انسانی کمزوری اور بے صبری کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ آرفی لیس کا مڑ کر دیکھ لینا یہ دکھلاتا ہے کہ انسان تقدیر کے سامنے کتنا بے بس وہ بے سہارا ہے۔

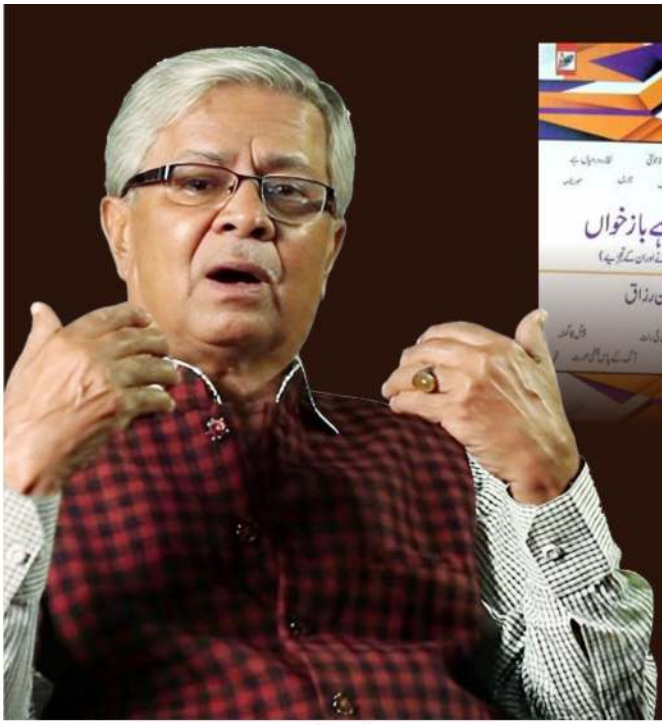
''پھر دیوتا آرفی لیس سے مخاطب ہوا۔'' آرفی لیس! تم واقعی خوش قسمت ہو۔ دیوی کی سفارش کے مد نظر جو آج تک نہیں ہوا وہ ہونے جا رہا ہے۔ مگر اسے یاد رکھو یہ ایک استثنائی صورت ہے۔ یوریڈائس تمہارے ساتھ جائے گی مگر ایک شرط پر'' آرفی لیس سراپا سماعت بنا دیوتا کی آواز سن رہا تھا۔ دیوتا نے آگے کہا۔ جب تک تم دونوں روشنی کی دنیا میں قدم نہیں رکھتے تب تک تم مڑ کر اُسے دیکھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ ورنہ وہ اُسی وقت واپس اس اندھیرے کا لقمہ بن جائے گی۔7

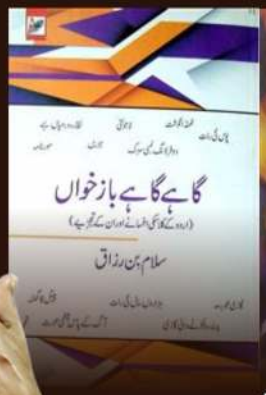
مختصر یہ کہ جی اے کلکرنی کی کہانیوں میں مذکور اساطیر محض ماضی کا استحضار یا مذہبی قصوں کی تکرار نہیں ہیں بلکہ وہ جدید انسانی زندگی کے بنیادی سوالات کی تفہیم کا ایک تخلیقی وسیلہ ہیں کلکرنی کا کمال یہ ہے کہ وہ ہندوستانی دیہی زندگی، مذہبی رسوم، لوک عقائد اور اساطیری روایت کو جدید انسانی مسائل کے ساتھ اس طرح مربوط کر دیتے ہیں کہ ماضی اور حال کے درمیان ایک معنوی رشتہ قائم ہو جاتا ہے، ان کی کہانیوں میں مندر، کنواں، تلسی، مورتی، سادھو، شراپ، آگ، جنگل، دریا اور دھند محض اشیا یا مناظر نہیں رہتے بلکہ انسانی نفسیات، سماجی طاقت، تقدیر اور تہذیبی روایت کی علامت بن جاتے ہیں۔ اسی لیے ان کی کہانیوں کا تہذیبی مطالعہ محض رسم ورواج کو پیش نہیں کرتا بلکہ اس تہذیب کے اندر موجود تضادات، طاقت کے بے جا استعمال اور مذہبی تصورات کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے، ان کی کہانیوں میں انسان مسلسل کسی نامعلوم منزل، نجات یا سچائی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے، مگر ہر قدم پر اسے اپنی حد، تقدیر کے سامنے بے بسی اور تلخ سماجی حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی کشمکش ان کی کہانیوں کو محض داستانوی کہانی نہیں رہنے دیتی بلکہ انہیں انسانی وجود کے مسائل وآلام پر مشتمل فکری تخلیقات میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اپنی کہانیوں میں اساطیری عناصر، تہذیبی شعور اور فلسفیانہ فکر منفرد انداز میں پیش کرنے کے باعث ہی جی۔ اے۔ کلکرنی کا شمار مراٹھی کہانی کاروں کے نمایاں وممتاز شخصیات میں ہوتا ہے۔

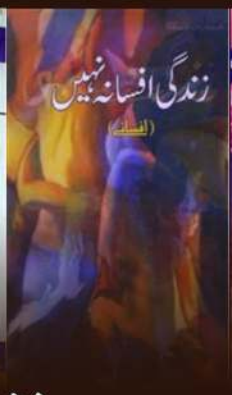
حوالہ:

1 جی اے کلکرنی کی کہانیاں، ص، نمبر 26 مترجم سلام بن رزاق ناشر، رام پنڈت اشاعت اول، 5 200
2 قاصد، ص 36
3 سادھو، ص 40
4 کیری، ص 258
5 غلام، 52
6 پرامتھیوس، ص 152
7 آرفی لیس، ص 161

Mohd Faizanullah
J Block, Building No. J-26, 4th floor Abul Fazal Enclave jamia Nagar New Delhi-110025
Mob. 8090406755
Email: mohdfaizannadwi0@gmail.com









محمد سرفراز

سلام بن رزاق

کی ادبی خدمات

سلام بن رزاق اردو کے ایسے مایہ ناز ادیب ہیں، جن کی تخلیق اور ترجمہ نگاری دونوں کے اعتراف میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ ایک ممتاز فکشن نگار کے ساتھ ساتھ بچوں کے قلمکار، ترجمہ نگار اور فلمی رائٹر بھی ہیں۔ ادبی حلقوں میں بحیثیت افسانہ نگار سلام بن رزاق کا تخلیقی سفر کوئی نصف صدی پر محیط ہے۔

اردو دنیا کے ممتاز افسانہ نگار سلام بن رزاق کی پیدائش 15 نومبر 1941 کو مہاراشٹر کے پنویل میں ہوئی۔ ابھی ان کی عمر صرف چھ برس تھی کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ سلام بن رزاق کی پڑھائی میٹرک (SSC) تک ہی ہو پائی۔ گھریلو حالات اور تنگ دستی کے سبب وہ اپنی پڑھائی مزید جاری نہ رکھ سکے۔

میٹرک پاس ہونے کے بعد وہیں ضلع بورڈ میں دو سال تک بحیثیت ٹیچر خدمات انجام دیں۔ 1963 میں وہ بمبئی آگئے اور بمبئی کے میونسپل کارپوریشن (Muncipal Corporation) کے شعبہ تعلیم میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ 1989 میں ہیڈ ماسٹر ہوکر سبکدوش ہوئے۔ 1999 میں وہ میرا روڈ آئے اور زندگی کے آخری وقت 7 مئی 2024 تک یہیں رہے۔

سلام بن رزاق کی تعلیم و تربیت میں ماں کا اہم رول رہا ہے۔ ان کی علمی و ادبی بنیادیں گھریلو فضا میں استوار ہوئیں۔ ان کی والدہ نہایت دیندار اور اخلاقی اقدار کی پاسدار خاتون تھیں۔ گھر میں ہر جمعرات کو محلے کی خواتین کی مذہبی نشست منعقد ہوتی تھی جس میں اسلامی اور اخلاقی حکایت پر مشتمل کتابیں پڑھ کر ان کی ماں سنایا کرتی تھیں۔ سلام بن رزاق بھی اپنی ماں کے پہلو سے لگ کر قصے سنا کرتے اور بعد میں انھیں قصوں کو نمک مرچ لگا کر اپنے دوستوں کو سنایا کرتے۔ مسلسل سماعت اور تکرار نے ان کے ذہن میں کہانی کی ساخت، کردار اور بیانیہ اسلوب کی ابتدائی سمجھ پیدا کر دی۔ جب وہ نویں جماعت میں تھے تو جماعت کے نصاب میں شامل مراٹھی کے مشہور ادیب وی، سی، کھانڈیکر کی کہانی ''آئی'' (ماں) نے ان پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کہانی میں انھیں اپنی والدہ کی جھلک محسوس ہوئی۔ شاید اسی لیے انھوں نے اس کہانی کا ترجمہ اردو میں کیا، جو روز نامہ ''انقلاب'' کے ادبی صفحہ پر شائع ہوئی۔ یہ فکشن کی ان کی پہلی تحریر تھی۔

سلام بن رزاق نے نویں جماعت تک آتے آتے محرم کی مجلسوں اور وعظ کی محفلوں میں پڑھی جانے نظمیں اور مرثیے بھی لکھنے شروع کر دیے تھے، جو دین دنیا اور آستانہ جیسے مذہبی پرچوں میں شائع ہوئے، جب کہ کچھ نظمیں ''ہماری زبان''، ''بیسویں صدی'' اور ''شمع'' جیسے پرچے و رسائل میں جگہ پاتی رہیں۔ اس زمانے کی ایک نظم جس کا عنوان ''قاتل'' تھا۔ ''ہماری زبان'' میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

ہر تمنا کا گلا گھونٹ دیا ہے میں نے
اپنی ہر خواہش معصوم کا قاتل ہوں میں
ہاتھ آلودہ ہیں آپ اپنے لہو سے میرے
داغ دامن کے نمایاں ہیں ستاروں کی طرح
میں گنہ گار ہوں، قاتل ہوں، اذیت رس ہوں
کون دیکھے مگر اس جرم و گناہ کے پیچھے
کونسی تلخ حقیقت ہے برہنہ اندام
میری ہر خواہش معصوم کا قاتل ہے کون؟

سلام بن رزاق نے تخلیقی سفر کا آغاز شاعری سے کی لیکن ممبئی آنے کے بعد شاعری کرنا بالکل ترک کر دیا۔ اس سے متعلق مراٹھی زبان کے ادیب جینا بڑے نے سلام بن رزاق سے ایک انٹرویو کے دوران سوال کیا:

''سوال: سلام صاحب آپ کی ابتدا شاعری سے ہوئی پھر آپ نثر کی طرف کیسے آگئے؟''

''سلام بن رزاق: نسیم حجازی، صادق حسین سر دھنوی وغیرہ کی کتابیں ہم پڑھتے تھے۔ پھر کسی وقت خیال آیا کہ شاعری میں، میں اپنے خیالات کو جیسا چاہتا تھا ویسا ڈھال نہیں پا رہا ہوں۔ پھر میں نے افسانوں کی طرف اور مرٹھی ترجموں کی طرف توجہ کی اور وہ لکھے گئے، چھپنے لگے اور پسند کیے گئے۔ ریسپانس ملنے لگا تو میں اپنی بات کو زیادہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کرنے لگا۔ شاعری میں نے چھوڑ دی ہے لیکن شاعری میں نے پڑھنا نہیں چھوڑا۔''[1]

سلام بن رزاق نے اپنا پہلا افسانہ ''رین کوٹ'' 1962 میں لکھا، جو رسالہ شاعر (ممبئی) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے یکے بعد دیگرے کئی افسانے تخلیق کیے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے جن میں ''ننگی دوپہر کا سپاہی'' 1977، ''معجر'' 1987، ''شکستہ بتوں کے درمیان'' 2001 اور ''زندگی افسانہ نہیں'' 2012 میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ ''شکستہ بتوں کے درمیان'' کے تخلیقی معیار کو سراہتے ہوئے 2004 میں ساہتیہ اکادمی جیسے باوقار انعام سے نوازا گیا۔ جدیدیت کے بعد ہم عصر افسانے

کی جونئی نسل ہمارے سامنے آتی ہے، اس میں سلام بن رزاق کا نام اہم ہے۔ نفسیاتی سطح پر اپنے کرداروں کے درون میں اترنے کی بے پناہ صلاحیت سلام بن رزاق میں موجود ہے۔ عام آدمی کے حالات و وسائل، جذبات و احساسات اور آرزو اور امنگوں کی حقیقی عکاسی سلام بن رزاق نے اپنے افسانوں میں کی ہے۔ فسادات اور نئے سماجی اور مذہبی تناظر کو بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

سلام بن رزاق نے اردو افسانے کی سنجیدہ اور متوازن روایت کو نئی توانائی عطا کرتے ہوئے اس کی رفتار کو باوقار انداز میں آگے بڑھایا۔ انھوں نے فکری دیانت اور فنی بصیرت کے ساتھ نہ تو ترقی پسند تحریک کی فضا کو قبول کیا اور نہ ہی جدیدیت کے رجحانات کے سحر میں گرفتار ہوئے۔ بلکہ ان دونوں انتہاؤں سے شعوری فاصلہ رکھتے ہوئے انھوں نے اپنی ایک منفرد اور معتدل راہ متعین کی، جہاں زندگی کی سچائیاں بھی موجود ہیں اور فن کی لطافت بھی۔ ان کے افسانوں میں عصری آگہی، فکری گہرائی اور اسلوبی پختگی کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو انھیں اپنے عہد کے نمایاں اور باوقار افسانہ نگاروں کی صف میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے جب ان سے سوال پوچھا:

''آپ ترقی پسند ہیں یا جدیدیت پسند؟''

سلام نے جواب دیا ''ہم نہ ترقی پسند ہیں نہ جدیدیت پسند۔ بس جو سمجھ میں آتا ہے لکھتے رہتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے دوسرا سوال کیا تمہارا امام کون ہے؟ سردار جعفری، شمس الرحمٰن فاروقی یا باقر مہدی؟

سلام نے بڑا نفیس جواب دیا کہ ہمارا کوئی امام نہیں۔ ہم امتِ بے رسول ہیں۔

عینی آپا جواب سن کر بولیں ''گڈ'' اور ہنس پڑیں، اس کے بعد بڑی دیر تک دونوں کے درمیان ''آگ کا دریا'' اور دوسرے ادبی موضوعات پر گفتگو ہوئی''۔[2]

افسانہ نگاری کے علاوہ مراٹھی اور ہندی سے ترجمہ کا کام بھی انھوں نے بہت ہی انہماک سے کیا۔ مراٹھی زبان وادب کے نامور ادیب جی، اے، کلکرنی کے افسانوں کو سلام بن رزاق نے اردو میں ترجمہ کیا جو کہ ''جی، اے، کلکرنی کی کہانیاں'' کے نام سے 2005 میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ مراٹھی کے ناول ''ماہم کی کھاڑی'' اور ہندی کی ''سم سامئک کہانیاں'' کو ''عصری ہندی کہانیاں'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ''سم سامئک کہانیاں'' جس کو دھنجے ورما نے مرتب کیا ہے۔ اس پر 1988 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مراٹھی اور ہندی سے اردو زبان میں کیے گئے تراجم محض لسانی تبدیلی کا عمل نہیں بلکہ تہذیبی، فکری اور ادبی روابط کو مستحکم کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہیں۔ ان تراجم کے ذریعے مختلف زبانوں کے ادب و ثقافت، رسوم و روایات، سماجی مسائل اور فکری رجحانات اردو قارئین تک پہنچتے ہیں، جس سے اردو ادب کے دائرۂ فکر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ خصوصاً مراٹھی اور ہندی ادب میں موجود علاقائی زندگی، عوامی احساسات، دیہی تہذیب اور سماجی حقیقت نگاری جب اردو قالب میں منتقل ہوتی ہے تو اردو ادب نئی معنویت اور تنوع سے آشنا ہوتا ہے۔

سلام بن زاق افسانہ نگار اور ترجمہ نگار کے ساتھ



ساتھ مضمون نگار بھی ہیں۔ ان کے زیادہ تر مضامین ادبی شخصیت پر مبنی ہیں، جو تذکرے کے نام سے 2015 میں نئی دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ کئی مضامین دیگر کتب و رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ سلام بن رزاق نے متعدد ادیبوں اور شاعروں پر مضامین بھی لکھے ہیں جن میں غالب، غیاث احمد گدی، عصمت چغتائی، باقر مہدی، علی سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی اور ساغر سرحدی پر مضامین کافی اہم ہیں۔ مضامین کے مجموعہ ''تذکرے'' کے حوالے سے سلام بن رزاق لکھتے ہیں کہ:

''ان مضامین کو لکھنے اور کتابی شکل دینے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ نوجوان نسل ادب کی ان معتبر ہستیوں کی چند نا تمام جھلکیوں سے ہی سہی آگاہی حاصل کر سکے جنھوں نے اپنے عہد میں شعر و ادب کو نئی بلندیوں سے آشنا کیا تھا''۔[3]

''غالب کے حضور میں'' اس مضمون میں سلام بن رزاق نے غالب کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''غالب کی سیر کیے بغیر اردو ادب کا ہفت خواہ طے نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ غالب کی شاعری میں اردو شاعری کا سارا جوہر سمٹ آیا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر غزل اردو شاعری کی آبرو ہے تو غالب کی شاعری اردو غزل کی آبرو ہے۔''[4]

اسی طرح اپنے مضمون ''ورجینا ولف سے سب ڈرتے ہیں'' میں قرۃ العین حیدر کے بارے میں سلام بن رزاق ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں ان کی پاک باطنی، ان کی نفاست اور طہارت، نیز ادب کے تئیں ان کے شوق ریاضت کے پیش نظر انھیں اردو ادب کی ورجینا وولف کی بجائے رابعہ بصری کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔''[5]

سلام بن رزاق نے افسانہ نگاری، مضمون نگاری، ترجمہ نگاری و دیگر نثری اصناف کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت کا ایک اہم پہلو بچوں کے ادب سے ان کی غیر معمولی وابستگی ہے۔ بچوں کی نفسیات، ان کے جذبات، ذہنی رجحانات و فکری تقاضوں سے ان کی گہری واقفیت نے ان کی تحریروں کو نہایت موثر، دلچسپ اور سبق آموز بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تخلیق کردہ ادب سادہ، سلیس، بامقصد اور بچوں کے معیار کے عین مطابق نظر آتا ہے۔

وہ بچوں کے ادب کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھتے، بلکہ اسے بچوں کی اخلاقی، ذہنی اور فکری تربیت کا اہم وسیلہ تصور کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں اصلاحی پہلو نمایاں ہوتا ہے، تاہم اس میں کہیں بھی وعظ یا تصنع کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ کہانی، کردار اور واقعات کے ذریعے وہ بچوں کے ذہن و دل پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

انھوں نے ایک انٹرویو میں، جو انھوں نے ای ٹی وی اردو کو دیا، اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ چونکہ شروع ہی سے ان کا بچوں سے قریبی رابطہ اور تعلق رہا، اسی لیے انھیں بچوں کے ادب سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ جب بھی انھیں وقت ملتا ہے، وہ

بچوں کے لیے ڈرامے، کہانیاں اور مضامین تحریر کرتے ہیں۔ اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کے ادب سے ان کی وابستگی وقتی یا رسمی نوعیت کی نہیں، بلکہ ایک سنجیدہ فکری وابستگی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں میں بچوں کی نفسیات اور ان کی معصوم دنیا کی حقیقی عکاسی ملتی ہے۔

انھوں نے بچوں کے ادب کے حوالے سے کئی اہم اور یادگار کتابیں پیش کیں جن میں ''ننھے کھلاڑی''، ''فرشتے سے بہتر انسان بننا'' اور ''بادل کی آپ بیتی'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان تصانیف میں بچوں کے لیے نہایت دلچسپ، سبق آموز اور اخلاقی کہانیاں و مضامین شامل ہیں جو ان کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں زبان کی سادگی اور اسلوب کی روانی بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، جب کہ مقصدیت ان تحریروں کو ادبی وقعت عطا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ سلام بن رزاق نے ''بال واڑی'' کے نام سے بچوں کے لیے ایک ڈرامہ بھی تحریر کیا، جو ان کی فنی ہمہ گیری اور بچوں کی دلچسپیوں سے واقفیت کا مظہر ہے۔ انھوں نے صرف طبع زاد ادب ہی تخلیق نہیں کیا بلکہ مراٹھی لوک کہانیوں کو اردو میں منتقل کر کے بچوں کے ادب کے دائرے کو وسیع کیا۔ ان تراجم کے ذریعے انھوں نے مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے قصوں کو اردو خواں بچوں تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی، جو ان کی ادبی بصیرت اور کشادہ ذہنی کا ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلام بن رزاق نے بچوں کے ادب میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کی تحریریں نہ صرف بچوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں، بلکہ ان کی ذہنی، اخلاقی اور فکری تربیت میں بھی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

سلام بن رزاق نے جاپان کی زین کہانیوں کو اردو میں تراجم کر کے ''زین کہانیاں'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ سلام بن رزاق اس کتاب کی اشاعت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''اس معمولی مجموعے کی اشاعت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اردو کا عام قاری زین کے عظیم فلسفے سے واقفیت حاصل کرے۔ اس کے علاوہ سنجیدہ اور صاحب ذوق ادبا زین فلسفہ و ادب کی طرف راغب ہوں اور اس گنج بے بہا سے مزید آب دار موتی چن کر اردو کے دامن کو ثروت مند بنا سکیں''۔ 6

ان کے علاوہ انھوں نے ''گا ہے گا ہے باز خواں'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں 14 اردو کے کلاسیکی افسانے اور ان کے تجزیے شامل ہیں، جنھیں خود سلام بن رزاق نے کیا ہے۔ اس مجموعے میں پریم چند کا ''پوس کی رات''، سعادت حسین منٹو کا ''ٹھنڈا گوشت''، کرشن چندر کا ''دو فرلانگ لمبی سڑک''، راجندر سنگھ بیدی کا ''لاجونتی''، عصمت چغتائی کا ''جڑیں''، قرۃ العین حیدر کا ''نظارہ درمیاں ہے''، انتظار حسین کا ''مورنامہ''، سریندر پرکاش کا ''گاڑی بھر رسد''، غیاث احمد گدی کا ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی''، رتن سنگھ کا ''ہزاروں سال کی رات''، اقبال مجید کا ''آگ کے پاس بیٹھی عورت''، قاضی عبدالستار کا ''پیتل کا گھنٹہ''، نیر مسود کا ''تحویل'' شامل ہیں۔

وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور اس فن میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں روز مرہ کی زندگی، واقعات، تجربات اور مشاہدات کو پیش کیا ہے۔ اعلیٰ قدروں کے زوال، رشتوں کے بکھراؤ، مذہب اور سیاست میں ہونے والی تبدیلیاں، بے سمتی ذات کی شناخت، اخلاقی زوال، فسادات، گنگا جمنی تہذیب، سیاسی، سماجی اور مذہبی صورت حال کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

سلام بن رزاق نے اپنے افسانوں میں تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی شعور سے اپنا تخلیقی نظام قائم کیا۔ انھوں نے فکشن کے رائج سانچوں کو توڑ کر اظہار کے نئے رویوں کو فروغ دیا ہے۔ سلام بن رزاق اپنے دور کے ان تخلیق کاروں میں سے ہیں جن کے بغیر اردو فکشن کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ بحیثیت افسانہ نگار ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے عہد اور ماحول کے تضادات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر افسانہ اردو افسانوی ادب میں ایک قیمتی اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔ ان کے افسانے محض کہانیاں نہیں بلکہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ممبئی کی تیز رفتار زندگی اور اس کی دھڑکتی ہوئی فضا کے ساتھ ساتھ مہاراشٹر کے مقامی حالات، ہندوستانی مسلم معاشرے کی روایات، گھریلو زندگی کے نشیب و فراز، مرد و عورت کے نفسیاتی تعلقات، محبت کے لطیف احساسات، سماجی بدعنوانیاں اور فسادات کے اثرات بھی ان کی تحریروں میں پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے گرد و پیش کے ہر رنگ کو نہایت فنکاری سے افسانوں میں سمو دیا ہے۔ ان کے افسانوں کا اسلوب نہایت سادہ، دلکش اور رواں ہے، جس کی وجہ سے قاری ابتدا سے آخر تک پوری دلچسپی کے ساتھ کہانی سے جڑا رہتا ہے۔ وہ افسانہ لکھنے سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں کو اپنے ذہن میں مکمل طور پر ترتیب دے لیتے ہیں، پھر اپنی تخلیقی بصیرت اور فنی مہارت سے اسے اس انداز میں صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں کہ تحریر میں ایک خاص کشش اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی روانی اور فنی پختگی قاری کو مسلسل اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔

سلام بن رزاق نے افسانہ نگاری، ترجمہ نگاری، مضمون نگاری، ادبِ اطفال اور دیگر ادبی اصناف میں گراں قدر خدمات انجام دے کر اردو ادب کے دامن کو وسعت بخشی۔ ان کی ادبی کاوشیں فکری بالیدگی، فنی پختگی اور عصری شعور کی آئینہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ادبی خدمات کو علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور انھیں متعدد اعزازات و انعامات سے نوازا گیا، جن میں دو مرتبہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف ادبی و ثقافتی اداروں نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں کئی اہم اعزازات سے سرفراز کیا، جو ان کی ادبی عظمت اور مقبولیت کا واضح ثبوت ہیں۔ سیکڑوں افسانوں کے تخلیق کار، مترجم، مصنف فلم رائٹر بالآخر 17 مئی 2024 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

حوالہ جات:

1. محمد نسیم، ڈاکٹر، سلام بن رزاق کی افسانوی جہات، ص37، روشان، پرنٹس، دہلی، 2024
2. ایضاً، ص38
3. سلام بن رزاق، تذکرے، ص10، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی، 2015
4. ایضاً، ص12
5. ایضاً، ص74
6. ایضاً، زین کہانیاں، ص15، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 2021

Md. Sarfraz
Research Scholar
Departement of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-500032, Gachibowli
Mob.: 7300902563
Emil: mdsarfraz973@gmail.com



بدیسیا

ایک مقبول عام لوک گیت

محمد نظرین انصاری

بدیسیا گیت سماجی، تاریخی، تہذیبی و ثقافتی دستاویز ہیں جنھیں کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لوک گیتوں میں بدیسیا، لوریاں، زچہ کیریاں، شادی کے گیت، بخش گیت، گالیاں، سوزخوانی نوحہ، شہادت نامہ، چہار بیت، منظوم رزم نامہ، بارہ ماسہ وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ مختلف علاقوں سے وابستہ لوک گیت کی زبان ایک دوسرے سے ضرور مختلف ہوتی ہے لیکن ان سبھی میں بنیادی جذبات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ دراصل لسانی امتیازات کی وجہ سے ایک ہی لوک گیت مختلف علاقوں میں مختلف طرز اور رنگ و آہنگ کے ساتھ گایا جاتا ہے جس کی وجہ سے الفاظ اور آوازوں میں واضح طور پر فرق دکھائی دیتا ہے مگر ان کے جذبات و خیالات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

بدیسیا ایک روایتی لوک صنف ہے جو بنیادی طور پر بھارت کے بھوجپوری بولنے والے علاقوں، خاص طور پر بہار اور مشرقی اتر پردیش میں پائی جاتی ہے۔ ''بدیسیا'' لفظ ''بدیس'' سے نکلا ہے، جس کا مطلب ''غیر ملک'' یا ''بیرون ملک'' ہوتا ہے۔ بدیسیا گیت عموماً جدائی، خواہشات، اور ایسے لوگوں کے جذباتی درد کو ظاہر کرتے ہیں جو اپنے وطن سے دور روزگار یا بہتر مواقع کی تلاش میں ہجرت کرتے ہیں۔ ان گیتوں کی خصوصیت ان کی روحانی دھنوں اور دردناک اشعار سے ہے جو ان لوگوں کے گہرے احساسات کی عکاسی کرتے ہیں جو پیچھے رہ گئے ہیں، جیسے بیوی، ماں، بچے اور احباب جو اپنے ایسے محبوبین کی جدائی کا شکوہ کرتے ہیں جو دور و دراز مقامات پر چلے گئے ہیں۔

بدیسیا گیت عام طور پر ایک روح پرور اور اداس انداز میں روایتی آلات جیسے ہارمونیم، طبلہ اور ڈھولک کے ذریعہ گائے جاتے ہیں۔ بدیسیا گانے دیہی طرز زندگی کے جوہر کو اپنی گرفت میں سموئے ہوئے ہیں اور یہ خطے کے ثقافتی ورثے کا ایک اہم حصہ ہیں۔ مختلف ثقافتی تقریبات، تہواروں اور تھیٹروں میں بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ بدیسیا گانے بھوجپوری ثقافت کا ایک اہم حصہ ہیں اور مختلف قسم کی پرفارمنس کے ذریعے مقبول ہوئے ہیں، جن میں تھیٹر، رقص، اور موسیقی شامل ہیں۔ اس صنف کو خاص طور پر بیسویں صدی کے اوائل میں بھکھاری ٹھاکر کے ذریعے فروغ حاصل ہوا، جو بھوجپوری ادب اور تھیٹر کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ ان کے کام اور پرفارمنس نے بدیسیا کی روایت کو زندہ رکھا ہے اور یہ اب بھی لوک موسیقی اور تھیٹر کو متاثر کرتی ہے۔

بھکھاری ٹھاکر (1887–1971)، کو ''بھوجپوری ادب کا شیکسپیئر'' کہا جاتا ہے۔ وہ بھوجپوری تھیٹر اور ادب میں اپنی اہمیت کے لیے مشہور ہیں۔ بھکھاری ٹھاکر کی پیدائش بہار کے ایک چھوٹے سے گاؤں کوٹھیا میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی زندگی اور دیہی ماحول نے ان کے فن پر گہرا اثر ڈالا۔ رسمی تعلیم کی ناکامی کے باوجود بھی مقامی روایات اور لوک فنون میں مہارت حاصل کی۔ لوک تھیٹر میں شراکت کی بات کی جائے تو ''بدیسیا'' بھکھاری ٹھاکر کا سب سے مشہور ڈراما ہے، جو ہجرت اور اس کے اثرات سے پیدا ہونے والے مسائل پر مبنی ہے۔ یہ ڈراما دیہی خاندانوں پر ہجرت کے جذباتی اور سماجی اثرات کی دلگداز تصویر کشی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ، انھوں نے بیٹیہ بہار، گبر گھچور، اور چندالیکا جیسے کئی دوسرے ڈرامے لکھے اور پیش کیے ہیں، جو مختلف سماجی مسائل اور لوک ثقافت کو اجاگر کرتے ہیں۔

بدیسیا لوک گیت کے آغاز و ارتقا کے بارے میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر ہم زبان کے لحاظ سے بدیسیا کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جو زبان بدیسیا لوک گیت کے لیے استعمال کی گئی ہے وہ مشرقی اتر پردیش اور مغربی بہار کی معلوم ہوتی ہے مثال کے طور پر بدیسیا لوک گیت کے چند مصرعے ملاحظہ کریں۔

ہمہوں چلَب پردیس، پیا ہمرو لے چلَ
تُہرے بِنا سجنوا، اب نہ لاگے اِہواں
ہمہوں چلَب پردیس، پیا ہمرو لے چلَ
انگنا سونا پڑی، سُون گئیل دواروا
کیسے رہی ہم، اب تُہرے سنساروا
ہمہوں چلَب پردیس، پیا ہمرو لے چلَ

اس گیت میں استعمال کیے گئے لفظوں پر غور کریں

جیسے ہمہوں چلب، سجنوا،توہرے، ایہواں، دووروال، گئیل، ہمرو، وغیرہ مشرقی اتر پردیش اور مغربی بہار میں کثرت سے استعمال کیے جاتے ہیں۔این سی ای آر ٹی کی کتابوں میں لوک گیت پر جو تحریر ملتی ہے اس کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بدیسیا لوک گیت کی پیدائش آج سے تقریباً 40-30 سال پہلے بھوجپوری کے علاقے میں ہوئی ہے۔

بدیسیا کو بھوجپوری میں تقریباً 40-30 سالوں سے فروغ دیا گیا ہے۔

گلوکاروں کے بہت سے گروپ بدیسیا گاتے ہوئے دیہی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر بہار میں، کوئی اور گیت بدیسیا سے زیادہ مقبول نہیں ہے۔(Vasant bhag (p. 99). NCERT.)

اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بدیسیا لوک گیت کا سرچشمہ مشرقی اتر پردیش کا کتب پور گاؤں ہے جس نے بدیسیا جیسے لوک گیت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ گیت مشرقی اتر پردیش اور مغربی بہار کے علاقے کے گیت کے طور پر جانے پہچانے جانے لگے، دور حاضر میں بدیسیا لوک گیت کو بہار کے گیتوں میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر رام نریش ترپاٹھی کے مطابق: ''کویوں کا گیت کسی بنگلے کے اس پھول کی طرح ہے جس کی خوشبو اور خوبصورتی اُس وقت سامنے آتی ہے جب گاؤں کے گیت اسے سینچتے ہیں، بادل اسے نہلاتے ہیں، سورج اس کی آنکھیں کھولتا ہے، ہلکی ہوا اسے جھولا جھلاتی ہے، چاندنی اس کے چہرے کو روشن کرتی ہے اور ہوا اس کی خوشبو پھیلاتی ہے۔ اس طرح بنگلے کے مالی کا مقابلہ گاؤں کے گیتوں سے نہیں کیا جا سکتا۔(گرام ساہتیہ، ص 10)

رام نریش ترپاٹھی کے نزدیک دیہی گیتوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ان کے خیال میں گاؤں کی زندگی، فطرت اور عوامی جذبات ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ گاؤں کے لوک گیت صرف تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ عوام کے جذبات، احساسات، خوشیوں اور غموں کے سچے عکاس ہیں۔ ان گیتوں میں دیہی زندگی کی سادگی، فطرت کی خوبصورتی اور عوامی تہذیب کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔

ترپاٹھی نے گاؤں کے گیتوں کو فطرت سے تشبیہ دیتے ہوئے ان کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ان کے

گاؤں کے لوک گیت صرف تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ عوام کے جذبات، احساسات، خوشیوں اور غموں کے سچے عکاس ہیں۔ ان گیتوں میں دیہی زندگی کی سادگی، فطرت کی خوبصورتی اور عوامی تہذیب کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔

نزدیک دیہی گیتوں میں وہ فطری حسن اور سادگی پائی جاتی ہے جو دیگر اصناف میں کم پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے گیت ہندستانی عوام کی تہذیبی زندگی اور ثقافتی ورثے کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ ان گیتوں کے ذریعے عوام کی زندگی، ان کی روایات، رسم ورواج اور سماجی اقدار کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

لوک گیت بدیسیا (Bidesiya) کے موضوعات بنیادی طور پر ہجرت، جدائی، اور معاشرتی مسائل کے اردگرد گھومتے ہیں۔اس کے اہم موضوعات درج ذیل ہیں۔

ہجرت اور جدائی: بدیسیا لوک گیت کا بنیادی موضوع ہجرت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جدائی ہے۔ان گیتوں میں ان مردوں کی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں جو اپنے گاؤں کو چھوڑ کر دوسرے شہروں یا ملکوں میں کام کرنے جاتے ہیں۔ ان کی جدائی کا درد، اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے خاندان کی یادیں، اور واپسی کی خواہش ان گیتوں کا اہم حصہ ہیں۔

بھکھاری ٹھاکر کی نظم ''ہمرا پیا گئے پردیس'' ان کے مشہور ناٹک ''بدیسیا'' کا ایک دل کو چھو لینے والا حصہ ہے۔اس نظم میں ایک بیوی کی وہ تکلیف بیان کی گئی ہے جو اسے اس وقت محسوس ہوتی ہے جب اس کا شوہر اسے چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں پردیس چلا جاتا ہے۔

ہمرا پیا گئے پردیس، سجنی، کیسے کٹے دن رتیہ
بھورے بھنسار اٹھی، لاگے جینگیہ سے ڈر
نین سے لور ڈھرکت، کٹے نہ جیارا کے ہر
ہمرا پیا گئے پردیس، سجنیا، کیسے کٹے دن رتیہ
دنوا نہ سوہے، رات نیند ناہی آوے
ساجن کے بنا، منوا ایکو پل نہ لاگے
ہمرا پیا گئے پردیس، سجنیا، کیسے کٹے دن رتیہ
چٹھیا ناہی آوے، نہ کونو سنیسوا
اکیلوا جیبت، منوا ناہی مانت
ہمرا پیا گئے پردیس، سجنیا، کیسے کٹے دن رتیہ

اس نظم میں بھکھاری ٹھاکر نے اس جدائی اور بے قراری کو بیان کیا ہے جو ایک بیوی اپنے شوہر کے پردیس جانے کے بعد محسوس کرتی ہے۔ نظم میں اس کی تکلیف، تنہائی اور پریشانی واضح طور پر جھلکتی ہے، جو دیہی سماج میں اس وقت عام تھی، جب مرد معاشی تنگی کے باعث دور جا کر کام کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔

عورتوں کا درد: یہ گیت اکثر ان عورتوں کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں جو اپنے شوہروں کی غیر موجودگی میں تنہائی، عدم تحفظ، اور معاشرتی دباؤ کا سامنا کرتی ہیں۔ گیتوں میں ان کی آرزوؤں، امیدوں، اور دکھوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

گیت، کری کے گونوا بھونوا میں چھوڑ کر
کرکیگونوا بھونوا میں چھوڑ کر، اپنپر یلن پوروبوا بلموا
اکھیاں سیدن بھر گر یلو رڈر ڈر، بٹیا جوہت دن بیتیلا بلموا
گولما کے نتیا آویلا جب رتیا، تل بھر کل ناہی پاویلا بلموا
کا کینی چکوا، کہ چھوڑ ملکوا، کہل نہ دلوا کے حلیا بلموا
سانولی سورتیا، سالت باٹچھتیا، میکونہیں پتیا بھیجول بلموا
گھر میں اکیلے بانی، اسو جی راکھ پانی، چڑھل جوانی ماٹی میلیلا بلموا
طاک تانی چاروں اور، پیا آ کیکر شور، لوٹوا بھاگین کے بھگیا بلموا
کہت بھکھاری نائی آس ٹنگھے ایکو پائی، ہمرا سے ہو کھیکے دیدار ہو بلموا

یہ گیت ایک ایسی عورت کی کہانی بیان کرتا ہے جو اپنے محبوب کی جدائی میں دکھی ہے۔ یہ عورت اپنے محبوب کو کوستی ہے کہ اس نے اسے تنہا چھوڑ دیا اور پلٹ کر نہیں آیا۔

چاروں طرف محبوب کی یادیں ہیں، اور وہ اسی شور میں گم ہو جاتی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ اس کے پاس کوئی امید باقی نہیں رہی، اور وہ بس محبوب کے دیدار کی خواہش رکھتی ہے۔ یہ گیت ایک ایسے شخص کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے جو اپنے محبوب کی جدائی میں بہت دکھی ہے اور اس کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے۔

محبت اور وفاداری: بدیسیا گیتوں میں محبت اور وفاداری کے موضوعات بھی نمایاں ہیں۔شوہر اور بیوی کے درمیان محبت، جدائی کے باوجود ایک دوسرے کے لیے وفاداری کا عزم، اور ایک دوسرے کے لیے محبت کا اظہار گیتوں کا اہم حصہ ہیں۔گیت: ساغر کے لہریا مشہور بدیسیا لوک گیت ہے جو محبت، وفاداری اور جدائی کے موضوعات پر مبنی ہے۔اس گیت میں، دریا کی لہریں اور محبت کی داستان کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔

ساغر کے لہریا، جاگان ہمار دلوا
پریشان ہو دلوا، نین سے لور بہائے
پیا کے بِنا، جینے میں مانو کچھ نہ پائے

ساغر کے لہریا، جاگان ہمار دلوا گیت میں، گانے والا اپنے دل کی حالت کو ساغر (دریا) کی لہروں سے تشبیہ دیتا ہے۔اس گیت میں، گانے والا اپنے محبوب کی جدائی میں دل کی پریشانی اور اذیت کو بیان کرتا ہے۔ دریا کی لہریں اس کے دل کی حالت کی عکاسی کرتی ہیں جو اپنے محبوب کے بغیر خاموش اور اداس ہے۔ یہ گیت محبت کی گہرائی اور محبوب کے فاصلے کی تکلیف کو بیان کرتا ہے جو گانے والے کے دل کی حالت پر اثر انداز ہوتی ہے۔

معاشرتی مسائل: بدیسیا لوک گیتوں میں ہجرت کے نتیجے میں پیش آنے والے معاشرتی مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، جیسے گاؤں کی معیشت کے مسائل، خواتین کے مشکلیں، اور سماجی دباؤ۔ ان گیتوں میں سماجی انصاف اور برابری کے موضوعات کو بھی اجاگر کیا جاتا ہے۔'چیتارام' گیت میں ایک گاؤں کے کسان کی حالت زار اور ان کے استحصال کو بیان کیا گیا ہے۔ بھکھاری ٹھاکر نے اس نغمے کے ذریعے کسانوں کی مشکلات اور ان کے حقوق کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

چیترام کے گیت گائیں
چیترام کے گیت گائیں
دنیا میں کیسا منجدھار با
چیترام کے گیت گائیں
کھیت کے باڑی، بچار بٹیا
آئیلا سمے پے کے بٹیا
چیترام کے گیت گائیں
دنیا میں کیسا منجدھار با
ادھاری کا تو بڑکا چونا
نیتیّا پر ایسا چونا
چیترام کے گیت گائیں
دنیا میں کیسا منجدھار با

اس گیت میں معاشرتی نظام کی خامیوں اور سماجی اہمیت پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ کہ کس طرح کسانوں کی زندگی بدحال ہے اور سماج میں معیشت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے جو عوام کو ہجرت کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

تنہائی اور یادیں: بدیسیا گیتوں میں تنہائی کا موضوع بھی کثرت سے سامنے آتا ہے، خاص طور پر ان مردوں کے لیے جو دور دراز علاقوں میں کام کر رہے ہوتے ہیں۔ان گیتوں میں ان کے گھر کی یادیں، گاؤں کی محبت، اور اپنے پیاروں کی یادوں کا ذکر ہوتا ہے۔

گیت، پیار ولاپ۔

ہائے ہائے راجہ کیسے کٹی یہ ساری رتیاں
جبل گئیل راجہ سدیونہ لہلے، لکھیا نہ بھیجے پتیا ہائے ہائے
ہائے دنوا بیتلا سیاں بٹیا جوہتا تورہتا راگینت رتیاں ہائے ہائے
جب سوھی آیے سیاں توری صورتیا بہرت مورچھتیا ہائے ہائے
نعت شرن پیا بھائیلے بیدردا منلینا مور بتیا ہائے ہائے

اس گیت میں محبوبہ کی محبت اور اس کے درد کا اظہار ہے۔ گیت میں محبوبہ اپنے محبوب کو یاد کر رہی ہے اور اس کی جدائی کے دکھ کو بیان کر رہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ کیسے یہ ساری راتیں کٹی ہیں، اور راجہ (محبوب) کبھی نہ آیا، نہ کوئی خط بھیجا۔ دن راہ دیکھ گزر رہا ہے اور رات میں وہ ستارے شمار کر کے وقت گزارتی ہے۔ جب اسے محبوب کی یاد آتی ہے، تو اس کے دل میں درد و غم کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ محبوبہ اپنے محبوب سے کہتی ہے کہ وہ اس کے درد کو سمجھ لے اور اس کی حالت پر رحم کرے۔ گیت میں جدائی، محبت اور انتظار کے احساسات کو خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

آسرا لگولے بانی ہو رام
آسرا لگولے بانی ہو رام
کاہے سجنوا گھرے نہ ائیلے
آسرا لگولے بانی ہو را
دنوا بیتتا، راتیاں کاٹتا
کاہے سجنوا گھرے نہ ائیلے
آسرا لگولے بانی ہو رام
کون جتنیا کری ہم اے سکھیاں
کون جتنیا کری ہو رام
آسرا لگولے بانی ہو رام

معاشرتی انصاف اور اخلاقی تعلیمات: یہ گیت سماج میں موجود عدم انصاف، معاشرتی برائیوں اور اخلاقی تعلیمات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان گیتوں میں لوگوں کو بہتر معاشرتی اقدار کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بدیسیا لوک گیت اپنی سادگی اور گہرائی کی وجہ سے بھوجپوری ثقافت میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور آج بھی ان علاقوں میں ان گیتوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

گیت، گاؤں کے لوگن کے چُوڑا۔ اس گیت میں گاؤں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تنقید کی گئی ہے، روایتی اور سادہ زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ بھکھاری ٹھاکر نے اس گانے کے ذریعے گاؤں کی معاشرتی اور ثقافتی حالت کو بیان کیا ہے، جو ایک طرف سادگی کو ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف شہروں کی ترقی یافتہ زندگی سے موازنہ کرتا ہے۔

گاؤں کے لوگن کے چُوڑا، گاؤں کے لوگن کے چُوڑا
کئی بِدھی کے چُوڑا بیٹھل با، اوہجا لِلا کے، کھا رَہل با
ملکا جَنی مَت کہُنا، کہو جَنی اَرے شہری
بیٹھل با تب بھی لِلا کے، کھا رَہل با لِلا کے
اَرے ساگ با جَنی باسی، سب کچھ با بَلا شری
گاؤں کے لوگن کے چُوڑا، کئی بِدھی کے چُوڑا

گیت کی سطروں میں دیہی زندگی، عوامی رہن سہن، خوراک اور گاؤں کے اجتماعی ماحول کی عکاسی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ گیت میں ''گاؤں کے لوگن کے چُوڑا'' کی تکرار محض ایک کھانے کی چیز کا ذکر نہیں بلکہ دیہی معاشرت اور اس کے روزمرہ معمولات کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ چُوڑا بھوجپوری معاشرے میں عام اور روایتی غذا کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے، اس لیے اس کا ذکر گیت کو مقامی تہذیبی اور ثقافتی شناخت سے جوڑتا ہے۔

بِدیسیا روایت کے بنیادی عناصر میں دیہات، ہجرت، معاشی مجبوری، جدائی، انتظار اور دیہی معاشرت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ زیرِ نظر گیت میں براہِ راست پردیس جانے والے شخص یا اس کی جدائی کا واضح ذکر نہیں ملتا، تاہم اس کے پس منظر میں موجود دیہی معاشرت وہی سماجی فضا تشکیل دیتی ہے جس میں بِدیسیا روایت نے جنم لیا۔ اس اعتبار سے یہ گیت بِدیسیا کے وسیع تر ثقافتی تناظر کو سمجھنے میں معاون ہوا ہے۔

گیت میں ''ملکا جنی'' اور ''شہری'' جیسے الفاظ بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ان الفاظ کے ذریعے گاؤں اور شہر کے درمیان تہذیبی فرق کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ بدیسیا لوک روایت میں شہر یا پردیس اکثر روزگار، ہجرت اور معاشی تبدیلی کی علامت بنتا ہے، جب کہ گاؤں گھر، خاندان، رشتوں اور روایتی زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس طرح گیت میں دیہی اور شہری زندگی کے درمیان ایک ثقافتی تقابل کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

اس گیت کی ایک اہم خصوصیت زبانی روایت اور تکرار ہے۔ ''گاؤں کے لوگن کے چُوڑا'' جیسی تکراری سطر گیت کو یاد رکھنے، اجتماعی طور پر گانے اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ لوک ادب کی یہی زبانی اور اجتماعی خصوصیت اسے تحریری ادب سے مختلف بناتی ہے۔ گیت کا مفہوم صرف الفاظ میں نہیں بلکہ اس کی ادائیگی، لہجے، تکرار اور اجتماعی گائیکی میں بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔

گیت میں ''ساگ''، ''باسی'' اور دیگر دیہی اشیا کا ذکر عوامی زندگی کے مادی کلچر کو سامنے لاتا ہے۔ یہاں خوراک محض جسمانی ضرورت نہیں بلکہ ثقافتی شناخت کا حصہ ہے۔ چُوڑا، ساگ اور سادہ دیہی خوراک کے ذریعے گیت عام لوگوں کی زندگی، ان کے محدود وسائل اور روزمرہ کے معمولات کو ادبی اظہار عطا کرتا ہے۔

گیت، متیوا: اس گیت میں بھی محبت، اخلاق اور دوستی کے جذبات کو خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے، اس طرح اس گیت میں محبت کرنے والے کی تعریف اور اس کے ساتھ وقت گزارنے کی خوشی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ بھکھاری ٹھاکر نے اپنے منفرد انداز میں محبت کی مٹھاس اور خوشی کو شاعری میں بیان کیا ہے۔

مِتوا، تُہکے دیکھ کے منوا للچائے
تُہکے دیکھ کے منوا للچائے، ہائے رے!
مِتوا، تُہار مہما انجان نہ ہوخے
تُہار مہما انجان نہ ہوخے، ہائے رے!
تُہار ہنسی دیکھ کے، منوا ہرشائے
تُہار ہنسی دیکھ کے، منوا ہرشائے، ہائے رے!
تُو ہمارا دل کے پیارا مِتوا، ہائے رے!

بدیسیا ایک روایتی لوک صنف ہے جو بنیادی طور پر بھارت کے بھوجپوری بولنے والے علاقوں، خاص طور پر بہار اور اتر پردیش میں پائی جاتی ہے۔

اس صنف کو خاص طور پر بیسویں صدی کے اوائل میں بھکھاری ٹھاکر کے ذریعے مقبول عام حاصل ہوا، جو بھوجپوری ادب اور تھیٹر کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ ٹھاکر اپنی تصانیف میں لوک عناصر، موسیقی، رقص، اور روایتی کہانی سنانے کی تکنیک کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں، مزاحیہ اور سماجی طنز شامل ہوتا ہے۔ ان کے ڈرامے عموماً ہجرت، سماجی ناانصافی، صنفی کردار، اور دیہی زندگی کی مشکلات کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کی

بھکھاری ٹھاکر کا کام آج بھی بھوجپوری ثقافت کا ایک اہم حصہ ہے۔ ان کے ڈرامے آج بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ لوک تھیٹر اور ادب میں ان کی شراکتوں کو بڑے پیمانے پر سراہا گیا ہے۔ بھوجپوری لوک تھیٹر کو فروغ دینے میں انھوں نے کافی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اپنے فن اور ثقافت کی ترویج کے باوجود، ٹھاکر نے زندگی بھر مالی مشکلات کا سامنا کیا۔ ان کی بھوجپوری ثقافت کو بچانے اور فروغ دینے کی کوششوں نے ذاتی قیمت پر تمام کام کیے۔

تصانیف اپنے دور کے سماجی و اقتصادی حالات کی عکاسی کرتی ہیں اور پسماندہ طبقوں کی آواز بلند کرتی ہیں۔

ٹھاکر ان پڑھ تھے لیکن انھوں نے خود سے ہی تلسی داس کے لکھے ہوئے رام چرت مانس کو پڑھنا اور یاد کرنا سیکھا، جسے وہ اپنا ادبی استاد مانتے تھے۔ ٹھاکر نے اپنے ڈراموں اور گانوں میں خواتین، پسماندہ طبقات کے لوگوں اور دیہات میں رہنے والے غریب لوگوں سے متعلق سماجی مسائل کو اٹھایا۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں اداکاری بھی کی ہے۔ بدیسیا کا یہ فن ہندو ذات پات کے نظام کی نام نہاد نچلی ذاتوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اس آرٹ فارم کا نچوڑ معاشرے کی برائیوں پر روشنی ڈالنا ہے۔

بھکھاری ٹھاکر کا کام آج بھی بھوجپوری ثقافت کا ایک اہم حصہ ہے۔ ان کے ڈرامے آج بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ لوک تھیٹر اور ادب میں ان کی شراکتوں کو بڑے پیمانے پر سراہا گیا ہے۔ بھوجپوری لوک تھیٹر کو فروغ دینے میں انھوں نے کافی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اپنے فن اور ثقافت کی ترویج کے باوجود، ٹھاکر نے زندگی بھر مالی مشکلات کا سامنا کیا۔ ان کی بھوجپوری ثقافت کو بچانے اور فروغ دینے کی کوششوں نے ذاتی قیمت پر تمام کام کیے۔

بدیسیا گیت میں، گانے والا اپنے وطن کے لوگوں کی مخلصی اور سادگی کو اجاگر کرتا ہے، اور غیر ملکی ثقافتوں اور ان کی نمود و نمائش پر تبصرہ کرتا ہے۔ گانے میں بدیسی لوگوں کے بارے میں تنقید بھی کی جاتی ہے، اور ان کی روش، عادات، اور معاشرتی رویوں پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ گیت کی زبان سادہ اور دلکش ہے، اور یہ گاؤں کی زندگی، اس کی روایات، اور غیر ملکی اثرات کے درمیان تضاد کو ظاہر کرتی ہے۔ اس گانے کے ذریعے، بھکھاری ٹھاکر نے گاؤں کی ثقافت اور زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا ہے، ساتھ ہی ساتھ جدیدیت اور اس کے اثرات پر بھی تبصرہ کیا ہے۔

حوالہ جات

1 این سی ای آر ٹی 2006 لوک گیت۔ 'وسنت بھاگ 1: جماعت ششم کے لیے ہندی درسی کتاب' صفحہ 99۔
2 بھکھاری ٹھاکر، گرنتھاوَلی حصہ 1، لوک کلاکار بھکھاری ٹھاکر آشرم، قطب پور، 1979۔
3 درگا شنکر پرساد، بھوجپوری لوک گیت میں کرونا رس، ہندی ادبی کانفرنس، ہندی ادب، پراباگ، 1994۔
4 ڈاکٹر احمد خان، ادب و ثقافت ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جنرل مرکز مطالعات اردو ثقافت مانو، 2002۔
5 رام نریش تریپاٹھی، گرام ساہتیہ، حصہ دوم، ہندی مندر، 1951۔
6 کرشن دیو اپادھیاے، ہندی پرادیش کے لوک گیت، ساہتہ بھون، الہ آباد، 1990۔

Mohammad Najarain Ansari
Maulana Azad National Urdu University,
Hyderabad-500032
Mob. 7080983814
Email: m.arshad01995@gmail.com



محمد ارشد ہمراز

عہد حاضر میں اردو لوک گیت کی معنویت

ہندستانی ثقافت کے تناظر میں

ہمارے یہاں جس طرح ادب عالیہ کے مختلف اصناف ہیں اسی طرح لوک ادب جسے عوامی ادب کہا جاتا ہے اس کی بھی مختلف صنفیں ہیں۔ گیت اور شاعری کا شمار ادب عالیہ کے ساتھ لوک ادب کے بھی اہم اصناف میں کیا جاتا ہے اور نثر کے مقابلے شاعری کی مقبولیت آج بھی زیادہ ہے۔ غزل، نظم، مثنوی، مرثیے ہوں یا پھر لوک گیت، چار بیت، دکھڑے، ٹھمری، جھومر، سوہر، لوری وغیرہ یہ ہمیشہ سے عوام وخواص کے پسندیدہ اصناف رہے ہیں۔

اردو میں لوک گیت (Folk song) کیا، کیسے اور کیوں؟ اس کو سمجھنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ لوک ادب کیا ہے۔ الفاظ اور جملوں کے معمولی اختلاف سے لوک ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ سہل الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں:

لوک ادب کا اطلاق ان زبانی (Oral) قصے، کہانیوں، ڈراموں، کہاوتوں، محاوروں اور گیتوں پر ہوتا ہے جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچا ہے اور جس کا تخلیق کار کوئی ایک فرد نہیں بلکہ پورا سماج اور معاشرہ ہوتا ہے۔ ان قصے، کہانیوں ڈراموں اور گیتوں کی بنیاد صدیوں پرانی تہذیب وتمدن، ثقافت ومعاشرت ہوتی ہے۔ یہ دیہی اور قصباتی لوگوں کے اجتماعی جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ادب عالیہ اور عوامی ادب میں بنیادی فرق یہی ہوتا ہے کہ اول الذکر تحریری شکل میں موجود ہوتا ہے اور اس کا کوئی ایک مصنف ہوتا ہے جب کہ آخر الذکر بیانیہ اور ملفوظی ہوتا ہے۔ یہ محض حافظے کی بنیاد پر نسل در نسل اور ملک در ملک سفر کرتا ہے اور کوئی فرد واحد اس کا خالق نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ عوام کے رنج والم، خوشی وغم کے تجربات ومشاہدات کا نتیجہ ہوتا ہے جو عوامی زبان میں ہی بیان کیا جاتا ہے۔

لوک ادب (Folk Literature) قدیم ترین ہے اس لیے ادب عالیہ کے سوتے اس سے جا کر ملتے ہیں۔ اگر ادب عالیہ کو بلند و بالا درخت مانا جائے تو بلاشبہ لوک ادب کو اس کی جڑ تسلیم کرنا پڑے گا۔ لوک ادب کی تاریخ انسانی زبان کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ اس لیے ہر زبان کا اپنا عوامی ادب ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں پائی جانے والی بیشمار زبانوں اور بولیوں نے مرور زمانہ کے ساتھ ایک دوسرے کے لوک ادب پر اپنے اثرات ڈالے ہیں۔ اردو زبان کا اپنا کوئی لوک ادب نہیں ہے یہ بات جتنی غلط ہے اتنی ہی یہ بات درست ہے کہ اردو اور ہندی لوک ادب کے کئی پہلو مشترک ہیں۔ بطور خاص اردو اور ہندی لوک گیتوں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دونوں زبانوں کی لسانی بنیاد کھڑی بولی ہے۔ اور اردو صرف کھڑی بولی کی نہیں بلکہ برج بھاشا، اودھی، ہریانوی اور بھوجپوری سبھی کی روایتوں کی امین ہے اور اس کی مثال سب سے زیادہ لوک گیتوں میں ہمیں نظر آتی ہے۔ اس لیے اردو کے لوک گیتوں کی تاریخ میں سبھی زبانوں کی مشترکہ جھلک ملتی ہے۔ علی جواد زیدی کا یہ شکوہ بجا ہے:

''ناقدین ادب نے روایتوں کے اس تسلسل کو عام طور سے نظر انداز کر دیا ہے جو پراکرتوں اور اپ بھرنشوں سے عوامی شاعری کے نمونے کے طور پر ہمیں ملا تھا اور جن پر ہمارا جائز حق ہے۔ کیا ہم یہ بھول سکتے ہیں کہ ہمارے صوفیوں اور سنتوں نے انھیں بے جھجک ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ آج ضرورت بھی ہے اور ہندی کے پھیلاؤ نے یہ سہولت بھی پیدا کر دی ہے کہ قدیم عوامی اور لوک گیت کے جو نمونے دیوناگری یا گجراتی وغیرہ دوسری لپیوں میں ملتے ہیں ان سے ہم ہندی کی طرح اپنا رشتہ بھی جوڑیں۔ نہیں، میں نے غلط کہا۔ رشتے تو پہلے سے موجود ہیں اور جڑے ہوئے ہیں۔ ان کو نئے معلومات کی روشنی میں پھر سے جانچنا پرکھنا ہے اور ان پر اپنے پن کی چھاپ گہری کرنا ہے۔ ہم اپنے قدیم تہذیبی ورثے کو نادانی میں بے شرکت ہندی کے حوالے کیوں کر دیں۔''[1]

لوک گیت کا خالق کوئی ایک فرد نہیں ہوتا بلکہ یہ گیت عموماً غیر شخصی اور گمنام ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی تحریری ماخذ نہیں ہوتا بلکہ یہ سینہ بہ سینہ یاد داشتوں میں محفوظ رہتے ہیں۔ الفاظ اور جملوں کے معمولی اختلاف سے یہ اکثر دیہی علاقوں میں ایک ہی طرز پر گائے جاتے ہیں۔ اس کی تحریری سند نہ ہونے کی وجہ ایک یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ لوک گیت جب تحریری شکل اختیار کر لیتے ہیں تو وہ اس رنگا رنگی سے محروم ہو جاتے ہیں جو مختلف

علاقوں کی تہذیب وثقافت اور مزاج کی بوقلمونیوں سے پیدا ہوتی ہے۔اس میں لطافت، جاذبیت اور مٹھاس اس کی قرأت سے نہیں اسے گانے اور گنگنانے پر منحصر ہے۔

لوک گیتوں کی تقسیم علاقائی پس منظر میں بھی کی جاتی ہے جیسے راجستھانی لوک گیت، پنجابی لوک گیت، ہریانوی لوک گیت، بنگالی لوک گیت وغیرہ۔لوک گیت کا مذہب اور دھرم سے بھی گہرا ربط رہا ہے۔مندروں اور مٹھوں میں ہمیشہ سے بھکتی کے گیت گائے جاتے رہے ہیں اسی طرح مزاروں اور خانقاہوں میں ایسے صوفیانہ گیت گائے جاتے تھے جو عوامی زبان میں ہوتے تھے اور اس طرح یہ گیت مقامی زبانوں کی ترقی کا ذریعہ بھی بنے۔

ڈاکٹر مجیب الاسلام کے مطابق لوک گیت کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں:

''لوک گیت عوامی ادب کی وہ مشہور صنف سخن ہے جو انسانی پیدائش سے ظہور میں آئی۔ اس کی جغرافیائی حد بندیاں تو ضروری ہیں لیکن اس کے باوجود یہ عوام کے دلوں میں محفوظ رہنے والا وہ قیمتی سرمایہ ہے جسے ضبط تحریر میں نہیں لایا جاتا تھا۔ یہ ان پڑھ عوام کے داخلی جذبات کا فطری اظہار ہے۔ان کا خاص کام خواتین کے جذبات کا بے اختیار اظہار اور ان کے بھر پور احساسات کا بیان ہوتا ہے۔لوک گیتوں کا تعلق ان طبقوں سے ہوتا ہے جن کی زبان روزی روٹی اور رہنے سہنے کے طریقے ایک سے ہوتے ہیں۔لوک گیت کسی ایک شخص ،گروہ یا برادری کے نہیں ہوتے بلکہ یہ سارے سماج کا مشترکہ سرمایہ بن جاتے ہیں۔اسی لیے ہر گھر میں بلا تفریق گائے جاتے ہیں۔لوک گیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ داخلیت اور خارجیت دو قالب ہوتے ہوئے بھی ایک روح ہوکر گیت میں ڈھلتے ہیں۔ یہ قلبی واردات کے ساتھ بعض خارجی عناصر کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں جس سے ایک دلنشین غنائی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔''[2]

پنڈت رام نریش ترپاٹھی اپنی کتاب ،گرام گیت، کویتا کومدی کے صفحہ 4 پر لوک گیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان پڑھ دیہاتیوں کے دلوں سے نکلے وہ جذباتی بول جو شعری اور لسانی پابندیوں سے آزاد ہوں پھر بھی ان میں لحن اور ایک قسم کا میٹھا سر ہو''۔

دیگر اصناف کی طرح لوک گیت کی تعریف کو بھی کئی مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے مگر یہاں انہی دو پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس سے لوک گیت کا ایک بھرپور خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ لوک گیت دیہی عوام کے دلی جذبات کا فطری اظہار ہے جس میں ایک لحن اور میٹھا سر ہوتا ہے۔ جو کسی طربیہ، حزنیہ اور المیہ جذبے سے گزرنے کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے اور سینہ بہ سینہ چلتے ہوئے نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔لوک گیت کی زبانی روایت یعنی اس کا تحریری شکل میں نہ ہونا بھی اس کی ایک خوبی ہے کہ اس سے اس کا دائرہ محدود نہیں ہوتا بلکہ ہر زمانے میں گانے اور سننے والے اس میں اپنے

> **لوک گیت کا خالق کوئی ایک فرد نہیں ہوتا بلکہ یہ گیت عموماً غیر شخصی اور گمنام ہوتے ہیں۔ان کا کوئی تحریری ماخذ نہیں ہوتا بلکہ یہ سینہ بہ سینہ یادداشتوں میں محفوظ رہتے ہیں۔الفاظ اور جملوں کے معمولی اختلاف سے یہ اکثر دیہی علاقوں میں ایک ہی طرز پر گائے جاتے ہیں۔**

حساب سے اضافہ کرتے ہیں اور اگلی نسل کو منتقل کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوک ادب کے اصناف کے فروغ میں زمان ومکان کے حدود قائم نہیں ہوتے اس کا دائرہ عہد بہ عہد وسیع تر ہوتا جاتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ لوک گیت کے ارتقا اور فروغ میں مردوں سے زیادہ خواتین کا اہم کردار رہا ہے۔ لوک گیت کے حوالے سے ذہن میں ایک اہم سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ کیا اس کا شمار شاعری میں کیا جاسکتا ہے؟ اس ضمن میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ لوک گیت گرچہ شاعری کے مروجہ اصول ،بحر، وزن ،قافیے اور ردیف کی پابندی سے آزاد ہوتے ہیں اور یہ دیہی عوام کے دلوں کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتے ہیں اور ان میں اور شاعری میں کوئی ظاہری مناسبت معلوم نہیں ہوتی ہے پھر بھی اگر علامہ شبلی نعمانی کا یہ مشہور قول درست تسلیم کیا جائے جو ان کی تصنیف، شعر العجم میں درج ہے کہ ''احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے'' یا پھر یہ کہ ''جو چیز دل پر استعجاب، حیرت یا جوش پیدا کرے وہ شعر ہے''۔تو پھر کہا جاسکتا ہے کہ لوک گیت کا شمار بھی شاعری میں ہے اور ہونا چاہیے۔

انسانی تہذیب وتمدن کی عمر جتنی طویل ہے لوک گیت کی روایت بھی اتنی ہی قدیم ہے۔'رگ وید' جیسی قدیم ترین کتاب میں اس کا ذکر ملنا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ زمانہ رگ وید سے قبل بھی لوک گیت گائے جاتے تھے۔عوام الناس اپنے دلی جذبات واحساسات ،خوشی وغمی ،ہجر ووصال ،موت وحیات اور دکھ، درد کا اظہار اس کے ذریعے کیا کرتے تھے۔زبان وبیان کے لحاظ سے لوک گیت کے ارتقا پر اگر نظر ڈالیں تو مختلف زبانوں اور زمانوں سے گزرتے ہوئے اس کی رسائی اردو تک ہوئی ہے۔کون سے گیت کب اور کس عہد میں سب سے پہلے لوگوں نے گائے، اس کے وقت کا تعین یقیناً دشوار ہے مگر بعض گیتوں کے موضوع اور اس کی لفظیات سے اس عہد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جب وہ گیت وجود میں آئے ہوں گے۔اس سلسلے میں اظہر علی فاروقی اپنی کتاب' لوک گیت' میں لکھتے ہیں:

گیت کب بنے اور کس نے بنائے۔اس کا پتہ لگانا گویا آب ظلمات کو تلاش کرنا ہے۔وقت کا تعین بہت دشوار ہے۔البتہ بعض گیت ایسے ہیں جو اپنے عہد کی خاص یادگار ہیں اور وہ اس طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ خاص خاص اسلحہ، ہتھیار، لباس، پوشاک، زیوروں کے نام اور کھانوں وغیرہ کا ذکر کچھ اس طرح آجاتا ہے جو اپنے عہد کی یاد تازہ کردیتا ہے۔ مثال کے طور پر چند واقعات لیجیے، جن گیتوں میں اس قسم کا بیان ہے کہ لڑکی شوہر کی تلاش میں خود سرگرداں ہے، یا اپنے باپ کے انتخاب پر نظر ونقد کا حق رکھتی ہے یا اپنے بزرگوں سے اپنی شادی کی التجا کرتی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ گیت اس عہد عتیق کی یاد دلا رہے ہیں جب قدیم ہندوستان میں سوئمبر کی رسم تھی۔اسی طرح جن گیتوں میں مغلوں سے لڑنے ،ان کو پکڑنے اور جنگ کرنے کا ذکر ہے وہ عہد

اس کی یادگار ہیں۔ انگرکھا، کلاہ، چوڑیدار پائجامہ وغیرہ مغلیہ عہد کی یادگار ہیں۔ ڈھال، تلوار، تیرکمان وغیرہ انگریزی حکومت سے پہلے کی چیزیں ہیں۔ یہ گیت جس میں یہ ذکر ہے کہ ''سوتن ریل میرے پیا کو لے کر بھاگ گئی'' انگریزی عہد حکومت کی یادگار ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اس سے پیشتر ریل گاڑی کا وجود نہ تھا''۔[3]

اس طرح سے بعض لوک گیتوں کے زمانہ وجود کا تعین کیا جاسکتا ہے۔اس میں مستعمل زبان، الفاظ، جملے اور اشیا کے نام کے سہارے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ گیت کب سب سے پہلے لوگوں کی زبان سے نکلے ہوں گے۔ لوک گیت کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس میں ہرنوع کے موضوعات سمٹ آتے ہیں۔فنی اور موضوعاتی سطح پر اس کا جائزہ لیا جائے تو اس کے مختلف اقسام نظر آتے ہیں۔ ہرخوشی اور غمی کے مواقع پر کوئی نہ کوئی لوک گیت مل جاتا ہے۔ تمام طرح کے موسم، سردی، گرمی، بسنت، بہار، برکھارت اور موسم کے لحاظ سے کھیتوں میں پیدا ہونے والی فصلیں، بچوں کی ولادت کے مرحلے، جوانی کے نشیب وفراز، شادی کی مختلف رسومات اور موت کی واردات یعنی کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوک گیت مہد سے لحد تک کے موضوعات کو محیط ہیں۔

ولادت، چھٹی، مہندی، ہلدی، ابٹن، شادی، نکاح، رخصتی، ہجر، فراق، پورے سال کے الگ الگ موسم، سردی، گرمی، بسنت، بہار، مختلف تہوار، فصلوں کی بوائی، کٹائی، تیاری، فاقہ مستی اور خوشحالی ہر موسم اور مواقع پر عوام اپنے دلی جذبات واحسات کو گیت کی شکل میں لے، سر اور تان کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس میں دیہی پن، سادگی، برجستگی، معصومیت اور دلکشی ہوتی ہے۔ کسی سننے والے کو سمجھ میں نہ آئے تو بھی وہ اس کی خاص غنائیت میں گم ہوجاتا ہے اور اس کی نغمگی، چاشنی اور لطیف احساس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لوری، شہانے، جھومر، رخصتی، بارہ ماسہ، برہا، بدیسیا، سوہر، ماہیے، جھولے، دکھڑے وغیرہ، لوک گیت کی بہت سی قسمیں ہیں، تاہم یہاں ان کی اہم اقسام درج کی جاتی ہیں۔

لوری

لوری اس لوک گیت کو کہتے ہیں جو مائیں اپنے بچوں کو سلانے یا بہلانے کے لیے تھپک تھپک کر سناتی ہیں، یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ لوری سے مراد وہ سریلے اور پیارے بول ہیں جو عورتیں اپنے بچوں کو سلانے کے

> گیت کب بنے اور کس نے بنائے۔ اس کا پتہ لگانا گویا آب ظلمات کو تلاش کرنا ہے۔ وقت کا تعین بہت دشوار ہے۔ البتہ بعض گیت ایسے ہیں جو اپنے عہد کی خاص یادگار ہیں اور وہ اس طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ خاص خاص اسلحہ، ہتھیار، لباس، پوشاک، زیوروں کے نام اور کھانوں وغیرہ کا ذکر کچھ اس طرح آجاتا ہے جو اپنے عہد کی یاد تازہ کردیتا ہے۔

لیے دھیمے اور میٹھے سروں میں گنگناتی ہیں۔ لوری کے الفاظ بہت سادہ اور عام فہم ہوتے ہیں۔ یہ لوریاں جو لوک گیت کی ایک قسم ہے اس کا شمار بچوں کے ادب میں ہے۔ بلکہ بچوں کے ادب کا آغاز ہی لوریوں سے ہوتا ہے۔ وہ جب دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے تو سب سے پہلے اسے لوریاں سنائی جاتی ہیں۔ بچوں کو بہلانے اور سلانے کی خاطر مائیں یہ سلسلہ تقریباً 7 برس کی عمر تک جاری رکھتی ہیں۔ عام طور سے ان لوریوں میں پہلے بچوں کی تعریف، پھر مستقبل کی خوبصورت آرزوئیں اور نیند سے متعلق میٹھے جملے ہوتے ہیں تاکہ بچہ اس کی مٹھاس میں مست ہوکر سوجائے۔ بطور مثال چند مشہور لوریاں ملاحظہ کیجیے:

للاّ للاّ لوری، دودھ کی کٹوری، دودھ میں بتاشا، منّا کرے تماشا۔

چندا ماما دور کے، کھوئے پکائیں دودھ کے، آپ کھائیں تھالی میں، منّے کو دیں پیالی میں، پیالی گئی ٹوٹ، منّا گیا روٹھ، نئی پیالی لائیں گے، منّے کو منائیں گے۔

سوجا سوجا میرے راج دلارے سوجا، نندیا رے نندیا آبھی جا، میرے راجا کی انکھین میں گھل مل جا۔

آؤ سہاگن جھولا جھلانے، نورنظر کو اپنے منانے، اللہ نبی کے جاؤں میں واری، لعلوں سے میں نے جھولا سنواری، جھولے گی میری بٹیا پیاری، آنکھوں میں اس کی آئی خماری۔

دور جدید میں جہاں ہماری پرانی قدریں اور تہذیبیں مٹتی جارہی ہیں وہیں لوری بھی قصہ پارینہ بنتی جارہی ہے۔ یہ صنف پوری طرح ختم تو نہیں ہوئی ہے لیکن رفتہ رفتہ معدوم ضرور ہوگئی ہے۔

شہانے

شہانے اس گیت کو کہتے ہیں جو شادی کے موقع پر دلہن کو سجاتے اور سنوارتے وقت خواتین گاتی ہیں جس میں دلہن کے جذبات و احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ شہانے میں کپڑوں، زیوروں اور دیگر ساز وسامان کی فرمائشوں کا ذکر ہوتا ہے۔

جھومر

جھومر یہ لوک گیت کی بہت ہی معروف اور مقبول قسم ہے یہ شادی میں دلہا اور دلہن کے گھر پر گایا جاتا ہے۔ یہ بڑے دلنشیں، دلکش، رومانی، عشقیہ اور جذباتی گیت ہوتے ہیں۔ عام طور سے نو شادی شدہ اور نوجوان کنواری دوشیزائیں یہ گیت گاتی ہیں۔

رخصتی

یہ گیت اس وقت گائے جاتے ہیں جب دلہن رخصت ہوکر میکے سے سسرال جاتی ہے۔ اس میں دلہن کی وداعی اور حزن والم کی کیفیات کو بڑے مغموم انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر امیر خسرو سے منسوب یہ گیت بہت مشہور ہے:

کاہے بیاہی بدیس رے، لکھی بابل مورے

بھائیوں کے دئے محلے دو محلے، ہم کو دیا بدیس رے، لکھی بابل مورے

ہم تورے بابل بیلے کی کلیاں، گھر گھر مانگی جائے رے، لکھی بابل مورے

برہا/بدیسیا

برہا اور بدیسیا اس لوک گیت کو کہتے ہیں جس میں ہجر وفراق کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں۔ اس گیت کو بعض علاقوں میں پردیسیا بھی کہا جاتا ہے یہ بدیسیا کا مترادف ہے جس میں ایک بیوی اپنے شوہر کو پردیس رخصت کرتے ہوئے یا ان کی جدائی میں اپنی دلی کیفیات اور لطیف جذبات کا اظہار کرتی ہے:

میرے ساجن تم کو پردیس ہی جانا تھا
تو میرے ساجن گونا کیوں لائے
کس کے ہاتھ چٹھی لکھ بھیجوں اور کس سے سندیسا کہلاؤں
کوّے سے چٹھی بھیجوں اور پنچھی سے سندیسا کہلاؤں

ان کے علاوہ بھی لوک گیت کی بہت سی قسمیں ہیں جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوک ادب کی اہم اور مقبول صنف رہی ہے۔ جس کی مقبولیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ ہاں! ڈیجیٹل اور سوشل میڈیا کے دور میں اس کے پیشکش کی نوعیت میں تبدیلی ضرور آئی ہے۔ بیسویں اور حالیہ صدی میں بھی لوک گیت کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بہت سے لوک گیت پہلے تھیٹروں اور پھر فلموں میں بھی پیش کیے گئے جس کے ذریعے ان کا شہری کرن کرنے کی کوشش کی گئی جو کہیں نہ کہیں کامیاب بھی رہی۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی کا یہ دعویٰ درست ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''عوام میں گائے جانے جانے والے کئی لوک گیت بھی متعدد فلموں میں پیش کیے گئے اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ ان میں سے کئی گیتوں میں تھوڑا ردو بدل کیا گیا ہے۔ بعض میں اضافہ اور بعض لوک گیت جوں کے توں استعمال کیے گئے ہیں۔ بطور مثال کچھ مشہور گیت کے بول درج ذیل ہیں:

بریلی کے بازار میں جھمکا گرارے
میں میکے چلی جاؤں گی تم دیکھتے رہیو
اٹریا پے کون بھوجی، دیا تو جلا دو
نظر لاگی راجہ تورے بنگلے پر، میں جو ہوتی بیلا چنبیلی، لپٹ رہتی راجا تورے بنگلے پر

لوک گیت عوامی بولیوں ہی سے جنم لیتے ہیں۔ بھوجپوری، اودھی اور برج بھاشا یہ تینوں بولیاں، ہندی اور اردو علاقے کی عوامی بولیاں ہیں۔ ان میں لوک گیتوں کا ایک عظیم سرمایہ موجود ہے۔ ہندی اردو فلموں میں گیت نگاروں نے ان بولیوں میں موجود گیتوں کو اپنایا اور موسیقاروں نے بھی عوامی دھنوں پر گیتوں کو ترتیب دیا۔ آرزو لکھنوی، کیدار شرما، پردیپ، شیلیندر، شکیل بدایونی اور مجروح سلطان پوری، وغیرہ نے ہندی اردو فلموں کو لوک گیت اور سنگیت سے مالا مال کر دیا۔ ان گیتوں میں آتما، رنگ اور رس ہے۔ انداز اور لہجہ ہے اور ایک مخصوص کیریکٹر ہے۔''4

پروفیسر ابن کنول کا بھی یہ خیال ہے کہ ایک طرف عورتوں نے بعض فلمی گیتوں کو اپنے انداز پر ڈھال لیا تو دوسری جانب لوک گیتوں کی مقبولیت اس قدر بڑھی کہ فلم والوں نے انھیں فلموں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

وہ انہی گیتوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو پہلے بیان کیا گیا۔ البتہ ایک اور گیت کو یہ لوک گیت شمار کرتے ہیں جو فلم روٹی، کپڑا اور مکان میں منوج کمار اور زینت امان پر فلمایا گیا ہے۔

ہائے ہائے یہ مجبوری
یہ موسم اور یہ دوری
مجھے پل پل ہے تڑپائے
تری دو ٹکیہ دی نوکری
مرا لاکھوں کا ساون جائے

اس کے علاوہ بھی بہت سے لوک گیت ہیں جو تھوڑی تبدیلی کے ساتھ فلمی دھنوں پر گائے اور سنے جا رہے ہیں۔ بہت سے لوک گلوکار اور گلوکارہ سوشل میڈیا کے توسط سے لوک گیت کو فروغ دے رہے ہیں جو خوش آئند بات ہے۔ بس خدشہ یہ ہے کہ صدیوں سے چلتے آ رہے یہ سیدھے سادے دیہی گیت شہر کے ہجوم میں پہنچ کر کثرت رد و بدل سے اپنی اصلی شناخت نہ کھو دیں۔ حالانکہ یہ آسان نہیں ہے۔ آج بھی تقریباً 70 فیصدی ہندوستان گاؤں اور قصبات میں بستا ہے جہاں لوری، جھولے، پالنے، ماہیے، شہانے، جھومر، رخصتی بدیسیا اور برہا کی تان کھلی فضاؤں میں رقص کرتی ہے اور کانوں میں رس گھولتی ہے۔ یہ لوک گیت انسان کے جذبات و احساسات کی غیر مصنوعی اور فطری آواز ہیں اور فطرت انسان کو ہمیشہ اپنی جانب کھینچتی ہے۔ اس لیے لوک گیت کے مستقبل کے حوالے سے میرا خیال یہ ہے کہ مرور ایام کے ساتھ اس میں جزوی تبدیلی ضرور آئے گی جو کہ زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے لیکن لوک گیت کی یہ قدیم ترین صنف ختم نہیں ہوگی کیونکہ یہ فطرت کے خمیر سے تیار ہوتی ہے۔ ہر عہد اور ہر خطے کے انسانوں میں جو فطری اور نیچرل جذبات و احساسات ہوتے ہیں وہ تقریباً یکساں ہوتے ہیں جس کے اظہار کے لیے لوک ادب اور لوک گیت پہلا اور بنیادی وسیلہ بنتے ہیں کیونکہ اس کے لیے مروجہ شعری اور ادبی اصولوں کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔



حوالے

1 علی جواد زیدی، لوک گیت کی زندہ روایت، مشمولہ، اردو میں لوک ادب (مرتبہ قمر رئیس) سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، 1990، ص۔59
2 مجیب الاسلام، دلّی کے اردو لوک گیت، مشمولہ، اردو میں لوک ادب (مرتبہ قمر رئیس) سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، 1990، ص۔284
3 اظہر علی فاروقی، لوک گیت، ادارہ انیس اردو الہ آباد، ص۔4
4 ڈاکٹر میمونہ دلوی، کوکن اور ممبئی کے اردو لوک گیت، سعدائے دلوی پرنٹ، باندرہ ممبئی، ص۔34

Md. Arshad Hamraz
Department of Urdu
Maulana Azad National Urdu university,
Gachibowli,Hyderabad.500032
Mob. 9536236908
Email: m.arshad01995@gmail.com

محمد عمر رضا

اودھ کی کہاوتوں، محاوروں اور اصطلاحات کا تہذیبی پس منظر

ہر قوم کی تہذیب اس کی زبان، ادب، لوک روایت، کہاوتوں، محاوروں، ضرب الامثال اور تہذیبی اصطلاحات میں سب سے زیادہ محفوظ رہتی ہے، کیونکہ زبان صرف اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ تہذیبی شعور کی محافظ بھی ہوتی ہے۔

تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں کاٹنا، چھانٹنا یا تراشنا۔ انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے کلچر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اصطلاح عام میں کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہا جاتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کی طرز زندگی اور طرز فکر سماجی رشتے، رہن سہن، عادات و اطوار، فنون لطیفہ اور رسوم و روایات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں۔ جب دو قومیں یا چند افراد کسی ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں تو ان کے روز مرہ کے معمولات، نشست و برخاست، عادات و اطوار، لباس و پوشاک، حاجات و ضروریات وغیرہ ایک دوسرے میں مخلوط و مشترک ہو جاتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ایک تہذیب جنم لیتی ہے۔ اور یہی تہذیب آگے چل کر کسی ایک قوم کا تشخص یا علامتی نشان بھی بن جاتی ہے۔

اس کے برعکس تمدن عربی لفظ مدن سے نکلا ہے جس کے معنی شہری زندگی اور منظم معاشرت کے ہیں۔ تمدن سے مراد انسانی زندگی کے مادی، سماجی اور سیاسی نظام، رہائش، تعمیرات، صنعت، تجارت، ذرائع و اسباب کی ترقی ہے۔ اصطلاح میں تمدن ایک ایسی تہذیب کو کہا جاتا ہے جو وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی ہو۔ اس میں سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام پروان چڑھ رہا ہوتا ہے۔ تمدن حقیقت میں ضروریات زندگی کی پیداوار ہے۔ زندگی بسر کرنے کے لیے جیسے جیسے ضروریات پیدا ہوتی ہیں وہ رفتہ رفتہ تمدن کو جنم دیتی ہیں۔ تمدن اور تہذیب کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ بعض مورخین نے تہذیب کو اصل اور تمدن کو اس کے بطن سے نکلنے والی شاخ کہا ہے۔ تہذیب کا تعلق نظریات سے بھی ہے جب کہ تمدن کا تعلق اعمال سے ہوتا ہے۔ تہذیب اور تمدن میں فرق بیان کرتے ہوئے سید عبداللہ بیان کرتے ہیں۔

''تہذیب کلچر کے معنوں میں اس سے مراد ہیں انفرادی و اجتماعی، ذوقی و اخلاقی اور معاشرتی رویے اور اجتماعی عادات۔ وسیع تر معنوں میں اس میں فنون بھی شامل ہوں گے اور علوم بھی اور آداب و اخلاق بھی، لیکن قانون اور ارادت و تنظیمات کو اس میں علی العموم شامل نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ تمدن میں آتے ہیں۔ تہذیب کسی تمدن کے آزادانہ نشو و نما پانے والے حصے یا رخ کو کہتے ہیں اور تمدن میں اس کے علاوہ شعبے بھی شامل ہیں۔''[1]

بلا شبہ ہر قوم کی تہذیبی بقا اور شناخت اس کی زبان سے وابستہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین لسانیات و سماجیات کسی بھی تہذیب کی شناخت کے لیے اس کو دستاویز قرار دیتے ہیں۔

اودھ کی تہذیب برصغیر کی ان چند ممتاز تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے جنھوں نے اردو زبان و ادب کو بے مثال ادبی، لسانی اور ثقافتی سرمایہ عطا کیا۔ اودھ کی کہاوتیں، محاورے اور تہذیبی اصطلاحات صرف روزمرہ گفتگو کا حصہ نہیں بلکہ وہاں کے اخلاق، وضع داری، شائستگی، مزاح، خاندانی روایات اور معاشرتی اقدار کی بھرپور عکاس ہیں۔ اس لیے زبان اور تہذیب کا رشتہ نہایت گہرا مضبوط اور ناگزیر مانا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہر قوم کی تہذیب اس کی زبان میں جھلکتی ہے۔ زبان میں موجود الفاظ، محاورے، کہاوتیں، ضرب الامثال، لوک گیت، دعائیں، سلام و دعا اور روزمرہ کے معمولات اس قوم کے مزاج اور تہذیبی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ اگر کسی قوم کی زبان میں احترام، شائستگی اور اخلاقی اقدار نمایاں ہوں تو اس سے اس معاشرے یا قوم کے تہذیب یافتہ ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک تہذیب کس طرح تشکیل پاتی ہے اور کن مراحل سے ہو کر گزرتی ہے بقول ڈاکٹر احمد طارق ملاحظہ ہو۔

''کسی تہذیب کے بننے سنورنے اور اس کے خدوخال کے تعین میں اس خطے کے جغرافیائی حالات اہم کردار ادا کرتے ہیں جہاں وہ تہذیب نمو پزیر ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان کی زندگی، اس کے رسم و رواج اور اس کے اعتقادات کے تعین میں جغرافیائی حالات پوری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ دراصل تاریخی، سیاسی، اور اقتصادی ضروریات کے پیش نظر کسی جغرافیائی خطے میں قیام کرنے والی مختلف قوموں کے درمیان جو اتحاد، یگانگت، یکجہتی اور ہم آہنگی کی فضا پیدا ہوتی ہے اسے

ہی ہم تہذیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"[2]

تہذیب زبان کو نئے نئے الفاظ، جدید اصطلاحات اور محاورات عطا کرتی ہے۔ جب کہ زبان تہذیب کو محفوظ رکھتی اور اسے نسل در نسل منتقل کرتی ہے۔ اس اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جب کسی قوم کی تہذیب میں تبدیلی آتی ہے تو اس کی زبان بھی متاثر ہوتی ہے، اور جب زبان کمزور پڑنے لگتی ہے تو تہذیبی روایات بھی ماند پڑنے لگتی ہیں۔ اودھ کی تہذیب اس حقیقت کی بہترین مثال ہے۔

اودھ کی شائستگی، وضع داری، مہمان نوازی، رسم و رواج، عادات واطوار، تکلف بازی، احترام اور نفاست اردو زبان کے محاوروں، کہاوتوں، تہذیبی اصطلاحات اور روزمرہ کے اسالیب میں نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریف لائیے، حضور، قبلہ و کعبہ، جناب عالی، نوحہ گری، مانجھا، تیرہ تیزی، مرغ بازی، بٹیر بازی وغیرہ جیسے دیگر تہذیبی الفاظ و اصطلاحات صرف لغوی معنی نہیں رکھتے ہیں، بلکہ اودھ کی تہذیبی اقدار اور معاشرتی روایات کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اگر کسی قوم کی تہذیب کو سمجھنا ہو تو اس کی زبان محاوروں اور کہاوتوں کا مطالعہ کیا جائے، کیونکہ یہی عناصر اس قوم کی تہذیبی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کسی بھی زبان میں موجود تہذیبی عناصر نسل در نسل زبانی و تحریری طور پر منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی تہذیب زوال پذیر بھی ہو جائے تو انھیں کے ذریعے اس کی بازیافت ممکن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین لسانیات اور سماجیات کسی بھی قوم کی تہذیب کو سمجھنے کے لیے اس کی زبان اور لوک ادب کا مطالعہ ضروری قرار دیتے ہیں۔

برصغیر کی تاریخ میں اودھ کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ خصوصاً لکھنؤ نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں علم و ادب، فنونِ لطیفہ، معاشرت، آدابِ زندگی اور زبان و بیان کے ایسے اعلیٰ نمونے پیش کیے جنھوں نے اردو ادب کو بے حد متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی لکھنوی تہذیب کو اردو ادب کی سب سے نفیس، شائستہ اور باوقار تہذیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اودھ کی تہذیب کی سب سے نمایاں خصوصیات میں شائستگی، وضع داری، اخلاق، مہمان نوازی، احترامِ انسانیت، گفتگو کی نفاست، لباس، خوراک، میل جول اور آدابِ مجلس وغیرہ شامل ہیں۔

اودھ کے شعرا، ادبا اور نثر نگاروں نے اردو زبان کو نہ صرف ادبی حسن عطا کیا بلکہ اسے تہذیبی لطافت اور معاشرتی وقار بھی بخشا۔ میر انیس، مرزا دبیر، آتش، ناسخ، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور دیگر ادیبوں کی تخلیقات میں اودھ کی تہذیب پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ خصوصاً عبدالحلیم شرر نے اپنی تصنیف "گزشتہ لکھنؤ" میں اودھ کی معاشرت، رسم و رواج، آداب، تہوار، لباس، خوراک اور طرزِ زندگی کی ایسی جامع تصویر پیش کی ہے جو اس تہذیب کا مستند تاریخی سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔

> **اودھ کی تہذیب برصغیر کی ان چند ممتاز تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے جنھوں نے اردو زبان و ادب کو بے مثال ادبی، لسانی اور ثقافتی سرمایہ عطا کیا۔ اودھ کی کہاوتیں، محاورے اور تہذیبی اصطلاحات صرف روزمرہ گفتگو کا حصہ نہیں بلکہ وہاں کے اخلاق، وضع داری، شائستگی، مزاح، خاندانی روایات اور معاشرتی اقدار کی بھرپور عکاس ہیں۔ اس لیے زبان اور تہذیب کا رشتہ نہایت گہرا مضبوط اور ناگزیر مانا جاتا ہے۔**

اردو ناول، افسانے، داستان، مرثیے اور خود نوشتیں اودھ کی تہذیب کے مطالعے کے اہم ذرائع ہیں۔ ان میں محفوظ کہاوتیں، محاورے اور تہذیبی اصطلاحات اس تہذیب کی تاریخی، سماجی اور ثقافتی شناخت کو آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے اودھ کا تہذیبی سرمایہ اردو ادب کا ایک قیمتی ورثہ تصور کیا جاتا ہے، جس کا مطالعہ نہ صرف ادبی بلکہ سماجی اور ثقافتی اعتبار سے بھی بے حد اہم ہے۔

یہاں سے اودھ کے چند مشہور و معروف محاورے پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ ان کے ذریعے وہاں کی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو سمجھا جا سکے۔

لکھنؤ کا لوٹا ہونا

مطلب: ناقابل اعتماد ہونا یا اپنا موقف بار بار بدلنا۔

دراصل لکھنؤ کا لوٹا جو پیتل اور تانبے سے بنتا تھا۔ گول تلی ہونے کی وجہ سے زمین پر ٹک نہیں پاتا، بار بار گرتا رہتا تھا۔ برعکس دہلی کے جس کی تلی چوکور یا چپٹی ہوتی تھی۔ اسی پس منظر میں یہ محاورہ ہر اس شخص کے لیے بولنے لگے جو ناقابل اعتماد تھا اور اپنا موقف بار بار بدلتا تھا۔

زعفران کے کھیت میں ہونا

مطلب: بے حد خوش ہونا اور بے فکر رہنا۔

اودھ کی تہذیب میں یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا تھا جب کوئی بہت زیادہ ہنستا اور بے فکر رہتا تھا۔ خاص طور پر نوابی دربار میں یہ مشہور تھا کہ جب کوئی زعفران کی کاشتکاری کرتا یا اس کے کھیت میں جاتا تو وہ بہت ہنستا اور بے جا خوش نظر آتا تھا۔ اس لیے دربار میں ایسے جملے بولے جانے لگے کہ میاں آج کل زعفران کے کھیت میں ہیں۔

دسترخوان بڑھانا

مطلب: شکم سیر ہونے کے بعد برتنوں کو اٹھانا۔

اودھ خصوصاً لکھنوی تہذیب کی یہ اعلیٰ مثال تھی کہ جب دسترخوان پر بیٹھے لوگ شکم سیر ہو جاتے تو وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ دسترخوان اٹھا لو، یا کھانا اٹھا لو۔ اس طرح کے جملے اس تہذیب میں بدشگونی اور بے برکتی پر متحمل مانے جاتے تھے۔ اس لیے وہ مذکورہ جملے نہ بول کر یہ کہتے تھے کہ دسترخوان بڑھاؤ۔

اللہ میاں کی گائے ہونا

مطلب: کسی کا بہت بھولا بھالا یا سیدھا سادھا ہونا۔

یہ محاورہ اکثر اودھ کی خواتین کی زبانی بولا جاتا تھا۔ ان کے گھروں کی کچھ لڑکیاں زمانے سے بالکل بے فکر لاتعلق رہتی تھیں، بہت سی لڑکیاں تو ایسی تھیں کہ انھیں دنیاداری سے کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ یعنی وہ حد سے زیادہ بھولی بھالی ہوتی تھیں۔ اس لیے وہاں کی خواتین انھیں اکثر یہ کہتی تھیں کہ فلاں لڑکی تو اللہ میاں کی گائے معلوم ہوتی ہے۔

بات کو بونگڑ بنانا یا بات کا بتنگڑ بنانا

مطلب: مبالغہ آرائی کرنا یا بڑھا چڑھا کر بات بتانا۔

بونگڑ دھی زبان میں بانس کے خالی حصے کو بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ بونگڑ مبالغہ آرائی کے لیے بھی بولا جاتا تھا۔ جب بھی کوئی معمولی سی بات کو مرچ مصالحے کے ساتھ بہت بڑھا چڑھا کر بتاتا، تو اس وقت یہ محاورہ منفی جملے میں بولا جاتا تھا کہ، میاں بات کو بونگڑ مت بناؤ اور پھر بعد میں کچھ اس طرح بولنے لگے کہ بات کا بتنگڑ نہ بناؤ۔

6 دیگوں کا کھنکنا

مطلب کھانا بننا یا پکوان تیار ہونا۔

لکھنوی تہذیب میں ہر خوشی وغم کے موقع پر لوگوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ قریبی رشتے دار اور پڑوسی ان مواقع پر پیش پیش رہتے تھے۔ جب بھی کوئی محفل یا تقریب منعقد ہوتی تو اس کے اختتام پر یا اسی کے دوران لوگ دیگوں کی آواز سے یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ یہاں کھانے کا اہتمام ہے یا نہیں۔ کیونکہ ان کا کھنکنا اس بات کی علامت ہوتی کہ یہاں پکوان جاری ہے۔

چکنی دال کا چمچہ بننا

مطلب: کسی مالدار یا دولت مند شخص کی خوشامد یا چاپلوسی کرنا۔

یہ محاورہ اکثر لکھنوی بیگمات کی زبانی بولا جاتا تھا۔ اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ ان کی دال ہمیشہ دیسی گھی سے تڑکہ لگی ہوتی تھی۔ جب جب دال بنتی تب تب چمچہ سے دیسی گھی کا تڑکہ لگتا۔ اس طرح دال اور چمچہ کا چولی دامن کا رشتہ ہو گیا، کیونکہ اب بغیر دال کے چمچہ بیکار تھا۔ بس اسی نسبت سے وہاں کی بیگمات نے ان درباریوں کو چکنی دال کا چمچہ بولنا شروع کر دیا جو اپنے آقاؤں کی دولت و جاگیر دیکھ کر ہمہ وقت ان کے آگے پیچھے پھرتے رہتے، جی حضوری کرتے تھے۔

لکھنؤ کی کائنات ہونا

مطلب: ظاہری بناؤ سنگار دکھاوا کرنا، لیکن حقیقت میں حیثیت کچھ نہ ہونا۔

اس محاورے کا پس منظر یہ ہے کہ لکھنؤ کا چراغ بجھنے کے بعد جب نوابوں اور جاگیرداروں کی جاگیریں، عزت وشہرت سب کچھ ختم ہو گئی، تب بھی انھوں نے ظاہری طور پر اپنا ٹھاٹ باٹ، شان وشوکت برقرار رکھنا چاہی۔ لیکن حقیقت میں اب ان کا رعب ودبدبہ پہلے کی طرح نہیں رہا تھا۔ ان کی اسی حالت کو دیکھ کر عوام

> اودھ کے شعرا، ادبا اور نثر نگاروں نے اردو زبان کو نہ صرف ادبی حسن عطا کیا بلکہ اسے تہذیبی لطافت اور معاشرتی وقار بھی بخشا۔ میر انیس، مرزا دبیر، آتش، ناسخ، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور دیگر ادیبوں کی تخلیقات میں اودھ کی تہذیب پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ خصوصاً عبدالحلیم شرر نے اپنی تصنیف ''گزشتہ لکھنؤ'' میں اودھ کی معاشرت، رسم و رواج، آداب، تہوار، لباس، خوراک اور طرزِ زندگی کی ایسی جامع تصویر پیش کی ہے جو اس تہذیب کا مستند تاریخی سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔

انھیں طنزیہ طور پر یہ کہتی تھی کہ ہماری لکھنؤ کی کائنات بس دیکھنے کی ہے۔

آسمان کے تارے توڑنا

مطلب: ناممکن کو ممکن بنانا یا بہادری کا دعویٰ

عہد نوابین میں شاہی فوج کا ایک بانکے نامی دستہ لڑائی اور بہادری میں بہت مشہور تھا۔ اس کی بہادری دور دور تک مشہور تھی۔ بہادری وشجاعت کے پیش نظر ان کی خود کی باتوں میں مبالغہ آرائی بھی پیدا ہونے لگی تھی۔ ہر بات کو بڑا چڑھا کر کرنا ان کی عادت بن گئی۔ یہاں تک کہ وہ ناممکن کاموں کو ممکن بنانے کا دعویٰ کرنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ بعد میں ان کی شجاعت کو ثابت کرنے کے لیے اس طرح کے جملے بولے جانے لگے جو محال کاموں پر مشتمل تھے جیسے کہ آسمان سے تارے توڑنا۔

ٹیڑھی ٹوپی ہونا

مطلب: غرور، تکبر، رعب ودبدبہ برقرار رکھنا۔

اہل لکھنؤ کا یہ طرہ امتیاز تھا کہ وہ اپنی دو پلی ٹوپی کو ایک جانب ٹیڑھی رکھتے تھے۔ اس سے وہ اپنی شان و شوکت اور رعب ودبدبہ دکھانا چاہتے تھے۔ اگر کوئی ان سے ٹوپی سیدھی کرنے کو کہتا بھی تھا تو اس کو اپنی شان کے خلاف گردانتے، یہاں تک کہ نوبت لڑائی جھگڑے تک جا پہنچتی تھی۔ پھر بعد میں یہ محاورہ ہر مغرور اور متکبر شخص کے لیے عام ہو گیا۔

اب یہاں سے اودھ کی چند اہم کہاوتیں بھی بیان کی جا رہی ہیں جن سے بخوبی معلوم ہو سکے کہ کہاوتیں کسی بھی تہذیب کی حفاظت میں کس قدر رول ادا کرتی ہیں۔ تہذیب کے معنی خیز جملے انہی میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ چند کہاوتیں ملاحظہ فرمائیں۔

اندھیر نگری چوپٹ راجا

مطلب: جہاں کوئی قانون نہ ہو، ہر طرف بے انصافی اور بدانتظامی کا راج ہو۔

کہا جاتا ہے کہ قدیم اودھ میں ایک ایسا نادان بادشاہ یا نواب گزرا تھا جس کی سلطنت میں عقل وشعور کی کوئی قدر نہیں تھی۔ کسی طرح کا نظام یا قانون نہ ہونے کی وجہ سے سبزی اور مٹھائی دونوں ٹکا سیر میں بکتی تھیں۔ اسی کے پس منظر میں اودھ کے زوال کے وقت انگریزی راج کی ناانصافی و بدانتظامی پر بھی یہ کہاوت طنزاً بولی جانے لگی۔

کتے کی دم بارہ برس نلکی میں رکھی تب بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی نکلی

مطلب: کسی کی فطرت میں کج رَوی، بری عادت وخصلت کا کبھی نہ بدلنا۔

لکھنؤ کی تہذیب میں نفاست پسند بیگمات براہِ راست گالی گلوچ یا بدزبانی کو سخت عیب مانتی تھیں۔ اس لیے وہ ایسے کاٹ دار جملے بطور طنز اودھ کے ان درباری، مصاحبین اور محل کے عیار خادموں کے لیے بولتی تھیں جو بار بار کی تنبیہ اور سزاؤں کے باوجود اپنی چغلی، جاسوسی اور چوری چکاری جیسی خصلتوں سے باز نہیں آتے تھے۔ لکھنؤ کے شرفا انہی کج روی پر اڑے رہنے والے لوگوں کو بے نقاب کرنے کے لیے یہ کہاوت بولتے تھے۔

نیا رنگ لائی گلہری

مطلب: کسی کم حیثیت، یا نااہل شخص کا اچانک اپنے رتبے سے بڑھ کر کوئی عجیب حرکت کرنا۔

اس کہاوت کا پس منظر یہ ہے کہ نوابی دربار کے نئے دولت مند، یعنی نئے نئے امیر بننے والے وہ مصاحبین جو نوابوں کی قربت پا کر اچانک اپنی حیثیت بھول جاتے اور نوابی ٹھاٹھ باٹ کی مضحکہ خیز نقل اتارنے لگتے تھے۔ بیگمات اور لکھنؤ کے شرفا جب بھی کسی کم ظرف انسان کو ایسی اوچھی حرکت کرتے دیکھتے تو اس کے لیے طنزاً کہتے تھے، لو اب نیا رنگ لائی گلہری۔

بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی

مطلب: کسی عارضی بچاؤ یا مہلت کے باوجود ایک نہ ایک دن قانون کی گرفت میں آ جانا۔

اودھ کے تہذیبی پس منظر میں یہ کہاوت ان چغل خوروں اور سازشی مصاحبوں کے لیے بولی جاتی تھی جو نواب صاحب یا انگریز حکام کی قربت کا فائدہ اٹھا کر محل یا دربار میں مسلسل خرابیاں پیدا کرتے تھے اور ہر بار کسی نہ کسی بہانے سزا سے بچ نکلتے تھے۔ ایسے ہی شاطر لوگوں کو خبردار کرنے یا ان کے انجام کی پیشگوئی کرنے کے لیے یہ کاٹ دار جملہ بولا جاتا تھا کہ جتنی بھی مہلت مل جائے ایک دن حقیقت کھلنے پر تمھارا شکار ہونا طے ہے بالکل ویسے ہی جیسے قصائی کے گھر پلے بکرے کا ذبح ہونا یقینی ہوتا ہے۔

جل تو جلال تو، آئی بلا ٹال تو

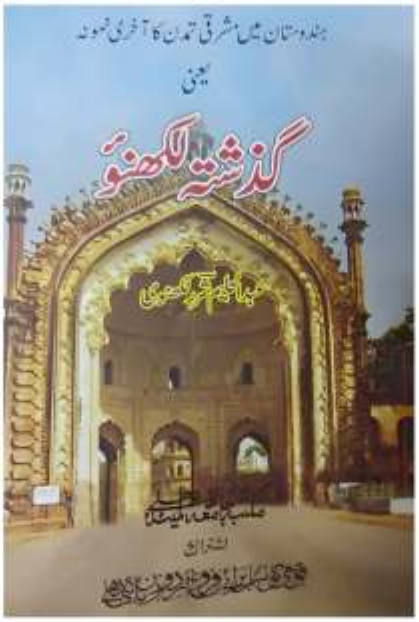
مطلب: کسی ناگہانی آفت، مصیبت یا ناپسندیدہ شخص سے فوری نجات پانے کے لیے وظیفہ کرنا۔

اودھ اور خاص طور پر لکھنوی معاشرے میں کچھ لوگ توہم پرستی اور نظر بد کا خوف بہت زیادہ مانتے تھے۔ ان کے گھروں میں جب اچانک کوئی خوفناک آواز سنائی دیتی یا کسی آسیب کا وہم ہوتا تو خواتین فوراً یہ الفاظ بطور وظیفہ پڑھنا شروع کر دیتی تھیں تاکہ آنے والی مصیبت ٹل جائے۔ بعد میں یہ کہاوت ان لوگوں کے اچانک گھر آنے پر بطور طنز استعمال ہونے لگی جنھیں اس معاشرے میں جھگڑالو یا منحوس سمجھا جاتا تھا۔

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

مطلب: خود قصوروار یا مجرم بے قصور شخص پر الزام لگائے یا اسے ڈانٹنے لگے۔

اودھ کی یہ کہاوت بازاروں عدالتوں اور تھانوں میں بہت رائج تھی کیونکہ اصل مجرم اپنی غلطی تسلیم کرنے



کے بجائے دوسروں پر الزام لگا کر خود کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ عوام کے مشاہدے اور معاشرتی انصاف کی نمائندہ کہاوت ہے۔

کپڑا نہ لتہ، پان کھائے البتہ

مطلب: ضروری چیزوں پر خرچ کرنے کے بجائے غیر ضروری اور نمائش والی چیزوں پر خرچ کرنا۔

یہ کہاوت اودھ کی مشہور طنزیہ کہاوتوں میں سے ایک ہے۔ اودھ کی تہذیب جس میں پان چبانا خوشحالی اور شوخی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ بعض لوگ مالی حالت خراب ہونے کے باوجود پان چبانے کو اپنی شان سمجھتے تھے۔ جب کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات پوری نہ کر کے فقط دکھاوے، عیش، شوق یا غیر ضروری اشیا پر خرچ کرتے تھے۔ ان کی شوخی جھاڑنے کے لیے یہ کہاوت وجود میں آئی۔

کھری مزدوری چوکھا کام

مطلب: خالص مزدوری دے کر بہترین کام ہوتا ہے۔

یہ کہاوت اودھ کی تاریخ تہذیب اور وہاں کے نوابوں کی فیاضی سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ جب 1784 میں اودھ شدید قحط کی لپیٹ میں آ گیا۔ نواب آصف الدولہ نے غریبوں کی عزتِ نفس کا خیال رکھتے ہوئے انھیں خیرات دینے کے بجائے روزگار دینے کا فیصلہ کیا اور لکھنؤ میں آصفی امام باڑہ "بڑا امام باڑہ" کی تعمیر شروع کروائی۔ دن و رات نواب کی طرف سے ہر مزدور کو اس کی کھری اور خالص مزدوری نقد یا اناج کی صورت میں دی جاتی تھی اس کے عوض مزدور بھی پورے اخلاص کے ساتھ کام کرتے تھے۔ یہیں سے یہ کہاوت رائج ہوگئی کہ اگر دینے والا ہاتھ کھلا رکھے اور "کھری مزدوری" دے تو کام کرنے والا بھی دل لگا کر "چوکھا کام" کرتا ہے۔

رسی جل گئی پر بل نہ گیا

مطلب: غرور، تکبر، اور ضد ختم نہ ہونا۔

یہ کہاوت اودھ کی تاریخ و تہذیب سے بڑا گہرا تعلق رکھتی ہے۔ نوابوں، رئیسوں کی جاگیریں جب ختم ہوگئیں، جب وہ مال و دولت سے بھی خالی ہو گئے۔ تب بھی ان کی خاندانی انا، غرور، تکبر اور ٹھاٹ باٹ کی عادتیں ختم نہ ہوئیں۔ جب بھی کسی ضرورت کے پیش نظر بازار جاتے تو اکڑ کا یہ عالم ہوتا کہ خریدار سے سیدھے منھ بات بھی نہیں کرتے تھے۔ اس رویہ کو دیکھ کر عوام میں یہ کہاوت عام ہوگئی کہ رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔

سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی

مطلب: بہت زیادہ بد اعمال شخص کا اچانک پرہیزگار ہو جانا۔

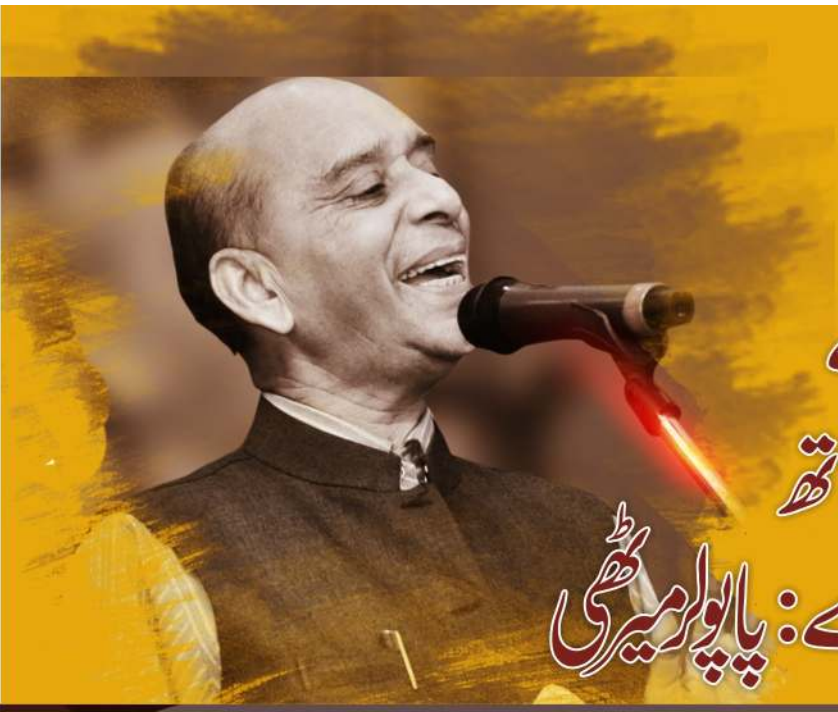
یہ کہاوت ہر اس شخص کے لیے بولی جاتی تھی جو پہلے اپنی خواہشات، برائیوں اور بداعمالیوں میں خوب مبتلا رہا ہو لیکن بعد میں اچانک سے مذہبی تقدس اور نیکی کا ظاہری لبادہ اوڑھ لیتا ہو یعنی توبہ و استغفار کر کے نیک اور پرہیزگار بن جائے۔ ایسے شخص کو طنزیہ طور پر کہا جاتا تھا، سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔

علاوہ ازیں یہ تمام کہاوتیں بھی اودھ سے تعلق رکھتی ہیں۔ بادشاہوں کی محبت میں تو گدا تک مستغنی ہو جاتا ہے، اپنے بچھڑے کے دانت سبھی پہچانتے ہیں، شیخ کیا جانیں صابون کا بھاؤ، گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولہ، کم کھائے غم نہ کھائے، بھاگے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی، قہر درویش بر جان درویش، اکیلی تو لکڑی بھی چولہے میں نہیں جلتی، نیکی اور پوچھ پوچھ وغیرہ جن سے اودھ کے تہذیبی پس منظر کی شناخت کسی حد تک ممکن ہو پاتی ہے۔

حوالہ جات

1. سید عبداللہ، کلچر کا مسئلہ، صفحہ نمبر 6،
2. ڈاکٹر احمد طارق، جدید اردو افسانے میں سماجی و ثقافتی جہات، صفحہ 31

Mohammad Umar Raza
Research Scholar
Centre for the Study of Urdu Culture
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-500032
Mob. 9927674962
Email: umarrazvi9962@gmail.com





فرقان احمد سردھنوی

اچھا مزاح وہ ہے جو ہنسانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرے: پاپولر میرٹھی

ڈاکٹر سید اعجاز الدین شاہ کی شناخت ایک استاذ، مصنف اور شاعر کے طور پر ہوتی ہے۔ میرٹھ کالج میرٹھ کے شعبۂ اردو میں وہ کئی برس تک درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے۔ مزاحیہ شاعری کے باب میں ان کا شمار صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ 45برس کے طویل عرصے میں وہ 10000 سے زائد مشاعروں اور کوی سمیلنوں میں شریک ہوچکے ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ کئی دوسرے ممالک جن میں امریکہ اور گلف کے کئی ممالک کے مشاعروں میں بھی ان کی شرکت رہی ہے۔ پاپولر میرٹھی کی کئی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں، ہنس کر گزار دے، نوائے رفتہ، ڈبل رول، یادوں کے دریچے وغیرہ ان کی قابل ذکر کتابیں ہیں۔ اس انٹرویو میں ڈاکٹر فرقان احمد سردھنوی نے پوپلر میرٹھی کی شخصیت، ان کی ادبی خدمات بالخصوص مشاعرے کے حوالے سے دلچسپ سوالات کیے ہیں جن کا انھوں نے بہت خوبصورتی سے جواب دیا ہے۔ (ادارہ)

فرقان احمد سردھنوی: سب سے پہلے اپنے تعلیمی پس منظر اور ادبی سفر کے آغاز کے بارے میں بتائیے۔

پاپولر میرٹھی: میری ابتدائی تعلیم فیض عام انٹر کالج، میرٹھ میں ہوئی۔ میں وہاں طلبہ یونین کا صدر بھی رہا۔ میری ادبی زندگی کا ایک اہم واقعہ اسی زمانے میں پیش آیا، جب کالج میں ایک بڑا مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز شعرائے کرام شریک تھے اور نظامت محترم وسیم بریلوی صاحب نے کی۔ انھوں نے مجھے ابتدا ہی میں کلام پڑھنے کی دعوت دی اور میرے تعارف میں پیش گوئی کی کہ آج کا یہ مزاحیہ شاعر مستقبل میں بڑا شاعر بن کر ابھرے گا۔ اسی مشاعرے میں میرا یہ شعر بہت پسند کیا گیا۔

میں یہ کہتا ہی رہا میں تو نہیں دیوانہ
یہ الگ بات میری جیب سے پتھر نکلے

یہی مشاعرہ مجھے مشاعروں کی دنیا سے متعارف کرانے کا سبب بنا۔

ف ا س: میرٹھ کالج سے آپ کی وابستگی اور ادبی تربیت کیسے ہوئی؟

پ م: میں نے میرٹھ کالج سے بی کام اور ایم اے اردو کیا اور تقریباً سات برس اس کے شعبۂ اردو سے تدریسی طور پر وابستہ رہا۔ میرے لیے میرٹھ کالج علمی و ادبی تربیت کا اہم مرکز رہا۔

مجھے ڈاکٹر بشیر بدر صاحب جیسے ممتاز شاعر سے استفادہ کا موقع ملا۔ میری پی ایچ ڈی کا رجسٹریشن ابتدا میں انھی کے زیر نگرانی ہوا، لیکن بعد میں ان کے میرٹھ کالج چھوڑنے کے باعث میں نے اپنا تحقیقی کام پروفیسر خالد صاحب کی نگرانی میں مکمل کیا۔

ف ا س: آپ کی شاعری میں طنز و مزاح کا رجحان کیسے پیدا ہوا؟

پ م: مزاح شاید میری طبیعت میں شروع ہی سے موجود تھا۔ میں نے اپنے اردگرد کے معاشرے، لوگوں کے رویوں اور روزمرہ زندگی کے تضادات کو غور سے دیکھا اور محسوس کیا کہ ان میں مزاح کے بے شمار پہلو موجود ہیں۔ میری کوشش رہی کہ مزاح محض ہنسانے کے لیے نہ ہو بلکہ اس کے اندر کوئی فکر بھی موجود ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اچھا طنز وہ ہے جو انسان کو ہنسائے بھی اور سوچنے پر مجبور بھی کرے۔

ف ا س: آپ کے مشاعراتی سفر میں کون سا واقعہ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے؟

پ م: 1989 کا کراچی کا مزاحیہ مشاعرہ میری زندگی کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس مشاعرے کی صدارت عظیم مزاحیہ شاعر دلاور فگار صاحب نے کی تھی۔ ہندوستان سے اتفاقاً میں ہی واحد شاعر تھا جو کراچی پہنچ سکا، کیونکہ دوسرے مزاحیہ شعرا کو ویزا نہیں مل سکا تھا۔

پاکستان ایمبیسی میں معروف شاعر محبوب ظفر صاحب ملازمت کرتے تھے اور میں ان کے ساتھ پہلے مشاعرہ پڑھ چکا تھا۔ انھی کی کوشش سے میرا ویزا ممکن ہوا۔ کراچی کے سامعین نے جس محبت سے میرے کلام کو سنا اور داد دی، اس نے میرے حوصلے کو بہت بڑھایا۔ اس کے بعد بیرون ملک مشاعروں کا سلسلہ چل نکلا۔

ف ا س: دلاور فگار صاحب کے ساتھ آپ کی کوئی خاص یاد؟

پ م: دلاور فگار صاحب کی محبت میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ انھوں نے کراچی کلب میں میری موجودگی میں میرے عنوان سے ایک طویل نظم 'پاپولر میرٹھی، اکبر الہ آبادی کی نظر میں' پڑھی تھی۔ یہ نظم میری کتاب میں بھی موجود ہے۔

ایک بڑے مزاحیہ شاعر کا اپنے ہم عصر کے لیے اس محبت سے نظم کہنا میرے لیے ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ میں اسے اپنی ذات کا اعزاز کم اور دلاور فگار صاحب کی محبت وشفقت کا ثبوت زیادہ سمجھتا ہوں۔

ف ا س: بیرون ملک مشاعروں کے حوالے سے آپ کے تجربات کیسے رہے؟

پ م: اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا کے مختلف ملکوں میں اردو زبان اور شاعری کی نمائندگی کا موقع دیا۔ پاکستان کے علاوہ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، ماریشس، سنگاپور، متحدہ عرب امارات، قطر، عمان، بحرین اور سعودی عرب سمیت کئی ملکوں میں مشاعرے پڑھے۔

یہ میرے لیے صرف سفر نہیں تھے بلکہ اردو کے عالمی رشتے سے جڑنے کے مواقع تھے۔ ہر جگہ ہندستانی اردو شاعر کی حیثیت سے جو محبت ملی، اسے میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا کرم سمجھتا ہوں۔

ف ا س: دبئی اور قطر سے آپ کی ادبی وابستگی خاصی گہری رہی ہے۔

پ م: جی ہاں، دبئی اور قطر سے میرا ادبی تعلق بہت پرانا ہے۔ قطر تقریباً 30 مرتبہ جانے کا موقع ملا اور دبئی میں بھی متعدد عالمی مشاعروں میں شرکت کی۔

قطر میں مرحوم مصیب الرحمٰن صاحب نے میری اردو کتاب 'ڈبل رول' شائع کی۔ مجھے جشن جگن ناتھ آزاد، جشن محشر بدایونی، جشن شہزاد احمد اور جشن امجد اسلام امجد جیسی اہم ادبی تقریبات میں شرکت کا شرف بھی حاصل ہوا۔

ف ا س: دہلی کے مشاعروں سے آپ کی طویل وابستگی کے بارے میں کچھ بتائیے۔

پ م: دہلی میں محترمہ کامنا پرشاد جی کے جشن بہار کے عالمی مشاعرے میں تقریباً پندرہ بیس برس تک مسلسل شرکت کی۔ اسی طرح ڈی سی ایم کے مشاعروں میں بھی تقریباً پندرہ برس تک شرکت کا موقع ملا اور محترم مادھو جی کی محبتیں ہمیشہ حاصل رہیں۔

لال قلعہ میں اردو اکادمی کے آزادی مشاعرے میں بھی 1990 سے مسلسل شرکت کرتا آیا ہوں۔ مختلف ٹی وی چینلوں پر بھی میرا کلام نشر ہوتا رہا ہے۔ ان مواقع کو میں اپنی ذات کی کامیابی نہیں بلکہ اردو کی محبت کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔

ف ا س: اپنی اہم کتابوں کے بارے میں بتائیے۔

پ م: میری کتابوں میں ہنس کر گزار دے، ڈبل رول، پاپولر کلام (ہندی)، غالب اور میں (ہندی) اور 'یادوں کے دریچے' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مرحوم مناظر عاشق ہرگانوی نے میرے فن وشخصیت پر 'ذکر، فکر اور فن' مرتب کی۔

'یادوں کے دریچے' میری نثری کاوش ہے، جس میں میری یادیں، مشاہدات اور تجربات شامل ہیں۔ نثر میں میں پہلے بھی لکھتا رہا، لیکن لاک ڈاؤن کے دوران مجھے زیادہ وقت ملا تو میں نے ان یادوں کو باقاعدہ کتابی صورت دی۔ میرے طنزیہ و مزاحیہ مضامین مختلف معروف اردو جرائد میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔

میرے نزدیک طنز و مزاح صرف قہقہہ پیدا کرنے کا نام نہیں۔ اچھا مزاح وہ ہے جو ہنسانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرے۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ میرے مزاح میں شگفتگی کے ساتھ فکر، اور قہقہے کے ساتھ تہذیب موجود ہو۔ کسی فرد کی دل آزاری یا تضحیک کو میں مزاح نہیں سمجھتا۔ معاشرے کی کمزوریوں پر ضرور بات ہونی چاہیے، لیکن شائستگی اور انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔

ف ا س: طنز و مزاح کے بارے میں آپ کا بنیادی نظریہ کیا ہے؟

پ م: میرے نزدیک طنز و مزاح صرف قہقہہ پیدا کرنے کا نام نہیں۔ اچھا مزاح وہ ہے جو ہنسانے کے ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرے۔

میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ میرے مزاح میں شگفتگی کے ساتھ فکر، اور قہقہے کے ساتھ تہذیب موجود ہو۔ کسی فرد کی دل آزاری یا تضحیک کو میں مزاح نہیں سمجھتا۔ معاشرے کی کمزوریوں پر ضرور بات ہونی چاہیے، لیکن شائستگی اور انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔

ف ا س: آپ کی شاعری کی نمایاں خصوصیت کیا ہے؟

پ م: میری کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ شعر سادہ، رواں اور عام قاری کے لیے قابلِ فہم ہو، لیکن اس میں ادبی حسن بھی موجود رہے۔ میں مشکل الفاظ کے ذریعے اپنی علمی برتری ثابت کرنے کے بجائے ایسی بات کہنا پسند کرتا ہوں جو دل تک پہنچے۔

اگر میرے کلام کی کوئی شناخت ہے تو وہ شاید سادگی، شگفتگی اور برجستگی ہے۔

ف ا س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مزاحیہ شاعر کے لیے سماجی شعور ضروری ہے؟

پ م: بالکل۔ مزاح نگار اپنے زمانے سے الگ نہیں رہ سکتا۔ اسے اپنے معاشرے کے مسائل، تضادات اور رویوں کا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن سماجی شعور کے ساتھ اخلاقی شعور بھی ضروری ہے۔ میری کوشش رہی کہ میں معاشرے کی خرابیوں پر ہنسوں، لیکن انسان پر نہیں۔

ف ا س: آپ نے اردو کے بزرگ شعرا کی ایک پوری نسل دیکھی ہے۔ اس دور کی کوئی خاص بات؟

پ م: یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے اردو کے بہت سے بزرگ شعرا کی صحبت اور محبت حاصل ہوئی۔ ہمارے زمانے میں بڑے اور چھوٹے شاعر ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ بڑے شعرا نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

آج بھی بہت اچھے شاعر موجود ہیں، لیکن مجھے اس دور کی وہ باہمی محبت بہت یاد آتی ہے۔ میرے نزدیک ادب میں اچھا اخلاق بھی اچھی شاعری جتنا ہی اہم ہے۔

ف ا س: آپ کو اپنے ادبی سفر میں سب سے زیادہ خوشی کس بات سے ملتی ہے؟

پ م: میرے لیے سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ میری شاعری لوگوں تک پہنچے اور سامعین نے اسے محبت دی۔ مشاعرے کی داد اپنی جگہ، لیکن جب کوئی شخص برسوں بعد میرا شعر یاد کر کے سناتا ہے تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔

شاعر کی اصل زندگی اس کے قارئین اور سامعین میں ہوتی ہے۔

ف ا س: آپ کے لیے مشاعرہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟

پ م: مشاعرہ شاعر اور سامع کے درمیان براہ راست رابطے کا نام ہے۔ میں نے نصف صدی سے زیادہ عرصے میں ہزاروں سامعین کے سامنے کلام پڑھا ہے۔ مشاعرے نے مجھے عوام کے مزاج کو سمجھنے اور اپنی شاعری کو بہتر بنانے کا موقع دیا۔

ف ا س: کیا مشاعرے نے آپ کی شاعری کو بھی متاثر کیا؟

پ م: یقیناً۔ مشاعرے نے مجھے یہ سکھایا کہ شعر صرف کتاب کے صفحے پر نہیں، آواز اور احساس کے ذریعے بھی زندہ ہوتا ہے۔ سامعین کے ردِعمل سے شاعر کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی بات کس حد تک دل تک پہنچی۔

ف ا س: نثر کی طرف آپ کی توجہ کیسے ہوئی؟

پ م: نثر میں دلچسپی مجھے بہت پہلے سے تھی۔ میں مضامین اور یادداشتیں لکھتا رہا ہوں، لیکن لاک ڈاؤن میں وقت ملا تو میں نے اپنی پرانی یادوں، مشاہدات اور ادبی تجربات کو زیادہ باقاعدگی سے لکھا۔ اسی کا نتیجہ 'یادوں کے دریچے' ہے۔

ف ا س: آپ کے خیال میں شاعر کے لیے نثر لکھنا کس حد تک مفید ہے؟

پ م: نثر شاعر کے مشاہدے کو وسیع کرتی ہے۔ شاعری میں بات چند مصرعوں میں کہنی ہوتی ہے، جب کہ نثر میں تفصیل سے اپنے تجربات اور خیالات بیان کرنے کا موقع ملتا ہے۔ میرے لیے دونوں اصناف ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

ف ا س: آپ نے ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ پر بھی کام کیا۔ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

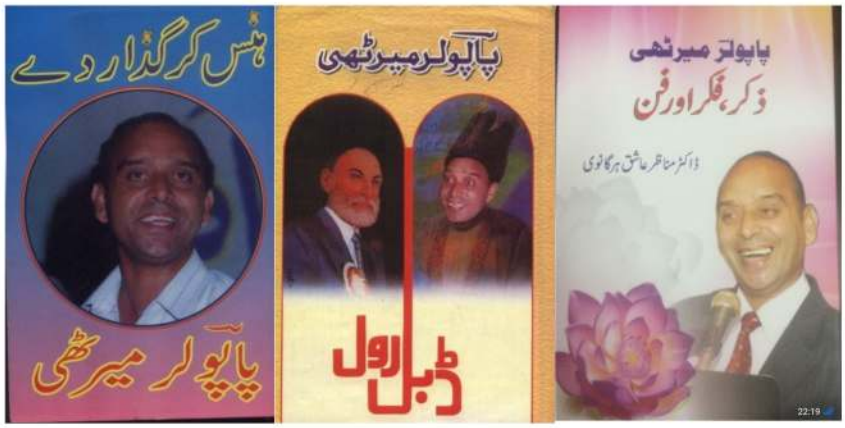
پ م: آج کے زمانے میں شاعر کے لیے ذرائع ابلاغ بہت اہم ہیں۔ مختلف ٹی وی چینلوں پر میرے کلام کی نشر و اشاعت ہوتی رہی ہے۔ اس سے اردو شاعری نئے سامعین تک پہنچتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں جدید ذرائع کو اردو کے فروغ کے لیے مثبت انداز میں استعمال کرنا چاہیے۔

ف ا س: اپنی ادبی زندگی میں آپ کس چیز کو سب سے بڑا اعزاز سمجھتے ہیں؟

پ م: میرے لیے سب سے بڑا اعزاز کسی سند یا انعام سے زیادہ لوگوں کی محبت ہے۔ مجھے بڑے شعرا کی شفقت ملی، ملک و بیرونِ ملک مشاعروں میں پڑھنے کا موقع ملا اور قارئین نے میری کتابوں کو پسند کیا۔ یہ سب میرے لیے بہت قیمتی ہے۔

ف ا س: پچاس سالہ سفر میں کوئی ایسی خواہش جو ابھی باقی ہو؟

پ م: میری بڑی خواہش اب شہرت یا اعزاز کی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری شاعری، نثر، مضامین اور یادیں محفوظ ہو جائیں تاکہ آنے والی نسلیں ان سے استفادہ کر سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ خواہش ہے کہ جب تک زندگی ہے، قلم چلتا رہے۔



ف ا س: آپ کی شاعری میں کوئی ایسا شعر جسے آپ اپنی شناخت سمجھتے ہیں؟

پ م: میرے کئی اشعار کو سامعین نے محبت دی، لیکن ابتدائی زمانے میں جس شعر نے مجھے مشاعروں کی دنیا میں نمایاں کیا، وہ یہی ہے۔

میں یہ کہتا ہی رہا میں تو نہیں دیوانہ
یہ الگ بات میری جیب سے پتھر نکلے

یہ شعر آج بھی میرے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ میری مشاعراتی زندگی کی ایک یاد وابستہ ہے۔

ف ا س: اتنے طویل ادبی سفر کے بعد آج آپ اپنی زندگی کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

پ م: میں اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھتا ہوں۔ ایک طالب علم سے شاعر، استاد، محقق اور نثر نگار تک کا سفر آسان نہیں تھا، لیکن ہر مرحلے پر بزرگوں کی دعائیں اور لوگوں کی محبت شامل رہی۔ میں نے یہ سیکھا کہ شہرت عارضی ہے، مگر اخلاق اور محبت دیرپا ہیں۔ اسی لیے آج بھی اپنے آپ کو سب سے پہلے ایک طالب علم سمجھتا ہوں۔

ف ا س: اپنے ادبی سفر میں کن شخصیات کو خصوصی طور پر یاد کرنا چاہیں گے؟

پ م: اپنے والدین اور اساتذہ کے ساتھ میں ان تمام بزرگ شعرا کو یاد کرنا چاہوں گا جنھوں نے محبت اور حوصلہ دیا۔ ڈاکٹر بشیر بدر، وسیم بریلوی، دلاور فگار اور بہت سے دوسرے بزرگوں کی شفقت میرے لیے سرمایہ ہے۔ میں ان تمام لوگوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے کلام کو سنا، پڑھا اور آگے پہنچایا۔

ف ا س: انئی نسل کے شاعروں کے لیے آپ کیا نصیحت کریں گے؟

پ م: مطالعہ کریں، بزرگوں کو پڑھیں، اپنے عہد کو سمجھیں اور جلدی شہرت کے پیچھے نہ بھاگیں۔ شعر کہنے سے پہلے اچھا انسان بننا ضروری ہے۔

ادب میں مقابلہ ہونا چاہیے، دشمنی نہیں۔ ایک شاعر دوسرے شاعر کی خوبی کو تسلیم کرے، یہی ادبی صحت کی علامت ہے۔

ف ا س: آخر میں اپنے قارئین اور محبان اردو کے نام کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

پ م: میری پوری زندگی کا حاصل اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے میری توقع سے کہیں زیادہ عزت، محبت اور مواقع عطا کیے۔

میں اپنے قارئین، سامعین، دوستوں، اساتذہ، بزرگ شعرا اور تمام محبان اردو کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اگر میری شاعری نے کسی کے لبوں پر مسکراہٹ پیدا کی، کسی دل کو خوشی دی یا کسی نوجوان کو اردو ادب کی طرف متوجہ کیا تو میں اسے اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھوں گا۔ میرا یقین ہے کہ اردو صرف ایک زبان نہیں، ہماری مشترکہ تہذیبی میراث ہے۔ اسے آنے والی نسلوں تک پہنچانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

یہی میری زندگی کا حاصل ہے، یہی میری سب سے بڑی خوشی اور یہی میری آخری خواہش ہے۔

■

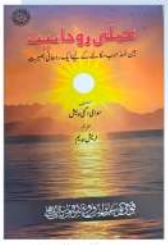
Dr. Furqan Ahmed Sardhanvi
Mohalla Burha Babu, Near Deepak Furniture
Sardhana District
Meerut- 250342 (UP)
Mob.: 9927141402
furqansardhanvi@gmail.com

Dr. Popular Meeruthi
333, Nizam Cottage
Karam Ali, Meeruth City
Meeruth-250002 (UP)
Mob.: 9412704614
popularmeeruthi@gmail.com

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے اور کتاب کے مشمولات کے تعلق سے قارئین کو اہم معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت پائی جاتی ہے۔ قدیم رسائل ومجلات نے نئی مطبوعات سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تبصرہ ایک ذمہ داری کا عمل بھی ہے۔ اس لیے مبصرین کو تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، طوالت، تحسین اور نکتہ چینی سے گریز کرتے ہوئے کتاب کے اہم نکات پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔ رسالے میں اردو زبان و ادب سے متعلق انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا مبصرین اس جانب بھی توجہ فرمائیں۔ (ادارہ)

عملی روحانیت: بین المذاہب مکالمے کے لیے ایک روحانی بصیرت



مصنف: سوامی اگنی ویش، مترجم: نریش ندیم
صفحات: 115، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2026
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر وسیم اقبال
ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

عملی روحانیت سے مراد محض خیالات یا نظریات کی حد تک روحانی باتیں کرنا نہیں، بلکہ اخلاص کے ساتھ احکام الٰہی پر عمل پیرا ہونا اور باطن کو سنوارنا ہے۔ روحانیت کا عقیدہ تقریباً تمام مذاہب میں ملتا ہے، یعنی تمام مذاہب عالم انسانیت کو جسمانی، ذہنی اور روحانی ہر اعتبار سے صحت منداور باشعور زندگی گزارنے کا درس دیتے ہیں۔ مذہبی علم اور سماجی عمل کے بیچ کی کھائی کو پاٹنا ہی عملی روحانیت کا بنیادی مقصد ہے۔ مثبت سوچ، وسیع القلبی اور اخلاص کے ساتھ عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کی فکر کرنا، مذہبی جگہوں اور سیکولر معاشرہ کو متحد کرنا عملی روحانیت کا بنیادی پہلو ہے۔ روحانیت وہ وجدان ہے جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر کس کی بہبود پورے معاشرہ کی بہبود سے وابستہ ہے اور سماجی انصاف روحانیت کی روح رواں ہے۔ عملی معانی میں انصاف اور روحانیت ہم معنی ہیں۔ دونوں ہی بنیادی طور پر سالمیت کے اصول ہیں جو کسی معاشرہ کو یکجہت رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔

ہندوستان کی کئی ہزار سال کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں گوناگوں کثرت میں وحدت کا جو باریک رشتہ موجود ہے وہ ارباب قوت کے جبر و تشدد سے نہیں بلکہ عارفوں کے وجدان سے، فلسفیوں کی فکر سے، زاہدوں کی ریاضت سے اور فنکاروں کے تخیل سے پیدا ہوا ہے اور یہی وسیلے ہیں جن کے ذریعے اسے زیادہ وسیع، مضبوط اور پائیدار بنایا جاسکتا ہے۔ اس مناسبت سے سوامی اگنی ویش کی 'عملی روحانیت بین المذاہب مکالمے کے لیے ایک روحانی بصیرت' دلچسپ اور معلوماتی کتاب ہے۔

زیر نظر کتاب اپنے موضوع کے تفصیلی تعارف کے ساتھ دو حصوں میں منقسم ہے جس میں حصہ اوّل میں: سماجی قلب ماہیت کے لیے کثیر عقائد پیش رفت (کثیر عقائد نظریہ سے کثیر عقائد تحریک کی طرف)، مذاہب برائے سماجی انصاف، بین المذاہب مکالمہ برائے امن عنوانات کے تحت موضوع سے متعلق بنیادی اور اہم جانکاریاں پیش کی گئی ہیں جب کہ حصہ دوم میں: مذہب اور روحانیت (کلارک دینیائی درسگاہ، ناگالینڈ کے طلبا سے سوامی اگنی ویش کی بات چیت)، خواتین کی قوت افزائی (جرمن مصنف، ٹی وی صحافی اور مبلغ مس ماریاوان ویلزر سے سوامی اگنی ویش کی بات چیت)، ہندوستان میں نکسل واد: ایک جائزہ (سوامی اگنی ویش اور ملبورن، آسٹریلیا کی مس ایلیسن کیمرون کی بات چیت)، چیدہ مغربی مداخلتوں اور عالمی تجارت تنظیم کی تنقید، موضوعات کے تحت بصیرت افروز معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

کتاب کے مصنف سوامی اگنی ویش ایک ہندستانی سماجی کارکن، دانشور سیاست داں اور آریہ سماج کے اصولوں پر مبنی ایک سیاسی جماعت 'آریہ سبھا' کے بانی تھے۔ انھوں نے ہریانہ ریاست میں بطور کابینہ وزیر بھی خدمات انجام دیں۔ انھیں متعدد انعامات واعزازات سے بھی نوازہ گیا جن میں راجیو گاندھی نیشنل سدبھاؤنا ایوارڈ اور رائٹ لائیولی ہڈ ایوارڈ بھی شامل ہیں۔

کتاب کے مترجم نریش ندیم محقق، دانشور اور مترجم کے طور پر جانے جاتے ہیں جنھوں نے اس کتاب کا انگریزی سے اردو میں آسان اور عام فہم زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ قوی امید ہے کہ قارئین اس کتاب سے مستفید ہوں گے۔

گلوبل وارمنگ (عالمی تپش)



مصنف: انجینئر عبدالدائم خواجہ
صفحات 120، قیمت 160 روپے، سنہ اشاعت: 2026
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن
محلہ: دکھن، پوسٹ: بہادر گنج، ضلع غازی پور۔ 275201 (یوپی)

موجودہ دور میں جب ہم روزمرہ کی زندگی میں موسمی تبدیلیوں، بے وقت کی بارشوں، شدید گرمی کے ٹوٹتے ریکارڈز اور قدرتی آفات کا سامنا کرتے ہیں، تو یہ سوال ہر ذی شعور انسان کے ذہن میں ابھرتا ہے کہ آخر ہماری اس پیاری زمین کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ سائنس اور صنعتی ترقی نے جہاں انسان کو بے شمار آسائشیں فراہم کی ہیں، وہیں کرۂ ارض کے قدرتی نظام میں ایک گہرا خلل بھی پیدا کر دیا ہے۔ اسی تشویش اور سائنسی حقیقت کی افہام و تفہیم کے لیے انجینئر عبدالدائم خواجہ کی تصنیف 'گلوبل وارمنگ (عالمی تپش)' استناد کا درجہ رکھتی ہے۔

زیر نظر کتاب پیش لفظ، پانچ ابواب اور آخری حصہ گلوبل وارمنگ سے متعلق لفظیات و اصطلاحات کے سلیس اردو ترجمے، لغوی و اصطلاحی مفاہیم کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے اردو قارئین کے لیے یہ کتاب بہت اہم ہے۔

کتاب کا آغاز عالمی تپش کے بنیادی سائنسی مفہوم 'گلوبل وارمنگ کا تعارف' سے ہوتا ہے۔ مصنف نے گرین ہاؤس اثر اور کرۂ ارض کی فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ، میتھین اور دیگر زہریلی گیسوں کے جمع ہونے کے عمل کو انتہائی آسان اور فصیح انداز میں سمجھایا ہے۔ گلوبل وارمنگ ایک ایسی جغرافیائی صورت حال ہے جس میں زمین کے درجہ حرارت میں شدید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسے عام لوگ زمینی تپش کے نام سے جانتے ہیں۔ اس اضافہ کی وجہ اس خطہ ارض پر موجود ایسی خطرناک گیسیز ہیں جو ہوا میں مل کر آب و ہوا کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ان گیسوں کی زیادتی کے سبب سورج کی کرنیں زمین سے ٹکرانے کے بعد خلا میں نہیں جا سکتیں جس کی وجہ سے فضا کا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے اور زمین کے درجہ حرارت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔' وہ بتاتے ہیں کہ صنعتی انقلاب کے بعد کس طرح انسان کی بے لگام پیش رفت نے کرۂ ارض کا درجہ حرارت بڑھایا ہے۔

یہ حصہ پڑھ کر قاری کے اندر ایک گہرا تشویش ناک احساس پیدا ہوتا ہے۔ مصنف نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ درجہ حرارت میں معمولی سا اضافہ کس طرح جنگلات، نباتات، حشرات اور حیوانی زندگی کو تباہ کر رہا ہے۔ گلیشیئرز کا تیزی سے پگھلنا، سمندر کی سطح کا بلند ہونا، ساحلی علاقوں کا ڈوبنا اور نایاب پرندوں و جانوروں کی نسلوں کا خاتمہ ایسے حقائق ہیں جن پر مصنف نے ٹھوس ثبوت پیش کیے ہیں۔

یہ کتاب محض خطرات کا رونا نہیں روتی، بلکہ ان مسائل کے حل کے لیے منصوبہ بند اپروچ پیش کرتی ہے۔ مصنف نے ان تدابیر اور طریقوں کی نشاندہی کی ہے جن کے ذریعے انفرادی اور اجتماعی سطح پر گرمی کے اس گراف کو نیچے لایا جا سکتا ہے۔ متبادل توانائی (سولر، ونڈ انرجی)، وسیع پیمانے پر شجرکاری، اور انڈسٹریل ویسٹ کو کنٹرول کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اس حصے میں مصنف نے ملکی و عالمی سطح پر کی جانے والی سفارتی اور سائنسی کوششوں کا جائزہ لیا ہے۔ کیوٹو پروٹوکول اور پیرس معاہدے جیسے تاریخی بین الاقوامی فیصلوں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ سمجھایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام ممالک کو اپنے اپنے حصے کی ذمہ داری کس طرح نبھانی چاہیے۔

کتاب کا چوتھا باب 'گلوبل وارمنگ کے اثرات کو کم کرنے کے لیے عالمی پیمانے پر پیش رفت' اس لحاظ سے انتہائی معرکتہ الآرا اور بصیرت افروز ہے کہ یہ عالمی سطح پر ماحولیات کو بچانے کی تاریخ اور بین الاقوامی کوششوں کا احاطہ کرتا ہے۔ کتاب کے پانچویں باب میں مصنف نے ماحولیات اور عالمی تپش کو صرف سائنسی تھیوری تک محدود نہیں رکھا، بلکہ بھارت میں ماحولیاتی تحفظ کے لیے سپریم کورٹ آف انڈیا، نیشنل گرین ٹریبونل اور دیگر نظائر و عدالتوں کے اہم اور تاریخی فیصلوں کا تفصیلی احاطہ کیا ہے۔

کتاب کا ایک اہم اور بے حد مفید اس کا آخری حصہ ہے، جہاں مصنف نے ماحولیات اور گلوبل وارمنگ سے متعلق تمام انگریزی اصطلاحات (Terminologies) کا انتہائی سلیس، واضح اور آسان اردو ترجمہ اور تفصیلی تشریح فراہم کی ہے۔

اردو میں سائنسی کتب کا مطالعہ کرتے وقت سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ قارئین انگریزی کے تکنیکی الفاظ کا درست اردو متبادل نہیں سمجھ پاتے۔ مصنف نے اس کے ذریعے اس مشکل کو مکمل طور پر حل کر دیا ہے۔ انھوں نے گلوبل وارمنگ، موسمیاتی و زمینی تبدیلی سے متعلق مشکل اور پیچیدہ اصطلاحی مفاہیم کو نہ صرف آسان اردو کا پیرہن عطا کیا ہے بلکہ ان کی مختصر وضاحت بھی کر دی ہے، جیسے Aerosols، Climate، Cell Cyle، Carbon، Corbon، Atmosphere، Rain Acid Destruction، change، اور Disaster وغیرہ وغیرہ جو طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے ایک ناپید تحفہ ہے۔

مصنف کا اسلوب نگارش انتہائی سادہ، رواں اور اثر انگیز ہے۔ کہیں بھی غیر ضروری پیچیدگی یا بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔ جملوں کی ساخت مختصر اور صاف ہے، جس کی وجہ سے ایک عام پڑھنے والا بھی پوری روانی کے ساتھ کتاب کو مکمل کر لیتا ہے۔ کتاب میں جذباتی لفاظی کے بجائے سائنسی معروضیت پر زور دیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر، 'گلوبل وارمنگ (عالمی تپش)' اردو لٹریچر میں سائنسی اور ماحولیاتی علوم کا ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

خیال رنگ



مصنف: ڈاکٹر آصف سلیم

صفحات: 219، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2026

مطبع: عرشیہ پبلی کیشنز، دلشاد کالونی، دہلی۔95

مبصر: ڈاکٹر سرور حسین

307، شاہد ادریس انکلیو، مدرسہ روڈ، شمن پورہ، پٹنہ، بہار

ڈاکٹر آصف سلیم کے مجموعۂ مضامین 'خیال رنگ' سے گزرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ بات کہنے کا فن جانتے ہیں۔ یہ مجموعہ اختصار میں تفصیل ہے۔ انھوں نے بڑی خوبصورت انداز میں اپنی باتیں کہی ہیں۔ 'کچھ اپنی باتیں' کے عنوان سے جو پیش لفظ لکھا ہے اس میں بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی مضامین نویسی پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''میرے مضامین تحریر کرنے کا قصہ یہ ہے کہ اس کا آغاز مشہور و معروف صحافی جناب ارمان بہاری کی ادارت میں نکلنے والے اخبار 'ہماری دھرتی' میں اشاعت پذیر ایک مضمون کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ 1980 کا زمانہ تھا اور میں گریجویشن کا طالب علم تھا۔ راہِ ادب میں سرگرم ہوا تو تخلیقی ادب کے ہمراہ ملک اور بیرون ملک کے رسائل و جرائد میں میرے مضامین بھی مقام پانے لگے۔ پھر ایک بڑی تبدیلی یوں رونما ہوئی کہ تخلیقی ادب جس کے تحت میں نے سمتِ افسانہ کا انتخاب کیا تھا اچھی خاصی اشاعتوں کے بعد معدوم ہو گیا اور اس کے مقام پر مضامین تحریر کرنے کا عمل رواج پا گیا۔ اب تو عالم یہ ہے کہ میرے مضامین ہی میری شناخت کا حقیقی حوالہ بن گئے ہیں۔''

ان کے مضامین کا پہلا حصہ جو شعرا کے حوالے سے ہے اس میں انھوں نے حفیظ بنارسی، صدیق مجیبی، خالد عبادی، طارق متین، بدر محمدی، رمیش کنول اور پریم کرن کی شاعرانہ جہات و کیفیات پر بڑے ہی عالمانہ انداز میں اپنے خیالات و محسوسات قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے ان فنکاروں کی صورت و سیرت کی بھی تصویر کشی کی ہے اور بعض کے ذوق و شوق کا بھی ذکر کیا ہے۔ صدیق مجیبی کا ذکر کرتے ہوئے وہ بڑے ہی سوگوار انداز میں کہتے ہیں کہ:

''صدیق مجیبی کا اس جہان فانی سے گزر جانا پوری اردو شاعری کے لیے جہاں ایک بڑا خسارہ ہے وہیں ادب کے تعلق سے گدی برادری کی ادبی وابستگی کی اس تاریخ کے خاتمے کا اعلان بھی ہے جسے اپنی فنکارانہ عظمتوں اور بے پناہ صلاحیتوں کے دم خم پر غیاث احمد گدی، الیاس احمد گدی اور صدیق مجیبی جیسے لوگوں نے مقام حرمت عطا کیا تھا۔''

کتاب کا دوسرا حصہ نثری ادب پر ان کے خیالات کا اظہار ہے۔ نثری حصے پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے شفق کے ناول 'بادل'، شموئل احمد کے 'گرداب' عبدالصمد کے 'کشکول' نیز ابولیث جاوید اور شاہد انور کے افسانوی نہج اور خصوصیات سے متعلق اپنے بے لاگ تاثرات سے آشنا کرایا ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر آصف سلیم اظہار خضر کی کتاب 'تجزیے' اور ڈاکٹر نسیم اختر کی 'مکتوبات آرزو' کی ادبی و اخلاقی معنویت کا بھی احاطہ کرتے ہوئے ان کتابوں کی اہمیت سے ہمیں روشناس کراتے ہیں۔ مختار الدین آرزو نے ڈاکٹر نسیم اختر کے نام جو خطوط لکھے ان کا اختصاص یہ ہے کہ ان میں مختلف اطلاعات سے متعلق حواشی بھی درج کیے گئے ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ ان کی یادوں پر مشتمل ہے جن میں علامہ واقف عظیم آبادی، عابد رضا بیدار، ارمان بہاری، احمد یوسف، جابر حسین، شمیم فاروقی، شاہد انور، امتیاز الحق خاں اور امتیاز احمد کریمی کے خاکے بڑے پر اثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان خاکوں سے گزرتے ہوئے ان شخصیات کی جیتی جاگی تصویر آنکھوں میں اتر آتی ہے۔ یہ حقیقت جہاں متذکرہ شخصیات اور ان کی خصوصیات سے ہماری روشناسی کا سبب بنتی ہے وہیں خاکہ نگار کے کمال فن پر اصرار کرتی ہے۔

ڈاکٹر آصف سلیم نے بیدار صاحب کی دلچسپ شخصیت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ اُن کی شخصیت کا متضاد پہلو روشن ہو اٹھتا ہے:

''خدا بخش لائبریری کے احاطے میں ہی ڈائرکٹر کی قیام گاہ تھی جس سے متصل ان کا دفتر تھا جو لائبریری کے آنے جانے والے ملاقاتیوں کے دم سے ہمہ دم گلزار رہتا مگر کبھی جو دن کے اوقات میں دفتر کے کواڑ بند ہوتے تو لائبریری کے احاطے میں ایمرجنسی کا جیسے نفاذ ہو جاتا اور ملازمین اپنے اپنے کاموں کے ساتھ اپنے مقامات پر چاق و چوبند دکھائی دیتے۔

بیدار صاحب کی بارعب شخصیت کا یہ بڑا کمال تھا مگر اس میں محض خوف کی یک رخی شمولیت نہیں تھی بلکہ ان کے ہمدردانہ رویوں کا بھی یکساں عمل دخل تھا یعنی آپ پر کسی قسم کی مصیبت کی گھڑی آتی تو لائبریری کے بند ہونے کے بعد بھی بیدار صاحب کے دفتر کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہوتے۔''

اسی طرح انھوں نے ارمان بہاری، جابر حسین، احمد یوسف، شمیم فاروقی، شاہد انور، امتیاز الحق اور امتیاز احمد کریمی کی بھی شخصیت کے مختلف پہلو روشن کیے ہیں۔

کتاب کے آخر میں مصنف کا تعارفی خاکہ اور کتابیات کا ذکر ہے۔

کتاب کا بیرونی فلیپ جہاں پروفیسر اعجاز علی ارشد کی گراں قدر رائے سے مزین ہے وہیں اندرونی فلیپ پر ڈاکٹر محسن رضا رضوی کے تاثرات بھی درج ہیں جو کتاب کی معنوی اہمیت اجاگر کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر آصف سلیم کی یہ کتاب دلچسپ عبارات، زبان و بیان کی لطافت سے پر اور انشا پردازی کے رنگ سے آشنا ہے۔ کتاب میں اکثر مقام پر لمبے اور مرکب جملوں سے کام لیا گیا ہے جو ترسیل کی راہ میں پیچیدگی پیدا کرتے ہیں۔ اگر چھوٹے چھوٹے جملوں سے کام لیا جاتا تو یہ کتاب اور بھی خوبصورت ہوتی۔ کتاب کا سب سے خوبصورت پہلو اس کا سرورق ہے جس پر دلکش رنگوں کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اہل نظر حضرات کو پسند آئے گی۔

جی سے نہ جائیں گی تمھاری باتیں



مصنف: ڈاکٹر غضنفر اقبال

صفحات: 196، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2026

ناشر: کاغذ دکن بیورو، گلبرگہ کرناٹک

مبصر: شیخ عبدالرحیم محی الدین

معرفت معین خان درانی، نزد بارہ دری، مسجد بھالدار پورہ بیڑ۔ 431122 (مہاراشٹر)

ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کے یووا پرسکار 2012 اور بال ساہتیہ پرسکار 2025 سے سرفراز ڈاکٹر غضنفر اقبال مایہ ناز قلمکار ہیں۔ ان کی پچیسویں کتاب 'جی سے نہ جائیں

گی تمھاری باتیں' سوانحی مضامین کے ذیل میں شمار ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اس کتاب میں انھوں نے دکن کے سولہ قلمکاروں پر مضامین شامل کیے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے سوانحی مضامین کی خوبی یہ ہے کہ وہ مبالغہ آرائیوں سے مبرا ہیں۔ان کا قلم شخصیت کا میک اَپ نہیں کرتا بلکہ انصاف کے ساتھ شخصیت کے کردار اور فن کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔اس کے باوجود وہ منتخب شخصیات کی زندگی کے معلوم کسی بھی گوشے کو مخفی نہیں رکھتے بلکہ حتی الامکان ان کی حیات کے تمام حصوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب سے حضرت ڈاکٹر سید شاہ خسرو حسینی، یعقوب عثمانی، ڈاکٹر محمد یوسف عثمانی، شاہ حسین نہری، احسن یوسف زئی، جے پی سعید، ایڈوکیٹ خواجہ منظور الدین، احمد اقبال، سید اختر کریم، خلیل مامون، سمیرا حیدر، انجینئر امجد علی فیض، ڈاکٹر غلام دستگیر شیخ، ڈاکٹر محمد عبید الرحمٰن احساس، انجینئر مرزا عبدالرشید بیگ اور ڈاکٹر طیب انصاری کی حیات اور کارناموں پر بہتر سے برتر انداز میں روشنی پڑتی ہے۔یہ تمام ہی شخصیات مصنف سے نہ صرف گہرے طور پر وابستہ رہی ہیں بلکہ مصنف کی زندگی اور ذہن پر منقوش ہیں۔

کتاب کو میر کے اس شعر سے تسمیہ دیا گیا ہے۔

ہیں گو کہ سبھی تمھاری پیاری باتیں پر جی سے نہ جائیں گی تمھاری باتیں

مصنف نے 'وہ بھلے لوگ' میں مرحوم شخصیات کو حسن عقیدت پیش کیا ہے۔

کتاب کی پہلی شخصیت حضرت ڈاکٹر سید شاہ خسرو حسینی کو شہباز دین و دانش کے عنوان سے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اہل دل کی نظر میں آپ واجب الاحترام تھے۔''

یعقوب عثمانی کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ ''ان کی حیات دراصل قدیم و جدید کا حسین نقطہ اتصال ہے۔''

ڈاکٹر محمد یوسف عثمانی پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے کہ ''استاد محترم سادگی پسند بے ضرر اور بھولے بھالے انسان تھے۔''

ماہر لسانیات، شاعر، ادیب پروفیسر سید شاہ حسین نہری کے بارے میں ایک خاص تعلق پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی سے شاہ حسین نہری کے برادرانہ مراسم تھے۔دیار دکن کے شہر حیدرآباد، اورنگ آباد اور گلبرگہ میں فاروقی صاحب تشریف لاتے تو شاہ صاحب ان کے ہمراہ ضرور ہوتے تھے۔''

دکن کا نیر سخن احسن یوسف زئی سے متعلق لکھتے ہیں کہ ''احسن یوسف زئی کے مزاج میں رکھ رکھاؤ اور اگلے زمانے کی تہذیب دیکھی جاسکتی تھی وادبی منافقت سے دور تھے۔''

مہر دکن جے پی سعید پر اپنا قلم اس طرح وا کرتے ہیں کہ ''ان کی شخصیت میں انانیت کا دور کا بھی رشتہ نہیں تھا۔''

ایڈوکیٹ خواجہ منظور الدین سے متعلق کچھ اس طرح تحریر کرتے ہیں کہ:

''قانونی سفر میں انھیں نیک نامی حاصل ہوئی کئی قانونی واقعات ان کی یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا فن شاعری، موسیقی اور تعمیرات پر گہرے مطالعے کا اعتراف کیا گیا ہے۔''

تعلیم ادب کے مرد درویش احمد اقبال کی شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''احمد اقبال کا باطن صاف اور کردار بلند تھا۔ پیشہ معلمین میں فرض شناسی کی مثال قائم کی اور جہد مسلسل کا درس دیا تھا۔''

سید اختر کریم کے فن غزل گوئی پر اس طرح تبصرہ نگاری فرماتے ہیں کہ ''سید اختر کی شاعری ان کی فکری وجود کا سرمایہ ہے۔''

خلیل مامون کا عنوان قاری کو اپنی جانب اس طرح متوجہ کرتا ہے کہ ''محکمہ پولیس کی سخت ترین ملازمت میں نماز اور روزے کے پابند رہے۔''

سمیرا حیدر کے فن پر لکھتے ہیں کہ ''وہ زندگی کے پرآشوب حقائق کو افسانوں میں پیش کرنے کے ہنر سے واقف تھیں۔''

انجینئر امجد علی فیض کی تصویر لفظوں میں کھینچتے ہوئے صاحب کتاب لکھتے ہیں کہ ''امجد علی فیض اطاعت شعار صبر و ثبات کا پیکر اور ایک باصلاحیت تعلیم یافتہ فرد بشر تھے۔''

ڈاکٹر غلام دستگیر شیخ کی شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ڈاکٹر شیخ کے ان کی نگرانی میں قلم بند جامعاتی تحقیقی مقالے اور ان کی سربراہی میں انعقاد پذیر قومی سطح کے سمینار کے عناوین میں اخلاق اور اصلاح کو مقدم حیثیت حاصل تھی۔''

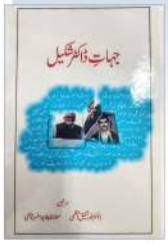
ڈاکٹر محمد عبید الرحمٰن کی غزل کی خوشبو پر رقمطراز ہیں کہ ''انھوں نے اپنی غزلوں میں عام آدمی کے دکھ درد اور مسائل اتنے دل نشین انداز میں پیش کیے تھے کہ لگتا ہے جیسے شاعر ہماری آپ بیتی سنا رہا ہے۔''

انجینئر مرزا عبدالرشید بیگ کی زندگی کی تعبیر پیش کرتے ہوئے صاحب کتاب لکھتے ہیں کہ ''مرزا عبدالرشید بیگ کی حیات سادگی کا عنوان تھی وہ گفتگو اور معاملات میں سچے اور کھرے انسان تھے۔''

ڈاکٹر طیب انصاری کو ایک محشر خیال شخص گردانتے ہوئے لکھا ہے کہ ''طیب انصاری دوستوں کے دوست تھے ان کے لیے خیر خواہانہ رابطے اہم تھے۔طیب انصاری کی تصنیفی زندگی غیر مشروط اور ادب و شعر کی بے لوث آبیاری تھی۔''

بہر کیف سوانحی مضامین پر مشتمل یہ کتاب فن وفکر کا عمدہ نمونہ ہے۔

ترتیب



جہات ڈاکٹر شکیل

مرتبین: ڈاکٹر انور شفیق اعظمی/مولانا جاوید اطہر قاسمی

صفحات: 352، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2026

ناشر: آصف عبداللہ

طباعت: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر ظہیر حسن ظہیر، صدر شعبہ اردو، شریمتی اندرا گاندھی، پی جی کالج، ڈمری مریاد پور، مئو

اردو شعر و ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اردو کے شعری و نثری سرمایہ میں جتنی حصے داری معروف ادبا و شعرا کی ہے اس سے کہیں زیادہ ان غیر معروف شعرا و ادبا کی ہے جو کسی شہرت و ناموری کی پرواہ کیے بغیر خاموشی سے نظیر اکبر آبادی کی طرح کام کرنے میں یقین رکھتے ہیں، ایسے ہی لوگوں میں مئوناتھ بھنجن کی ایک اہم ادبی شخصیت ڈاکٹر شکیل احمد کی ہے۔موصوف خاموشی کے ساتھ تقریباً چار دہائی سے زبان و ادب کی خدمات انجام دینے میں سرگرم عمل ہیں۔ڈاکٹر شکیل احمد ہمہ جہت، متحرک اور فعال شخصیت کے مالک ہیں۔تنقید نگاری، خاکہ نگاری، سفرنامہ نگاری، تبصرہ نگاری میں ان کو مہارت حاصل ہے۔حال ہی میں موصوف کی شخصیت و سوانح اور ادبی خدمات کے حوالے سے 'جہات ڈاکٹر شکیل' کے نام سے ایک کتاب منظر عام

پر آئی ہے۔اس کتاب کو انور شفیق اعظمی اور مولانا جاوید اطہر قاسمی نے ترتیب دیا ہے۔

مرتبین نے پہلے ڈاکٹر شکیل احمد صاحب کی شخصیت و سوانح اور کتابوں کے حوالے سے لکھے گئے مشاہیر کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ 20 مضامین کو ترتیب دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کتابوں اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، مئوشہر ہنروراں، سمٹتا سائبان، بادل چھاؤں، نشاط قلم، طراز قلم، کتاب یاری، حساب جاں، سفر کی خوشبو، مٹھی بھر خطوط، گرم دم جستجو پر لکھے گئے مختصر مضامین اور تبصرے جو ملک کے موقر معروف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں ان کو جمع کیا ہے۔ علاوہ ازیں موصوف سے مختلف موقعوں پر لیے گئے تین انٹرویوز، منظوم تاثرات، اور ان کی بیٹی، پوتی اور نواسی کے تاثرات کو بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل مواد کی ترتیب سے مرتبین کی سلیقہ مندی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب میں عرض مرتبین کے نام سے مختصر تحریر شامل ہے جس میں کتاب ترتیب دینے کا مقصد بیان کیا گیا ہے کہ ''یہ کتاب موجودہ اور نئی نسل کو ڈاکٹر صاحب کی ادبی سماجی خدمات سے متعارف کرانے کے مقصد سے ترتیب دی گئی ہے۔ اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت جو مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ کتاب کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ مضامین کی ترتیب اس طرح ہے۔ کچھ یادیں کچھ باتیں (مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی، مئو)، ڈاکٹر شکیل احمد اور ان کا اسلوب تحریر (مولانا اختر امام عادل قاسمی)، تپتے صحرا کا مسافر: ڈاکٹر شکیل احمد (مولانا ڈاکٹر اشتیاق احمد اعظمی، مئو)، شکیل صاحب اور ان کی خاکہ نگاری (مولانا ڈاکٹر عبید اقبال عاصم، علی گڑھ)، ملتے کہاں ہیں ایسے درخشندہ طبع لوگ (ڈاکٹر شباب الدین، اعظم گڑھ)، لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم (سہیل انجم، نئی دہلی)، ڈاکٹر شکیل احمد کی تبصرہ نگاری (حکیم وسیم احمد اعظمی، لکھنؤ)، اردو کا درخشندہ ستارہ: ڈاکٹر شکیل (مولانا جمال احمد ندوی مئو)، ڈاکٹر شکیل احمد صاحب کا اپنا پن (مولانا محمد اویس احمد قاسمی)، رفیق مکرم ڈاکٹر شکیل احمد (مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی)، قلم کا مسافر: ڈاکٹر شکیل احمد (مولانا انصار احمد معروفی قاسمی)، ڈاکٹر شکیل احمد کی خاکہ نگاری (ڈاکٹر محمد اشرف، گورکھپور)، گرم دم جستجو یعنی ڈاکٹر شکیل احمد (ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری)، ڈاکٹر شکیل احمد اور ان کی کتاب 'گرم دم جستجو' (مولانا نسیم ظہیر اصلاحی، سرائے میر)، گئے دنوں کی خوشبوئیں (ڈاکٹر شفیق اعظمی، سرائے میر)، دیرینہ دوست ڈاکٹر شکیل صاحب (ڈاکٹر مسعود اختر، ٹانڈہ)، ڈاکٹر شکیل احمد کی چند تصانیف (ڈاکٹر انعام الحق، گورکھپور)، کوائف 'سفر یاری' (ڈاکٹر فرزانہ انصاری، برہان پور)، ڈاکٹر شکیل احمد کا تنقیدی انسلاک (ڈاکٹر نفیس عبد الحکیم، الہ آباد)، سفر ہے شرط (ڈاکٹر امتیاز ندیم، مئو)، یہ تمام مضامین ڈاکٹر شکیل احمد صاحب کی شخصیت، سماجی و ملی خدمات نیز ان کی علمی، تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کا مکمل احاطہ کرتے ہیں۔

'جہات ڈاکٹر شکیل' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت واقعی ہمہ جہت ہے۔ ان کے تین خاکوں کے مجموعے اس بات کا ثبوت ہیں کہ موصوف کو خاکہ نگاری سے خاص دلچسپی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اسلوب نگارش بڑا انوکھا ہے۔ وہ سادہ زبان میں شخصیت کے خدوخال اس طرح ابھارتے ہیں کہ صاحب خاکہ کی شخصیت کے مختلف گوشے قاری پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل احمد کی خاکہ نگاری سے متعلق ڈاکٹر عبید اقبال عاصم صاحب لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر شکیل احمد صاحب نے خاکوں کو لکھتے وقت قلم کی سحر کاری اور حقیقت نگاری کے فن کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ آج کے دور میں اردو قلمکاروں میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے...''

ڈاکٹر صاحب کو جزیات نگاری میں بھی کمال حاصل ہے، ان کی نگاہ بڑی باریک بیں ہے۔ ڈاکٹر شباب الدین صاحب اپنے مضمون 'ملتے کہاں ہیں ایسے درخشندہ طبع لوگ' میں ڈاکٹر شکیل احمد کی مجموعی خدمات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان کی جزئیات نگاری اور تجربات و مشاہدات سے متعلق لکھتے ہیں:

اگر ان کی علمی تگ و دو اور ادبی کارناموں کا بالاستیعاب جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کو اشخاص و افراد اور علاقائی خصوصیات کو گہرائی سے جاننے، سمجھنے اور پرکھنے سے خاص انسیت ہے۔ وہ لوگوں سے ملاقات کے دوران صرف ملتے ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کرتے ہیں۔ اسی طرح جس علاقے اور خطے کا سفر کرتے ہیں اس کے خصائص و امتیازات کو اپنے حاشیۂ فکر و ذہن میں ٹانکتے جاتے ہیں اور پھر حسب موقع و گنجائش ان کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے جاتے ہیں۔

تبصرہ دراصل مختصر تنقید کے زمرے میں آتا ہے۔ تبصرہ نگار اپنی مختصر تحریر میں کتاب کی خوبی و خامی کو اعتدال و توازن کے ساتھ اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد بھی تبصرہ کرتے ہوئے کتاب میں شامل مواد پر بڑی دیانتداری اور ایمان داری کے ساتھ اپنی متوازن رائے پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حکیم وسیم احمد صاحب ڈاکٹر شکیل احمد کی تبصرہ نگاری سے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''وہ بے حد محتاط قلم ہیں، صحت متن اور اعتدال فکر ان کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ ان کے تبصروں کا مجموعہ 'کتاب یاری' اردو میں تبصرہ نگاری کی روایت کو ادبی صالحیت اور فنی دیانت کے ساتھ آگے بڑھاتا ہے...''

عام طور پر قلمکار علمی رعب جمانے کے لیے اپنی تحریروں میں ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحریر کا لطف زائل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر شکیل صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی گفتگو سادہ و شگفتہ انداز میں پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے قاری ان کی تحریروں سے مکمل طور پر لطف اندوز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری موصوف کے اسلوب تحریر اور زبان و بیان کی خوبیوں سے متعلق رقمطراز ہیں:

''شکیل احمد صاحب کی تحریریں ادق زبان، بوجھل جملوں اور غیر ضروری محاورہ بندی سے پاک ہیں۔ وہ بالکل سادہ اور عام فہم انداز میں اپنی بات کہنے کے عادی ہیں۔ موصوف کی تحریروں میں بے جا تکلفات اور مشکل پسندی کا دور دور تک شائبہ نہیں۔ بکثرت موقعوں پر ان کے یہاں عام بول چال کا انداز ملتا ہے، جو قاری کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتا۔ اسلوب نگارش کی خوبی یہ ہے کہ ہم پوری طرح مصنف کے جذبات و کیفیات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔''

ڈاکٹر شکیل احمد صاحب کی کتاب 'مئو شہر ہنروراں' مئوناتھ بھنجن کی تاریخی، سماجی، ادبی، ثقافتی، تجارتی، تعلیمی، معاشی اور معاشرتی حوالے سے ایک دستاویزی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے قاری مئوناتھ بھنجن کی ہر قسم کی سرگرمیوں سے واقف ہو سکتا ہے۔ ایسی کتابیں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں جو کسی شہر کا مکمل حوالہ ہوتی ہیں۔ اس کتاب کے تعلق سے پروفیسر عزیز اللہ شیرانی رقمطراز ہیں:

'مئو شہر ہنر وراں' ایک شہر کے جملہ معاشی، اقتصادی، سماجی، تعلیمی، تجارتی اور تہذیبی گوشوں کو سادہ زبان اور زمینی حقائق کے ساتھ ہمارے سامنے بکھیر دیتا ہے۔ بہت سے شہروں اور صوبوں کے بارے میں تعارفی اور تحقیقی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، یہ کتاب ان میں ایک اضافہ کے ساتھ قدرے انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ مصنف نے شہری و سماجی زندگی کے تمام طبقات کو تفصیل سے دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے وہ موجودہ دور میں قابل مطالعہ اور قابل قدر تو ہے ہی، مستقبل کے لیے یہ کتاب ایک دستاویزی حیثیت بھی رکھے گی۔

مذکورہ کتاب کے مطالعے کے بعد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب شکیل شناسی کے حوالے سے ایک دستاویزی حیثیت کی حامل بن گئی ہے۔ عدیم الفرصتی کے اس عہد میں مضامین کی تلاش و جستجو کرنا اور پھر اسے سلیقے سے ترتیب دے کر کتابی صورت میں منظر عام پر لے آنا واقعی لائق ستائش کارنامہ ہے، اس کے لیے مرتبین لائق صد مبارکباد ہیں۔

میمونہ علی چوگلے: نسائی ادب کی ایک اہم دستخط



مرتب: ڈاکٹر محمد دانش غنی

صفحات: 400، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2026

رابطہ: کوکن ادبی فورم، رتنا گری۔ 415639

مبصر: ڈاکٹر نفیس فاطمہ اے ایچ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، کوویمپو یونیورسٹی، شیموگہ، کرناٹک

اردو ادب کی تاریخ محض بڑے ناموں اور معروف ادبی تحریکوں کی تاریخ نہیں، بلکہ یہ ان بے شمار تخلیق کاروں کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ ہے جنھوں نے اپنے اپنے عہد کے احساس، فکر، معاشرت اور تہذیبی تجربات کو لفظوں کا پیکر عطا کیا۔ اس ادبی روایت میں خواتین قلمکاروں کی خدمات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ خواتین نے شاعری، افسانہ، ناول، تنقید اور تحقیق کے میدان میں اپنی تخلیقی شناخت قائم کرنے کے ساتھ ساتھ عورت کی داخلی دنیا، اس کے جذبات، محرومیوں، رشتوں اور معاشرتی مسائل کو بھی ادب کا حصہ بنایا۔ اسی وسیع تناظر میں میمونہ علی چوگلے ایک ایسی ادبی شخصیت کے طور پر سامنے آتی ہیں جن کے فن اور شخصیت کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو 'میمونہ علی چوگلے: نسائی ادب کی ایک اہم دستخط' کی صورت میں منظرِ عام پر آئی ہے اس میں میمونہ علی چوگلے کی شخصیت اور ادبی خدمات کو مختلف اہلِ قلم کی نگاہ سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میمونہ علی چوگلے نے اپنے تخلیقی سفر کے ذریعے ادب میں اپنی شناخت قائم کی، جب کہ ڈاکٹر دانش غنی نے ان کے فن و شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے ایک ادبی دستاویز کی صورت عطا کر دی۔ انھوں نے میمونہ علی چوگلے کے فن کو کسی ایک صنف یا ایک مخصوص زاویے میں مقید نہیں کیا بلکہ ان کی مختلف ادبی جہتوں کو روشن کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

کتاب کا عنوان 'میمونہ علی چوگلے: نسائی ادب کی ایک اہم دستخط' اپنے اندر ایک وسیع فکری دائرہ رکھتا ہے۔ میمونہ علی چوگلے کی شخصیت اور فن کا مطالعہ صرف ایک تعارفی نوٹ تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے اردو کے نسائی ادب کے وسیع تر تناظر سے جوڑتا ہے۔ نسائی ادب نے عورت کے تجربے کو محض ذاتی تجربہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے سماج، تہذیب، خاندان، رشتوں اور انسانی زندگی کے بڑے سوالات سے مربوط کیا۔ میمونہ علی چوگلے کے ادبی سفر کو بھی اسی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی تخلیقات میں عورت کی داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ انسانی رشتوں، معاشرتی رویوں اور زندگی کے مختلف تجربات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

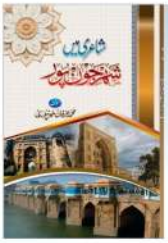
کتاب کی ترتیب اس اعتبار سے بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس میں میمونہ علی چوگلے کی شخصیت اور فن کو مختلف عنوانات کے تحت مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔ 'تجھ سے باتیں کرنا' کے حصے میں انٹرویوز کے ذریعے خود میمونہ علی چوگلے کی آواز قاری تک پہنچتی ہے۔ 'محبتوں کی مہک' اور 'سایہ دار شجر' جیسے عنوانات کے تحت شخصی اور تاثراتی مضامین اور نظمیں کتاب میں ایک جذباتی رنگ پیدا کرتی ہیں۔ ان تحریروں کے ذریعے میمونہ علی چوگلے محض ایک مصنفہ نہیں رہتیں بلکہ ایک ایسی ادبی شخصیت کے طور پر سامنے آتی ہیں جن سے ان کے احباب اور اہلِ قلم نے اپنے اپنے انداز میں تعلق محسوس کیا۔ 'اپنی تلاش' کے تحت تنقیدی مضامین میمونہ علی چوگلے کے فکری اور تنقیدی شعور کو سامنے لاتے ہیں۔ یہاں ان کے ادبی مزاج اور تنقیدی رویے کو مختلف زاویوں سے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'نرم اجالا' میں ان کی نظم نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ حصہ ان کی شاعرانہ شخصیت، شعری احساس اور فکری جہات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اسی طرح 'نئی صبح کی آس' کے تحت ان کی افسانہ نگاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کی افسانوی سوچ، سماجی شعور، انسانی رشتوں اور نفسیاتی کیفیات پر گفتگو اس حصے کو خاص اہمیت عطا کرتی ہے۔ 'خواب زندہ ہیں' کے عنوان سے منتخب افسانوں کا تجزیہ کتاب کے تحقیقی و تنقیدی پہلو کو مزید مضبوط کرتا ہے۔ یہاں میمونہ علی چوگلے کے افسانوی فن کو محض مجموعی انداز میں نہیں بلکہ منتخب تخلیقات کے حوالے سے دیکھنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ 'شعلوں میں گلاب' میں میمونہ صاحبہ کی کتابوں پر منتخب تبصرے شامل کیے گئے ہیں، جب کہ 'یہ چاہتیں، یہ محبتیں' کے تحت مشاہیر کی آرا اور خطوط کتاب کے دستاویزی پہلو کو مزید نمایاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح کتاب کے یہ مختلف ابواب دراصل میمونہ علی چوگلے کی شخصیت کے مختلف آئینے ہیں اور ہر آئینہ ان کے فن کا ایک الگ رنگ دکھاتا ہے اور سب مل کر ان کی ادبی شخصیت کی نسبتاً مکمل تصویر تشکیل دیتے ہیں۔

اس کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر محمد دانش غنی کا ذکر محض رسمی طور پر کافی نہیں۔ ان کی اس کوشش کو کتاب کے تشکیلی عمل کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ ایک فنکارہ کی مختلف اصناف میں موجود ادبی شناخت کو سامنے لانا، مختلف اہلِ قلم سے اس کے فن پر رائے لینا، مضامین کو ایک مرکزی موضوع کے گرد منظم کرنا اور پھر ان سب کو ایک کتابی شکل و صورت میں تبدیل کرنا، یقیناً محنت طلب کام ہے۔ ڈاکٹر محمد دانش غنی نے اس سلسلے میں ایک رابطہ کار کا کردار ادا کیا ہے۔ اگر اہلِ قلم کی یہ تحریریں مختلف رسائل و جرائد میں بکھری پڑی رہتیں تو میمونہ علی چوگلے کی ادبی شخصیت کا یہ جامع نقش شاید سامنے نہ آتا۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر دانش غنی نے اس کتاب میں میمونہ علی چوگلے کو صرف ایک ادبی شخصیت کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ ان کے فن، فکر، شاعری،

افسانہ نگاری، تنقیدی شعور اور ادبی روابط کو مختلف زاویوں سے یکجا کر کے ایک ایسا مطالعاتی منظرنامہ تشکیل دیا ہے جس میں میمونہ علی چوگلے کی شخصیت کے کئی رنگ اور ان کے فن کی متعدد جہتیں بیک وقت روشن ہوجاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ تفہیمِ میمونہ علی چوگلے کے سلسلے میں سودمند ہوگا۔

شاعری میں شہر جون پور



مؤلف: محمد عرفان جون پوری
صفحات: 215، قیمت: 275، سنہ اشاعت: 2025
پتہ: محمد عرفان جون پوری
عزیزیہ لائبریری، محلّہ میر مست، جون پور
مبصر: ڈاکٹر ذکی طارق، 564، کیلا ریڈ، گئوشالہ پاٹھک، غازی آباد، یوپی

اردو زبان وادب میں تذکروں اور گلدستوں کی روایت ابتدا ہی سے چلی آرہی ہے۔ منشی نثار حسین خاں نثار کا گلدستۂ شعرا پہلی بار 1859 میں شائع ہوکر عوام تک پہنچا۔ اس کے علاوہ گلدستہ 'سخن'، 'فیض سخن'، 'عنا'، 'دامن گلچیں'، 'خنجر عشق'، 'بہار ہند' غرضیکہ بے شمار گلدستے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ملک کے مختلف شہروں سے شائع ہوتے رہے ہیں لیکن موجودہ صدی میں نشر واشاعت کی سہولتوں کے باوجود وہ جادوئی اثر باقی نہیں رہا۔

ایسے میں ہمیں ان لوگوں کی یقیناً تعریف کرنی ہوگی جو اپنی جیب خاص سے پیسہ صرف کر کے اپنے شہر اپنی بستی اپنے قریوں کی تہذیب وتاریخ کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ اور شعر وادب کی اس وراثت کو محفوظ کر دینا چاہتے ہیں جو انھیں قدما سے ورثہ میں ملی ہے۔ ملک کے طول وعرض میں آج بھی ایسے اردو سے محبت کرنے والے دیوانے موجود ہیں جنھیں جنون کی حد تک اردو زبان سے شغف ہے اور وہ اپنی بستی کی اس شعری وراثت کو محفوظ کر رہے ہیں جس کی بدولت اس قریہ اس خطہ کی شناخت ہے۔ ریاست اتر پردیش میں عرفان عباسی نے اس سلسلہ کو جس طرح مضبوطی کے ساتھ محفوظ کیا ہے اس کی پذیرائی ضروری ہے۔ ادھر ریاست کے مختلف اضلاع کے ادیبوں اور شعرائے کرام پر مختلف لوگوں نے کام کیا ہے۔ حال ہی میں معروف محقق ڈاکٹر الیاس اعظمی کی شعرائے اعظم گڑھ جہاں ادبی حلقوں میں زیر مطالعہ رہی وہی زیر تبصرہ کتاب 'شاعری میں شہر جون پور' ایک اہم کتاب شائع ہوکر منظر عام پر آئی ہے جس کے مؤلف محمد عرفان جون پوری ہیں۔

عرفان جون پوری کی شخصیت صرف جون پور ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں نمایاں ہے۔ اردو زبان اور اردو والوں سے انھیں عشق ہے۔ اپنے مختصر سے مکان میں ایک شاندار کتب خانے کے مالک ہیں۔ ان سے جب گفتگو ہوتی ہے تب ان کی معلومات سے ان کے علم اور کتب خانہ کے راز کھل کر سامنے آتے ہیں۔ مخطوطات، مسودے نایاب کتابیں کتب خانہ میں موجود ہیں جس کا مطالعہ اور حفاظت عرفان صاحب کا شغل ہے۔ کسی کتاب کا ان سے ذکر کیجیے عرفان صاحب کا ہاتھ الماری کی جانب بڑھے گا اور کتاب آپ کو پیش کر دیں گے۔ یعنی وسیع المطالعہ اور کھوجی شخصیت کا نام عرفان جون پوری ہے جنھوں نے 'شاعری میں شہر جون پور' کو تلاش کر کے ادبی حلقوں تک پہنچایا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا ابتدائیہ اور مقدمہ جہاں مؤلف نے خود تحریر کر کے کر جون پور شہر کی تاریخ اور جغرافیہ پر تفصیل سے قاری کو روشناس کرایا ہے۔ وہیں تقدمہ کے تحت حکیم وسیم اعظمی صاحب نے 'شاعری میں شہر جون پور' کو 'فنافی الجون فور' بتایا ہے۔ اردو کے معروف نقاد حقانی القاسمی نے اسی شعری نگار خانہ میں جون پور کی تاریخ اور تہذیب کے ساتھ ادب وثقافت کے متنوع زاویے دیکھتے ہوئے اس کتاب کو ثقافتی دستاویز کہا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں 33 نظمیں ہیں، پہلی نظم 'صبح صادق' عنوان سے ہے جس کے مصنف محمد صادق جون پوری ہیں، نظم فارسی زبان میں ہے جس کا منظوم اردو ترجمہ فی البدیہہ شاعر ڈاکٹر علی احمد برقی اعظمی نے کیا ہے اور آصف ظفر نے بڑی سلیس زبان میں 'صبح صادق' کی تشریح کی ہے۔ بقیہ 32 نظمیں مختلف اہم شعرائے کرام کی شامل کی گئی ہیں۔ جیسے آسی غازی پوری، غبار جون پوری، صفی لکھنوی، حفیظ جون پوری، دماغ جون پوری، وامق جون پوری، رہبر جون پوری وغیرہ نے مختلف زاویوں سے شہر کی عمارتوں مسجدوں، پل، برسات، گومتی ندی غرضیکہ شہر سے متعلق عنوانات قائم کرا پنی اپنی افتاد طبع کے مطابق جو اشعار لکھے ہیں ان میں اپنے شہر جون پور سے محبت، حسین جذبات اور ان میں شعری بلاغت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ نظموں کے مطالعہ سے شاعروں کے یہاں ایک ستھرا مذاق ملتا ہے۔ وہیں شہر کی تہذیب، تمدن، علم، مدارس کے طلبا کی معصوم خواہش اور اساتذہ کی فکر ونظر کو جس طرح منظوم پیرایہ میں بیان کر کے شہر جون پور کی عظمت اور خصوصیات کو نمایاں کیا ہے اس کو عظیم ترین خدمت تسلیم کیا جانا چاہیے۔

نظموں کے علاوہ 16 قطعات اور 9 متفرق اشعار کے ساتھ 1991 کے ایک طرحی گلدستۂ غزل سے جون پور سے متعلق اشعار کا انتخاب کر کے شامل کیا گیا ہے جس کے لیے عرفان جون پوری صاحب یقیناً تعریف کے قابل ہیں کیونکہ صدق دل سے انھوں نے جس طرح اس کتاب کو مرتب کیا ہے وہ ان کی نکتہ سنجی اور ذوق عرفانی کی غماضی کر رہی ہے ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں کے ساتھ عوام میں بھی پسند کی جائے گی۔

رسائل و جرائد

ریسرچ جرنل دستک-17 (اردو ناقدین نمبر حصہ دوم)



مدیر: آفتاب احمد آفاقی، معاون مدیر: عبدالسمیع
جلد: 9، شمارہ: 1 (جنوری تا جون 2026)
صفحات: 400، قیمت: 450 روپے
مبصر: پروفیسر علی احمد فاطمی
سابق صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی سے شائع ہونے والا ششماہی رسالہ دستک کا تازہ شمارہ 'اردو ناقدین نمبر 2' منظر عام پر آ گیا ہے۔ اس سے قبل سولہواں شمارہ 'اردو ناقدین نمبر 1' بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس سے بھی قبل کے شمارہ 15 میں تنقید مبادیات، اصول ونظریات کے عنوان سے گراں قدر مضامین شامل تھے۔ یہ سارے مضامین اردو ادیبوں اور نقادوں پر جس کا سلسلہ محمد حسین آزاد، حالی، شبلی اور امداد امام اثر سے شروع ہوتا ہے اور کلیم الدین، شمس الرحمٰن فاروقی سے ہوتا ہوا قدوس جاوید

اور صغیر افراہیم تک پہنچتا ہے۔ یہ مضامین ان ادیبوں اور نقادوں نے تحریر کیے ہیں جن کی خود اپنی ادبی حیثیت مسلّم ہے۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ اس لیے کہ تنقید، تخلیق سے تو رشتہ بآسانی استوار کر لیتی ہے لیکن تنقید پر تنقید یا نقادوں کی تنقید پر تنقید کرنا ایک مشکل اور پیچیدہ عمل ہوا کرتا ہے لیکن آفتاب اور ان کے رفقا نے یہ مشکل کام کیا جو بے حد لائق تحسین ہے۔

صنفِ تنقید اب ترقی کر چکی ہے اور نقادوں کی تعداد بھی خاصی بڑھ چکی ہے۔ کسی ایک شمارے میں اردو کے ممتاز، نامور نقادوں کو سمیٹ پانا ممکن نہ تھا۔ اس لیے نقادوں سے متعلق ایک اور شمارہ نکالنے کی ضرورت پڑی جس کا اظہار مدیر نے اعتراف کے عنوان سے اداریے میں کیا ہے۔ چنانچہ تازہ شمارہ باقی ماندہ نقادوں پر مشتمل ہے جو وزیر آغا کی تنقید سے شروع ہو کر وارث علوی، سلیم احمد، گوپی چند نارنگ، شارب ردولوی، قمر رئیس وغیرہ سے ہوتا ہوا علی احمد فاطمی، شافع قدوائی، قدوس جاوید وغیرہ تک پہنچتا ہے۔ اس شمارے میں 30 نقادوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح دونوں ناقدین نمبر میں 62 نقاد شامل ہو سکے ہیں۔ ان دونوں شماروں میں شامل تنقید نگاروں کے نام اور ان کی تحریروں کو دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا ہے کہ انتخاب میں معیار دیکھا گیا ہے شمار نہیں اور نہ ہی یہ کہ کون ترقی پسند ہے اور کون جدید۔ کوئی کسی نظریے کا ہو، ہے تو وہ اردو کا نقاد۔ ہمیں پہلے زبان وادب دیکھنا چاہیے فکر ونظر بعد میں۔ تنقید میں اختلاف فکر ونظر ایک فطری اور فکری عمل ہے کہ ادب میں اختلاف رنگ وبو سے ہی بات بنتی ہے اور ترقی بھی ہوتی ہے۔ خود آفتاب احمد آفاقی کے یہ جملے دیکھیے:

''معاصر اردو تنقید اصلاً کسی ایک صورت نہیں بلکہ کئی سطحوں اور صورتوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں تنوع اور کثرت ہے۔ اس لیے اس میں کسی ایک نظریے، اپروچ، طریقۂ کار یا مرکزیت کی گنجائش نہیں ہے۔''

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تنقید بحیثیتِ صنفِ ادب بہت آگے جا چکی ہے۔ مختلف دھاروں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ وقت کے ساتھ بہت کچھ بدلتا ہے۔ اس لیے تاثر، تنقید میں بدل گیا جسے بدلنا ہی تھا۔ اس لیے کہ وہ اب مشرقی حصار نقد سے باہر نکل کر براہ راست مغربی علوم وافکار سے مملو ہو کر نئے سانچے اور ڈھانچے میں ڈھل گئی ہے۔ حالی ہمارے سب سے بڑے اور پہلے نقاد ضرور ہیں لیکن مغرب سے ناواقفیت انھیں مشرق کی طرف لے جاتی ہے اور گراں قدر تصنیف وجود میں آتی ہے۔ انگریزی کے پروفیسر اور اردو کے نقاد کلیم الدین احمد نے اردو میں دو غیر معمولی کتابیں 'اردو شاعری پر ایک نظر' اور 'اردو تنقید پر ایک نظر' لکھ ڈالیں۔ یہ کتابیں اُس وقت آئیں جب کلیم الدین جوان تھے اور مغربی تعلیم وتہذیب میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس لیے انھیں مشرق میں کچھ نظر نہ آیا اور جب وہ رفتہ رفتہ پھر مشرق کی طرف واپس ہوئے تو داستان، انیس اور اقبال پر پوری کتاب لکھی۔ یہ تضاد نقاد کا نہیں تنقید کا ہوا کرتا ہے کہ بے مثال تخلیق رائے بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

دستک کے تازہ ترین شمارے کے اداریے میں آفتاب احمد آفاقی صاف طور پر لکھتے ہیں:

''معاصر ناقدین نے نہ صرف اپنے پیشرو کے نظریات سے کسب فیض کیا ہے بلکہ کلاسیکی تصورِ نقد کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان ناقدین کی تحریروں میں کلاسیکی، ہیئتی، مارکسی، نفسیاتی لسانی، عمرانی، اکتشافی، تشریحی وتبصراتی طریقۂ کار نظر آتا ہے۔''

مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں یہ مختصر تبصرہ ہے طولانی مضمون نہیں لیکن پھر بھی یہ بتاتا چلوں کہ یہی وہ آل احمد سرور ہیں جنھوں نے 1965 کے آس پاس 'تنقید کے بنیادی مسائل' عنوان سے کئی سمینار علی گڑھ میں منعقد کیے جن کے زیادہ تر مضامین 1967 میں کتابی شکل میں شائع ہوئے جو تنقید کی ماہیئت پر ایک عمدہ کتاب ہے اور اسے پھر سے شائع ہونا چاہیے۔ اُسی کے آس پاس ممتاز ترقی پسند نقاد احتشام حسین نے ایک کتاب 'تنقیدی نظریات' کے نام سے ترتیب دی جسے بعد میں یوپی اردو اکادمی نے دو جلدوں میں شائع کیا۔ احتشام حسین نے اپنی نگرانی میں تنقید پر کئی پی ایچ ڈی مقالے بھی لکھوائے۔ عبادت بریلوی نے 'اردو تنقید کا ارتقا' اور شارب ردولوی نے 'جدید اردو تنقید: اصول ونظریات' کے عنوان سے تحقیقی مقالے لکھے۔ بہت پہلے محمد احسن فاروقی کی ایک اہم کتاب اردو میں تنقید شائع ہوئی تھی جس میں آزاد، حالی، شبلی، عبدالحق، کلیم الدین احمد پر گراں قدر مضامین ہیں۔ ایک مضمون 'اردو نقد کا مستقبل' بے حد اہم تو ہے لیکن مایوسی زیادہ ہے۔ آج وہ زندہ ہوتے اور کلیم الدین احمد بھی زندہ ہوتے تو اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ اردو تنقید کا دامن فکر ونظر اور سمت وجہت کے اعتبار کس قدر پھیل چکا ہے۔

پروفیسر آفتاب احمد آفاقی اور ان کے رفقا کا یہ گراں قدر کارنامہ انہی ترقیوں اور تبدیلوں کا ایک قابل قدر، تحسین آمیز ارتقائی قدم ہے۔ یہ سارے شمارے اگر ایک مکمل ومنفرد کتاب میں آجائیں تو اس کی حیثیت یادگاری اور تاریخی ہو جائے گی۔ یہ ضرور ہے کہ دور حاضر میں جو تحقیقی وتنقیدی مقالے لکھے جا رہے ہیں وہ کمزور اور غیر تنقیدی زیادہ ہیں۔ وہ تاثراتی اور اطلاعاتی بھی نہیں ہیں۔ صرف ہلکے پھلکے مضامین ہیں۔ تنقید لکھنا آسان نہیں۔ اس کے لیے علم وفکر کی ضرورت تو ہوتی ہے، ایک تجزیاتی ذہن کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی خیال رہے کہ تنقید یا نقاد فیصلہ نہیں کرتا، اپنی رائے پیش کرتا ہے۔ فیصلہ وقت اور تاریخ کرتی ہے۔ آفتاب احمد آفاقی نے بہت خاموشی سے بہت بڑا کام کر دیا ہے۔ اس کی قدر ہونی چاہیے۔ اسے پڑھا جانا چاہیے۔ اس کا حق ادا کرنا چاہیے۔

مجلہ 'ارمغان' (14)



جلد:11، شمارہ:14 (2025)

سرپرست: پروفیسر مظہر آصف

مدیر اعلیٰ: پروفیسر کوثر مظہری، مدیر: پروفیسر عمران احمد عندلیب

صفحات:512

پتہ: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔25

مبصر: ڈاکٹر فیضان الحق، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے شائع ہونے والا مجلّہ 'ارمغان-14' پیش نظر ہے۔ گذشتہ کئی برسوں سے یہ مجلّہ مسلسل مطالعے کا حصہ رہا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر شمارہ کسی ایک موضوع پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس مجلّے کی شروعات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر جناب نجیب جنگ کے دور میں ہوئی اور پہلا شمارہ

انہی کی سرپرستی اور پروفیسر خالد محمود کی نگرانی میں 'تحقیق وتنقید نمبر' 2012 میں شائع ہوا۔ تب سے لے کر آج تک یہ مجلّہ طالب علموں اور ادب کے سنجیدہ قارئین کو متوجہ کرتا رہا ہے۔ مجلّے کے خصوصی شمارے 'جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تخلیقی ادب' اور 'جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اردو خدمات' اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں جن میں اردو کی نمائندگی کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ اساتذہ اور دیگر دانشوران کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ یہ شمارے جامعہ کی علمی، ادبی اور تخلیقی روایت سے روشناس کراتے ہیں۔ اسی طرح ارمغان کا 'فکشن نمبر' افسانہ اور ناول سے متعلق متعدد اہم مضامین اور مباحث کو سامنے لاتا ہے۔ یہ مضامین نئے اور پرانے سے زیادہ اس نقطۂ نظر سے مطالعے کا تقاضہ کرتے ہیں کہ ان کے ذریعے فکشن کی روایت کے ساتھ نئی تبدیلیوں اور رجحانات کا علم ہوتا ہے۔

'ارمغان' کا زیرِنظر شمارہ اردو ادب کی تاریخ میں موجود 3 بنیادی رجحانات 'ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت' سے متعلق ہے۔ شمارے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں تنقیدی مضامین کے ساتھ تخلیقی تحریروں کو بھی شامل کیا گیا ہے اور تخلیق میں نثری ادب کے ساتھ شعری ادب کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ شمارے میں صفحات کی قید کے سبب ممکن ہے بہت سے نام شامل ہونے سے رہ گئے ہوں لیکن اس شمارے کے مطالعے سے اردو کی علمی، ادبی روایت کے غالب رجحانات اور اہم چہروں سے آشنائی ہوتی ہے۔ جن شخصیات پر تنقیدی مضامین شامل ہیں ان کی تخلیقات شامل نہیں کی گئی ہیں بلکہ ان کے بعد کی نسل کو جگہ دی گئی ہے۔ اس سے کسی قسم کی درجہ بندی کے بجائے ایک روایت کا سراغ ملتا ہے جو فکر و خیال سے نکل کر قلم و قرطاس تک پہنچتی ہے۔ 3 بنیادی رجحانات سے متعلق آل احمد سرور (ادب میں جدیدیت کا مفہوم)، محمد حسن (مارکسی نظری تنقید)، گوپی چند نارنگ (مابعد جدیدیت: عالمی تناظر میں)، باقر مہدی (ترقی پسندی اور جدیدیت کی کشمکش)، شمیم حنفی (جدیدیت اور نئی شاعری)، عتیق اللہ (تانیثی جمالیات کا تعین: شبہات و امکانات)، لطف الرحمٰن (مارکسیت اور وجودیت)، سید تنویر حسین (ساختیات: تعارف اور محاکمہ)، سرور الہدیٰ (نوتاریخیت کے مباحث)، عبدالسمیع (حلقۂ ارباب ذوق اور اردو نظم) اور فیضان الحق (ترقی پسند اردو غزل: ایک مطالعہ) کے مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مستحکم ادبی روایات کو نئے زاویے سے دیکھنے کا موقعہ فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح 'افسانہ' اور 'نظموں کے تجزیے' کے باب میں صغیر افراہیم (کرفیو سخت ہے: انیس رفیع)، ڈاکٹر شکیل اختر (ٹوبہ ٹیک سنگھ: منٹو)، پروفیسر اسلم جمشید پوری (اپنے دکھ مجھے دے دو: بیدی)، شہاب ظفر اعظمی (ناگہانی: حسین الحق)، ڈاکٹر عمر غزالی (گنبد کے کبوتر: شوکت حیات)، ڈاکٹر خالد مبشر (دو فرلانگ لمبی سڑک: کرشن چندر)، ڈاکٹر رشی کمار شرما (دادا اور پوتا: مشرف عالم ذوقی)، ڈاکٹر امتیاز علیمی (آتما رام: بلراج مین را)، ڈاکٹر نوشاد منظر (عنکبوت: شموئل احمد)، علی رفاد فتیحی (کسان: جوش ملیح آبادی)، کوثر مظہری (آدھی رات: فراق گورکھپوری)، احمد محفوظ (جاتری: میراجی)، شاہ عالم (چاند تاروں کا بن: مخدوم محی الدین)، عادل حیات (تنہائی: فیض احمد فیض)، معید الرحمٰن (ہاتھوں کا ترانہ: سردار جعفری)، معید رشیدی (انتظار: پرویز شاہدی)، رضینہ خان (آوارہ: اسرار الحق مجاز)، حبیب الرحمٰن (صبا ویراں: ن م راشد)، سید محمد ثاقب فریدی (آئینہ خانے کے قیدی سے: عمیق حنفی) اور ثاقب عمران (عہد وفا: اختر الایمان) کے تجزیاتی مضامین متن کی باریکیوں کو سلجھانے کی سنجیدہ کوششیں ہیں۔ یہ تحریریں متن اساس مطالعے کی مثال ہیں جن میں روایت کے ساتھ جدت کے اثرات بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

رسالے کا دوسرا اہم حصہ 'باب تخلیق' ہے جس کے تحت چند نئے افسانہ نگاروں اور نظم نگاروں کو جگہ دی گئی ہے۔ ان میں رشید جہاں، خواجہ احمد عباس، سریندر پرکاش، نیر مسعود، قمر احسن، عبدالصمد، سلام بن رزاق، ذکیہ مشہدی، غضنفر، سید محمد اشرف، خالد جاوید، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، سلام مچھلی شہری، ضیا جالندھری، یوسف ظفر، وزیر آغا، منیب الرحمٰن، ستیہ پال آنند، بلراج کومل، خلیل الرحمٰن اعظمی، شاذ تمکنت، ادا جعفری، وحید اختر، افتخار جالب، قاضی سلیم، انیس ناگی، شہریار، عادل منصوری، شفیق فاطمہ شعریٰ، عتیق اللہ، وہاب دانش، ساجدہ زیدی، شہاب جعفری، بشر نواز، مخمور سعیدی، ظفر گورکھپوری، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، اسلم آزاد، مصحف اقبال توصیفی، راشد جمال فاروقی، صلاح الدین پرویز، عنبر بہرائچی، رفیعہ شبنم عابدی، شین کاف نظام، ملکہ تسنیم، عین تابش، جینت پرمار، جمال اویسی، اے نصیب خان، ریاض لطیف، راشد انور راشد، شکیل اعظمی، عادل حیات اور عادل رضا منصوری کے نام شامل ہیں۔ ان ناموں پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ رسالے کے ذمے داران نے قدیم و جدید اردو ادبیات کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردیا ہے۔ ان میں کئی نام ایسے ہیں جو سنجیدہ تحقیقی ڈسکورس کا حصہ بن چکے ہیں اور جو نئے ہیں وہ بھی اپنی کاوشوں کے ذریعے اسی سمت گامزن ہیں۔

رسالے کی ترتیب شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تحقیقی کاوشوں کی بھی عکاسی کرتی ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اساتذہ اسی روایت کو آگے بڑھانے میں سرگرم ہیں جس نے اردو ادب کی تاریخ کے 3 اہم رجحانات کو جنم دیا ہے، کیونکہ روایات کا ادراک ہی ہمیں جدید تناظر میں غور وفکر کے مواقع فراہم کرتا ہے اور ہم بدلے ہوئے تہذیبی، سماجی اور سیاسی منظرنامے میں قدیم ادبی متون کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں یا نیا متن خلق کرتے ہیں۔ تحریکات و رجحانات کے سلسلے میں عام طور پر یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ نظری مباحث اور تنقید پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جب کہ اصل صورت میں ان رجحانات کو تخلیقی متن میں دریافت کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی نظری ڈسکورس کو استحکام تخلیقی متون سے حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نظری مباحث غیر ضروری یا کم مفید ہیں۔ میرا خیال ہے یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے لازمی اور تقویت بخش ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر موجودہ شمارے کا مطالعہ کیا جائے تو تحریکات و رجحانات سے متعلق مضامین اور تخلیقی متون کی ایک ساتھ قرأت کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے، لہٰذا ہم جیسے طالب علموں کے لیے یہ بیش قیمتی علمی سرمایہ ہے۔

اس اہم دستاویزی رسالے کی ترتیب کے لیے میں رسالے کے سرپرست پروفیسر مظہر آصف (وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ)، مدیر اعلیٰ پروفیسر کوثر مظہری (صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ)، مدیر پروفیسر عمران احمد عندلیب کے ساتھ مجلس مشاورت، مجلس ادارت اور مجلس مراجعین کے تمام اراکین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کا ممنون بھی ہوں۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

اردو زبان شخصیت کو سنوارنے کے ساتھ زندگی کے آداب بھی سکھاتی ہے: عزت مآب کرن رجیجو

نئی دھلی: آج انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی میں بھارت ایکسپریس اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے باہمی اشتراک سے یک روزہ 'اردو صحافت کانکلیو' کا انعقاد کیا گیا۔ اس کانکلیو میں صحافت اور ادب سے وابستہ معزز و موقر شخصیات نے شرکت کی اور اردو زبان و صحافت کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ افتتاحی اجلاس میں بحیثیت مہمان خصوصی، مرکزی وزیر برائے اقلیتی و پارلیمانی امور، حکومت ہند عزت مآب کرن رجیجو نے شرکت کی۔ مہمانان اعزازی میں جناب



شاہد صدیقی (سابق رکن پارلیمنٹ، راجیہ سبھا و سینئر صحافی)، جناب سید شاہنواز حسین (سابق مرکزی وزیر اور قومی ترجمان، بی جے پی) اور پروفیسر (ڈاکٹر) شاہد اختر (چیئرمین، کارگزار، قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات) شامل رہے۔

مہمان خصوصی جناب کرن رجیجو نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کانکلیو اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ اس میں اردو زبان اور اس کی خدمات کے تعلق سے گفتگو کی جارہی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس زبان کی شیرینی کا گہرا احساس ہے۔ اس زبان کا واقف شخص بہت ہی ثروت مند ہوتا ہے۔ یہ زبان شخصیت کو سنوارنے کے ساتھ زندگی گزارنے کے آداب بھی سکھاتی ہے۔ انھوں نے اردو زبان کے تاریخی حقائق اور اس کی قدامت پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ یہ خالص ہندوستان کی زبان ہے۔ تقسیم کے بعد گرچہ ہمارے پڑوسی ملک نے اسے اپنی زبان کے طور پر قبول کیا لیکن وہ لوگ بھی ہندوستان ہی کے تھے۔ اس لیے اردو کی جائے پیدائش اور اس کا خمیر ہندستانی ہے، اسے کسی مذہب یا فرقے سے قطعی نہیں جوڑا جاسکتا۔ انھوں نے مزید اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو مقبول عام بنانے کے طریقوں پر غور کرنا چاہیے۔ حکومتی اور ذاتی سطح پر اس کے لیے جو کوششیں ہوسکیں گی ہم اس کے لیے تیار ہیں۔

مہمان اعزازی جناب سید شاہنواز حسین نے اردو زبان کی خصوصیات اور لفظوں کی تاثیر پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو مشترکہ تہذیبی وراثت کی امین ہے۔ مختلف زبانوں سے آنے والے الفاظ اسے ہر طبقے کے لیے مقبول بناتے ہیں۔



انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل کے ذریعے اردو کا غیر معمولی فروغ ہوا ہے، اسے اس سمت میں اپنی کوششیں جاری رکھنی چاہئیں۔ موجودہ وقت میں اے آئی اور ٹیکنالوجی کے ذریعے بھی اسے فروغ دیا جاسکتا ہے۔

اس سے قبل تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد شمس اقبال (ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) نے کہا کہ ملک کی تعمیر وترقی میں اردو صحافت کا بنیادی کردار رہا ہے۔ اس حوالے سے تین تاریخیں قابل ذکر ہیں۔ ایک 1857 جسے پہلی جنگ آزادی تصور کیا جاتا ہے جس میں اردو صحافت کی غیر معمولی مثال اخبار 'جام جہاں نما' ہے۔ دوسری 1947 کی آزادی جس کے لیے مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے اپنا قلمی اور صحافتی تعاون فراہم کیا اور تیسری 2047 جس میں عزت مآب وزیر اعظم شری نریندر مودی نے وکست بھارت کا خواب دیکھا ہے۔ یہ تینوں تواریخ بتاتی ہیں کہ آغاز تا حال اردو نے ملک کی تعمیر وترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور وہ وکست بھارت کے خواب کو بھی شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے کوشاں ہے۔

مہمان اعزازی جناب شاہد صدیقی نے اردو زبان کی شناخت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی شناخت تہذیب، شائستگی اور محبت سے ہے، یہ عوام کی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلموں میں اس کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ انھوں نے مصنوعی ذہانت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کو وسیع پیمانے پر فروغ دینے کے لیے اے آئی کو بھی کام میں لانے کی ضرورت ہے۔ قومی اردو کونسل نے ان پیج میں نستعلیق فاؤنٹ کے حوالے سے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس نے ہندوستان میں اردو صحافت کو نئی سمت عطا کی ہے۔

مہمان اعزازی پروفیسر شاہد اختر نے کہا کہ ہندوستان، زبانوں کا مرکز ہے، جس میں اردو زبان کی منفرد شناخت ہے۔ عزت مآب وزیر اعظم نے جس وکست بھارت 2047 کا خواب دیکھا ہے اس میں ہندستانی زبانوں بالخصوص اردو کا بہت ہی اہم کردار ہوگا، اس لیے کہ یہ اتحاد، مشترکہ تہذیب اور محبت کی نمائندگی کرتا ہے۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے جناب رادھے شیام رائے (ڈائرکٹر اینڈ گروپ مینیجنگ ایڈیٹر، بھارت ایکسپریس نیوز نیٹ ورک) نے اردو زبان کی مشترکہ تہذیبی وراثت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو اور ہندی کا آپس میں مضبوط رشتہ ہے، دونوں مشترکہ تہذیبی روایت کو آگے بڑھاتی ہیں۔ گفتگو اور فکر کی سطح پر ان دونوں کے درمیان محض رسم الخط کا فرق پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

اس سیشن میں ڈاکٹر خالد رضا خان (ایڈیٹر، بھارت ایکسپریس اردو) نے استقبالیہ کلمات پیش کیے اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر نثار احمد خان (چیف سب ایڈیٹر، بھارت ایکسپریس اردو) نے انجام دیے۔ اجلاس کے اختتام پر بھارت ایکسپریس کے ذریعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی تاریخ اور کارگزاریوں پر مشتمل ایک ڈاکیومنٹری فلم بھی دکھائی گئی۔

اس کے بعد اس ڈاکیومنٹری کے حوالے سے ایک پینل ڈسکشن کا انعقاد کیا گیا، جس میں بطور پینلسٹ ڈاکٹر محمد شمس اقبال (ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ (سابق ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)، پروفیسر ارتضیٰ کریم (سابق ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) نے بطور پینلسٹ شرکت کی اور ڈاکیومنٹری کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اس سیشن کو ڈاکٹر خالد رضا خان نے موڈریٹ کیا۔

کانکلیو کا دوسرا سیشن 'قوم کی تعمیر میں اردو صحافت کا کردار' کے عنوان سے منعقد ہوا جس میں جناب فیروز بخت احمد (سابق چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)، جناب تحسین منور (سینئر صحافی، شاعر اور مصنف)، جناب خورشید ربانی (سینئر صحافی اور نیوز اینکر)، جناب اطہر سعید (سینئر صحافی اور نیوز اینکر) اور ڈاکٹر وسیم راشد (سینئر صحافی، شاعر اور مصنف) نے شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

کانکلیو کا تیسرا سیشن 'سیاسی مکالمے میں اردو کا کردار' کے عنوان سے منعقد ہوا جس میں جناب عمران مسعود (ممبر آف پارلیمنٹ، لوک سبھا، سہارنپور)، جناب آلوک وتس (ترجمان بی جے پی اور سیاسی تجزیہ نگار) اور جناب روہت پوکھریال (اینکر بھارت ایکسپریس) نے بطور پینلسٹ شرکت کی جب کہ اس سیشن کو ڈاکٹر نثار احمد خان نے موڈریٹ کیا۔

تکنیکی سیشن کے بعد ایک آل انڈیا مشاعرہ و کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا جس میں محترمہ برکھا سنگھ، جناب اقبال اشہر، محترمہ شالنی سنگھ، پروفیسر رحمان مصور، محترمہ انا دہلوی، محترمہ انامیکا جین امبر، محترمہ علینا عترت، جناب معین شاداب، جناب اختر اعظمی، جناب انس فیضی، محترمہ ہانشی بابرہ، ڈاکٹر حبیب الرحمٰن، محترمہ خوشبو پروین، جناب سفیر صدیقی، ڈاکٹر نوازش طالب نے شرکت کی۔ اس میں جناب فاروق سید نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ جب کہ نظامت کے فرائض جناب معین شاداب نے انجام دیے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 17 ستمبر 2026

اردو افسانہ اور تقسیم ہند: نفسیاتی مضمرات

نئی دھلی: آج بتاریخ 28 ستمبر 2026 ستیہ وتی کالج، دہلی یونیورسٹی کے سمینار ہال میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بہ اشتراک ستیہ وتی کالج، دہلی یونیورسٹی 'اردو افسانہ اور تقسیم ہند: نفسیاتی مضمرات' کے عنوان سے یک روزہ قومی سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس سمینار میں افتتاحی اجلاس کے علاوہ دو اہم تکنیکی اجلاس بھی منعقد کیے گئے، جن میں ادبا و دانشوران نے موضوع کے تعلق سے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر رمیش چندر بھاردواج (سابق وائس چانسلر، مہارشی بالمیکی سنسکرت یونیورسٹی، کیتھل، ہریانہ) اور پروفیسر شیخ عقیل احمد (شعبۂ اردو، ستیہ وتی کالج، دہلی یونیورسٹی) نے کی۔ پروفیسر ایس کے اشتیاق احمد (رجسٹرار، مانو، حیدرآباد) نے بطور مہمان خصوصی اور پروفیسر سبھاش کمار سنگھ (پرنسپل ستیہ وتی کالج، دہلی یونیورسٹی) نے بطور مہمان اعزازی شرکت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر ابوبکر عباد (صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے کلیدی خطبہ اور ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) نے تعارفی کلمات پیش کیے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر قمر الحسن (شعبۂ اردو، ستیہ وتی کالج، دہلی یونیورسٹی) نے پیش کیے اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد رکن الدین (شعبۂ اردو، ستیہ وتی کالج، دہلی یونیورسٹی) نے ادا کیے۔



صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر رمیش چندر بھاردواج نے اپنے استاد نامور سنگھ کے حوالے سے کہا کہ اردو زبان میں گفتگو سے ایک منفرد قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ اردو خالص ہندستانی اور عوام کی زبان ہے۔ ہندستانی زبان اور معاشرے کو انگریزی کلچر نے نقصان پہنچایا ہے۔ مذہب کے نام پر ملک کی اور زبان کے نام پر صوبوں کی تقسیم مضر ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان کی تفہیم کے لیے سنسکرت، فارسی اور اردو زبان کا علم ضروری ہے۔

اس سے قبل ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک) نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کی مختلف سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے اردو فکشن میں تقسیم ہند کے نفسیاتی اور سماجی اثرات کی جانب بھی اشارہ کیا اور فکشن سے متعلق قومی اردو کونسل کی مطبوعات سے بھی متعارف کرایا۔

پروفیسر شیخ عقیل احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ادب سیاست کا پابند نہیں بلکہ یہ سیاست کو بھی چراغ دکھاتا ہے۔ ایک ادیب معاشرے کا رہنما ہوتا ہے۔

پروفیسر ایس کے اشتیاق احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تقسیم ہند کے ساتھ مختلف مسائل پیدا ہوئے۔ جنگ آزادی اور تقسیم کے کرب کو اردو افسانہ نگاروں نے بطور خاص جگہ دی۔ راجندر سنگھ بیدی، منٹو، خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر جیسے متعدد افسانہ نگاروں نے فسادات سے متعلق اہم افسانے تخلیق کیے۔

پروفیسر ابوبکر عباد نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے موضوع سے متعلق متعدد اہم نکات پر روشنی ڈالی اور تقسیم کے سبب اردو افسانے پر پڑنے والے اثرات کو واضح کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس سانحے کے بعد معاشرے میں خوف اور عدم تحفظ کے احساس کو اردو افسانے نے خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے اردو افسانے کی روایت سے بحث کرتے ہوئے مختلف تحریکات و رجحانات کا ذکر کیا اور اردو افسانے کو درپیش نئے چیلنجز سے روشناس کرایا۔

پہلے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر ابوبکر عباد اور پروفیسر محمد کاظم (شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی) نے کی۔ اس سیشن میں پانچ مقالے پیش کیے گئے۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر شاذیہ عمیر (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے 'جمیلہ ہاشمی کا ناول بنواس: تقسیم ہند کے





تناظر میں' کے عنوان سے، دوسرا مقالہ جناب شعیب رضا فاطمی (ایڈیٹر، روزنامہ ہمارا سماج، دہلی) نے 'اردو افسانہ اور تقسیم کے مسائل' کے عنوان سے، تیسرا مقالہ ڈاکٹر ارشاد احمد خان (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے 'اردو ہندی کہانیوں پر تقسیم ہند کے اثرات کا تقابلی مطالعہ' کے عنوان سے، چوتھا مقالہ پروفیسر مشرف علی (شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی) نے 'اردو افسانے پر تقسیم ہند کے اثرات اور اس کے مضمرات، جوگیندر پال کے خصوصی حوالے سے' کے عنوان سے اور پانچواں مقالہ ڈاکٹر شاہد اقبال (شعبۂ اردو، دیال سنگھ ایوننگ کالج، دہلی یونیورسٹی) نے 'تقسیم ہند مشترکہ تہذیب اور انتشار' کے عنوان سے پیش کیا۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر محمد کاظم نے تمام مقالوں پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تقسیم کے سبب پیدا ہونے والے خوف کے ماحول کی نمائندگی میں اردو افسانے نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اجلاس کے دوسرے صدر پروفیسر ابوبکر عباد نے کہا کہ ادب کا قاری علوم وفنون کے مختلف شعبوں سے واقف ہوتا ہے اور یہ ایک اچھا شہری بننے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر عارف اشتیاق (شعبۂ اردو، ستیہ وتی کالج، دہلی یونیورسٹی) نے کی۔

دوسرے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر مشرف علی نے کی۔ اس اجلاس میں بھی پانچ مقالے پیش کیے گئے۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر غلام نبی نے 'سعادت حسن منٹو کے افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں نفسیاتی مضمرات' کے عنوان سے، دوسرا مقالہ پروفیسر شمیم احمد (شعبۂ اردو، سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی یونیورسٹی) نے 'تقسیم ہند سے متاثر بے زبان افراد کی کہانی بے زبان اشیا کی زبانی' کے عنوان سے، تیسرا مقالہ پروفیسر محمد ساجد حسین (شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، دہلی) نے 'تقسیم ہند کے فسادات اور اردو افسانہ' کے عنوان سے، چوتھا مقالہ پروفیسر محمد کاظم (شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے 'اردو افسانہ اور تقسیم ہند نفسیاتی مضمرات: منٹو کے حوالے سے' کے عنوان سے اور پانچواں مقالہ ڈاکٹر فیاض احمد (شعبۂ اردو، ستیہ وتی کالج، دہلی یونیورسٹی) نے 'تاریخ کی راکھ اور وجود کی ٹوٹ پھوٹ: 1947 کا صدمہ اور اردو افسانہ' کے عنوان سے پیش کیا۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر مشرف علی نے تمام مقالہ نگاروں کو اہم موضوعات پر مقالہ پیش کرنے کے لیے مبارکباد پیش کی اور موضوع کی اہمیت و اردو افسانے کے تعلق سے اظہار خیال کیا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر افسانہ (شعبۂ اردو، ستیہ وتی کالج، دہلی یونیورسٹی) نے کی۔

اخیر میں ڈاکٹر فخر عالم (شعبۂ اردو، ستیہ وتی کالج، دہلی یونیورسٹی) کے کلمات تشکر پر یہ یک روزہ قومی سمینار اختتام پذیر ہوا۔ سمینار میں متعدد دانشوران، اساتذہ، اور طلبہ و طالبات کے علاوہ قومی اردو کونسل سے ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر)، ڈاکٹر فیضان الحق (ریسرچ اسسٹنٹ)، ڈاکٹر شاداب شمیم (پروجیکٹ اسسٹنٹ) اور ڈاکٹر صائمہ ثمرین (پروجیکٹ اسسٹنٹ) موجود رہے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 28 ستمبر 2026

گومتی بک فیسٹیول 2026 میں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام مشاعرے کا انعقاد

لکھنؤ/دہلی: گومتی بک فیسٹیول (12 تا 20 ستمبر 2026) میں آج شام چار بجے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس مشاعرے میں ڈاکٹر عمار رضوی (صدر، آل انڈیا مائنارٹیز فورم فار ڈیموکریسی) نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی جب کہ شعرا میں جناب حسن کاظمی، جناب چودھری چرن سنگھ بشر، جناب ملک زادہ جاوید، جناب منیش شکلا، جناب پپلو لکھنوی اور محترمہ تارا اقبال نے اپنے کلام سے نوازا۔ مشاعرے کی صدارت جناب حسن کاظمی نے اور نظامت ڈاکٹر فیضان الحق (ریسرچ اسسٹنٹ، این سی پی یو ایل) نے کی۔ فیضان الحق نے قومی اردو کونسل کی جانب سے تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کی مختلف علمی و ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور کتاب کلچر کے فروغ میں ادارے کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کی کاوشوں کا بھی ذکر کیا۔ واضح رہے کہ اس سے قبل بھی کونسل چنار بک فیسٹیول، علی گڑھ کتاب میلہ، گومتی بک فیسٹیول اور عالمی اردو کانفرنس میں مختلف ادبی و ثقافتی تقاریب اور مشاعروں کا انعقاد کر چکی ہے۔ یہ مشاعرہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔



مہمان خصوصی ڈاکٹر عمار رضوی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل مختلف پروگراموں اور کتابوں کی اشاعت کے ذریعے اردو کو فروغ دے رہی ہے۔ مشاعروں کا انعقاد بھی اس لیے اہم ہے کیونکہ مشاعروں نے ملک کی تعمیر و ترقی اور مشترکہ تہذیب کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اردو زبان اور لکھنوی تہذیب کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو کا لکھنؤ سے گہرا رشتہ ہے اور یہاں کے شعرا کا ایک الگ مقام ہے۔

مشاعرے میں تمام شعرا نے نہایت عمدہ کلام پیش کیا، جس پر سامعین نے بھرپور داد و تحسین سے نوازا۔ بطور نمونہ شعرا کی غزلوں کا ایک ایک شعر یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

اپنا چہرا کوئی کتنا بھی چھپائے لیکن
وقت ہر شخص کو آئینہ دکھا دیتا ہے
(حسن کاظمی)

کس قدر آج برا حال ہے ہم لوگوں کا
حادثے آ کے جگاتے ہیں تو ہم جاگتے ہیں
(چرن سنگھ بشر)

دھوپ کے ساتھ چھاؤں بھی روئی
آج اک پیڑ سوکھ جانے پر
(ملک زادہ جاوید)

ہماری جان کے دشمن نے، ہم نے اور رب نے
ہماری چیخ سنی صرف تین لوگوں نے
(منیش شکلا)

یقین سبزہ نہیں تھا جو خود بخود اگتا
یقیں وہ فصل ہے جو دیکھ بھال چاہتی ہے
(تارا اقبال)

کوئی بھی روک نہ پاتا گزر گیا ہوتا
مرا نصیب محبت سنور گیا ہوتا
نہ آئیں ہوتی جو بیگم مری عیادت کو
میں اسپتال کی نرسوں پہ مر گیا ہوتا
(پپلو لکھنوی)

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 19 ستمبر 2026

یونانی میڈیسن پینل

نئی دھلی: آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں 'یونانی میڈیسن پینل' کی میٹنگ منعقد ہوئی، جس کی صدارت پینل کے چیئرپرسن ڈاکٹر محمد خالد صدیقی (مشیر ہمدرد آرکائیو وسابق ڈائرکٹر جنرل سی سی آر یو ایم، نئی دہلی) نے کی۔ جب کہ پینل کے ممبران میں پروفیسر اشہر قدیر (شعبہ کلیات اجمل خان طبیہ کالج، اے ایم یو، علی گڑھ)، ڈاکٹر محمد ذوالکفل (نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، غازی آباد)، پروفیسر آسیہ سلطانہ (صدر شعبہ علاج بالتدبیر اجمل خان طبیہ کالج، اے ایم یو، علی گڑھ)، حکیم وسیم احمد اعظمی (سابق ڈپٹی ڈائرکٹر، ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ)، ڈاکٹر وسیم احمد (شعبہ کلیات نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن بنگلور)، ڈاکٹر امان اللہ (ریسرچ آفیسر سائنٹسٹ IV، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی)، ڈاکٹر اشفاق احمد (حیدر آباد) اور حکیم نازش احتشام اعظمی (میڈیکل آفیسر انچارج، نئی دہلی) شامل رہے۔



میٹنگ میں یونانی میڈیسن پینل سے متعلق ایجنڈے پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے کہا کہ اس پینل میٹنگ کا مقصد باہمی گفتگو کے ذریعے یونانی میڈیسن کے حوالے سے لوگوں میں Awareness کے لیے بہتر اقدامات کرنا ہے، کونسل یونانی میڈیسن کے تعلق سے ہمیشہ سنجیدہ رہی ہے، اس کی کوشش رہی ہے کہ حفظان صحت، امراض نسواں، امراض اطفال اور دیگر نئے امراض پر غور وخوض ہو اور ان پر کتابیں شائع ہوں، یہی وجہ ہے کہ کونسل نے امراض اطفال، کلیات ادویہ، ادویہ مفردہ، جراحیات عمومی، جراحیات نظامی اور کلیات امور طبیعیہ جیسی اہم کتابیں حال ہی میں شائع کی ہیں اور بعض کتابیں ابھی زیر طبع ہیں۔ انھوں نے یونانی میڈیسن سے متعلق کتابوں کی اشاعت میں مزید بہتری کے لیے سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن اور قومی اردو کونسل کے درمیان MoU دستخط کرنے کے تعلق سے بھی بات کی اور کہا کہ اس سے یونانی میڈیسن کے میدان میں ہمارے لیے مزید آسانیاں پیدا ہوں گی۔

میٹنگ کے صدر ڈاکٹر محمد خالد صدیقی نے ترقی اردو بیورو کے تحت یونانی میڈیسن سے متعلق شائع کتابوں کو بھی پیش نظر رکھنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اس سے یونانی میڈیسن کے حوالے سے بیورو اور کونسل کے مشترکہ کاموں کی نوعیت واضح ہو سکے گی، انھوں نے یونانی میڈیسن سے متعلق مسودات پر سنجیدگی سے غور کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

میٹنگ میں پینل کے ممبران کی جانب سے یہ تجاویز بھی رکھی گئیں کہ شوگر، ہائی بلڈ پریشر اور نان کمیونیکیبل ڈیزیز (این، سی، ڈی) جیسے امراض کے حوالے سے یونانی میڈیسن کے میدان میں امکانات تلاش کیے جائیں۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' اور ماہنامہ 'خواتین دنیا' میں طب سے متعلق مضامین ہر مہینے پابندی سے شائع کیے جائیں اور حفظان صحت اور این سی ڈی کے تعلق سے کلاسیکی متن کو بنیاد بنا کر کلاسیکی اپروچ کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ آخر میں کونسل سے حال ہی میں شائع طب کی چھ کتابوں جراحیات نظامی، کلیات ادویہ، ادویہ مفردہ، جراحیات عمومی، امراض اطفال اور کلیات امور طبیعیہ کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔

میٹنگ میں ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک)، ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر) اور ذیشان فاطمہ (ریسرچ اسسٹنٹ) وغیرہ موجود رہیں۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 16 ستمبر 2026

فارسی پینل

نئی دھلی: آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں 'فارسی پینل' کی میٹنگ منعقد ہوئی، جس کی صدارت پینل کے چیئرمین پروفیسر چندر شیکھر (سابق صدر، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی) نے کی۔ میٹنگ کے آغاز میں ڈائرکٹر قومی اردو کونسل ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے پینل کے چیئرمین پروفیسر چندر شیکھر اور تمام اراکین کا استقبال کیا۔ پینل کے اراکین میں پروفیسر محمد اقبال (شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ)، پروفیسر اخلاق احمد آہن (سینٹر آف پرشین اینڈ سینٹرل ایشین اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی)، پروفیسر کلیم اصغر (صدر، شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ



اسلامیہ)، پروفیسر عثمان غنی (ڈائرکٹر، فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، ڈاکٹر مہتاب جہاں (شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر علی اکبر شاہ (شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی) اور ڈاکٹر عمران چودھری (شعبۂ فارسی، ذاکر حسین دہلی کالج) شامل تھے۔

میٹنگ میں 'فارسی پینل' کے ایجنڈے سے متعلق مختلف امور پر تفصیلی تبادلۂ خیال کیا گیا۔ اس موقع پر ڈائرکٹر قومی اردو کونسل ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے کہا کہ فارسی زبان کے علمی و ادبی سرمائے کو پیش نظر رکھے بغیر ہندوستان، بالخصوص شمالی ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ سے مکمل طور پر واقفیت ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کونسل نے حال ہی میں داراشکوہ کی کتاب 'سکینۃ الاولیاء' اور پردیپ شرما خسرو کی کتاب 'امیر خسرو: ایک ہمہ جہت شخصیت' کے اردو تراجم شائع کیے ہیں۔ اس سلسلے میں دیگر اہم کتابیں بھی زیر طبع ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ انڈین نالج سسٹم کے تناظر میں حکومت ہند نے بھی اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے کلاسیکی زبان کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ فارسی زبان کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی اردو کونسل نے اس پر خصوصی توجہ دی ہے۔ کونسل کی کوشش ہے کہ فارسی کی اہم کتابوں کے اردو تراجم شائع کیے جائیں، ساتھ ہی فارسی زبان اور اس کے علمی و ادبی سرمائے کے حوالے سے ایک سنجیدہ علمی مکالمہ بھی قائم ہو، تاکہ اس کے وسیع سرمایے سے بہتر طور پر استفادہ کیا جا سکے۔

میٹنگ کے صدر پروفیسر چندر شیکھر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ فارسی زبان ایک ایسا پل ہے جو مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان مضبوط رشتہ قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستانی تہذیب و ثقافت اور علمی روایت کو سمجھنے کے لیے فارسی کے علمی و ادبی مواد سے استفادہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ انھوں نے 'امیر خسرو/داراشکوہ سالانہ یادگاری خطبہ'، ہندوستان اور وسطی ایشیا کے درمیان مکالمے پر مبنی سمینار اور 'ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ' کی ترتیب کے حوالے سے بھی گفتگو کی۔ انھوں نے ان منصوبوں کی معنویت کے پیش نظر ان کے حوالے سے اہم نکات کی نشاندہی کی اور ان کی عملی صورت گری کے لیے تجاویز پیش کیں۔ میٹنگ میں پینل کے اراکین کی جانب سے یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ 'ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ' کی تدوین ایک اہم ضرورت ہے، جس کے لیے موثر عملی اقدامات کیے جانے چاہئیں۔

اس کے علاوہ قدیم مخطوطات و مسودات، علم عروض و بلاغت اور ترجمے کے موضوعات پر ورکشاپ منعقد کرنے کی تجاویز بھی پیش کی گئیں، تاکہ نئی نسل میں فارسی زبان و ادب کے حوالے سے علمی و فنی معیار کو مزید بہتر بنایا جا سکے۔ فارسی ڈپلومہ مراکز کو مزید موثر بنانے، طلبہ کی پیش رفت کو باقاعدگی سے مدنظر رکھنے اور مراکز کے اساتذہ کے ساتھ پینل کی سطح پر تبادلہ؟ خیال کرنے کی تجویز بھی پیش کی گئی۔ میٹنگ کے اختتام پر قومی اردو کونسل کی جانب سے حال ہی میں شائع ہونیوالی پردیپ شرما خسرو کی کتاب 'امیر خسرو: ایک ہمہ جہت شخصیت' جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر شبیر عالم نے کیا ہے، کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ آخر میں ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک) نے پینل کے چیئرمین، اراکین اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ میٹنگ میں ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر) اور ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی (پروجیکٹ اسسٹنٹ) سمیت قومی اردو کونسل کے دیگر اراقین بھی موجود رہے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 30 ستمبر 2026

کریٹیو رائٹنگ اینڈ چلڈرنس لٹریچر

نئی دھلی: آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں 'کریٹیو رائٹنگ اینڈ چلڈرنس لٹریچر' پینل کی میٹنگ منعقد ہوئی، جس کی صدارت پینل کے چیئرمین، معروف فکشن نگار و اسکالر پروفیسر غضنفر نے کی۔ میٹنگ کے آغاز میں ڈائرکٹر، قومی اردو کونسل، ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے پینل کے چیئرمین پروفیسر غضنفر اور تمام معزز اراکین کا خیر مقدم کیا۔ پینل کے اراکین میں ڈاکٹر امجد حسین حافظ



کرناٹکی (معروف مصنف و شاعر)، محترمہ شائستہ یوسف (معروف فکشن نگار و مترجم)، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا (معروف ادیبہ)، ڈاکٹر سید مشیر عالم (ممبر گورننگ کونسل اور جناب اقبال برکی (بچوں کے ادیب) شامل تھے۔ میٹنگ میں 'کریٹیو رائٹنگ اینڈ چلڈرنس لٹریچر' پینل کے ایجنڈے سے متعلق مختلف امور پر تفصیلی تبادلۂ خیال کیا گیا اور حالیہ کارکردگیوں کا جائزہ لینے کے ساتھ مستقبل کے لائحۂ عمل پر بھی غور کیا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے کہا کہ ادبِ عالیہ کا وسیع تصور ادبِ اطفال کو بنیادی حیثیت دیے بغیر ممکن نہیں۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے میں جہاں بعض نئے تجربات سامنے آتے ہیں، وہیں متعدد چیلنجز کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے، ایسے میں اس پہلو پر سنجیدگی کے ساتھ پیش رفت کی ضرورت ہے۔ قومی اردو کونسل نے اس حوالے سے ترجیحی بنیادوں پر عملی اقدامات کیے ہیں، جن میں ادبِ اطفال کے تعلق سے منعقد کی جانے والی ورکشاپس اور قلیل مدت میں 40 سے زائد باتصویر کہانیوں پر مشتمل کتابوں کی اشاعت اہمیت کی حامل ہے۔ اس سلسلے میں مزید اہم کتابیں بھی زیرِ طبع ہیں۔

میٹنگ کے صدر پروفیسر غضنفر نے ادبِ اطفال کی اہمیت و افادیت کو واضح کرتے ہوئے متعدد تجاویز پیش کیں۔ انھوں نے کہا کہ ادبِ اطفال کے میدان میں اس طور پر بھی اچھی پیش رفت کی جا سکتی ہے کہ بڑے قلمکاروں کی منتخب کہانیوں کو بچوں کی ذہنی سطح اور فہم کے مطابق آسان زبان میں پیش کیا جائے۔ اس سے بچے ابتدائی مرحلے ہی میں ادبِ عالیہ کی تفہیم حاصل کر سکیں گے اور ان میں معیاری ادب سے دلچسپی پیدا ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ لسانی کھیلوں کے لیے مواد فراہم کرنا بھی بچوں کی دلچسپی اور زبان سے ان کی وابستگی کے لیے اہم ثابت ہو سکتا ہے، جس سے بچوں کی دلچسپیاں مزید بڑھیں گی اور وہ ذوق و شوق کے ساتھ اپنی علمی و تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہ سکیں گے۔ میٹنگ میں پینل کے اراکین نے بھی ادبِ اطفال، تخلیقی تحریر اور بچوں کے لیے معیاری ادبی مواد کی تیاری سے متعلق اہم اور مفید مشورے پیش کیے، ساتھ ہی اس ضمن میں کونسل کی شاندار پیش رفت کو سراہا۔ کونسل نے موجودہ ڈائرکٹر کی زیرِ نگرانی بچوں کے ادب کی بہترین کتابیں شائع کی ہیں جو اضافے کا درجہ رکھتی ہیں۔ اراکین نے موجودہ دور کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بچوں کے لیے ایسے ادبی و تخلیقی مواد کی تیاری کی ضرورت پر زور دیا جو ان کی زبان دانی، فکری صلاحیتوں، تخلیقی قوت اور کردار سازی میں معاون ثابت ہو۔

آخر میں ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک) نے پینل کے چیئرمین پروفیسر غضنفر اور تمام معزز اراکین کا شکریہ ادا کیا۔ میٹنگ میں ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر)، محترمہ نہاں رباب (اسسٹنٹ ایڈیٹر)، محترمہ ذیشان فاطمہ (ریسرچ اسسٹنٹ) سمیت قومی اردو کونسل کے دیگر اراکین بھی موجود رہے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 1 اکتوبر 2026

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں 'سوچھتا ہی سیوا' مہم کے تحت دو خاص سرگرمیوں کا اہتمام

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں 'سوچھتا ہی سیوا' (17 ستمبر تا 17 اکتوبر، 2026) مہم کے تحت دو خاص سرگرمیوں کا اہتمام کیا گیا۔ اس سلسلے کی پہلی سرگرمی 1 اکتوبر 2026 کی شام تین بجے 'ایک دن ایک گھنٹہ ایک ساتھ' نعرے کے تحت قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کی موجودگی میں تمام اراکین کے ذریعے صدر دفتر کے احاطے کی صفائی کی صورت میں عمل پذیر ہوئی۔ دوسری سرگرمی آج بتاریخ 12 اکتوبر صبح 10 بجے 'سوچھ بھارت دیوس' کے جشن کی شکل میں عمل میں آئی، جس میں صفائی سے متعلق حکومت ہند کے حلف نامے کو پڑھا گیا اور اس کو عملی طور پر برتنے کا عہد بھی کیا گیا۔ اس موقعے پر ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے صاف ستھرے اور صحت مند ہندوستان سے متعلق عظیم رہنما مہاتما گاندھی کے خیالات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے صفائی مشن کو آگے بڑھانے کے لیے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کرنے کی ترغیب دی۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹرز، افسران اور دیگر اراکین موجود رہے۔



رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 12 اکتوبر 2026

زبان، ادب اور تعلیم سے متعلق خبریں

ماہنامہ اردو دنیا میں 'خبر نامہ' کے تحت علمی، ادبی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ان خبروں سے ہماری ادبی و ثقافتی سرگرمیوں، تنوع اور زبان و ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود بہت سی اہم خبریں ہم تک موصول ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ اس لیے منتظمین سے گزارش ہے کہ وہ اہم علمی، ادبی و ثقافتی تقریبات اور وفیات سے متعلق خبریں درجہ ذیل ای۔میل editor@ncpul.in | urdudunyancpul@yahoo.co.in پر ارسال کرنے کی زحمت کریں۔ (ادارہ)

دھلی

عصر حاضر میں اردو میڈیا کا کردار

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام 'عصر حاضر میں اردو میڈیا کا کردار' کے موضوع پر ایک



توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا جسے اردو زبان و ادب کے ممتاز شاعر، نقاد اور صحافی ڈاکٹر مشتاق صدف نے پیش کیا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر کوثر مظہری نے کی۔ آج یہاں جاری ریلیز کے مطابق ڈاکٹر مشتاق صدف نے توسیعی خطبے میں کہا کہ عصر حاضر میں اردو میڈیا نے پوری دیانتداری کے ساتھ ثقافتی بیانیے کو اجاگر کیا ہے۔ اپنے محدود وسائل کے باوجود اردو میڈیا اردو زبان اور ہندستانی تہذیب کے تحفظ کے لیے کوشاں ہے۔ ڈاکٹر صدف نے یہ بھی کہا کہ عوامی مسائل کے تدارک کے لیے اردو میڈیا کی کارکردگی اطمینان بخش ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی کہ اردو صحافت نے ادھر انٹرنیٹ سوشل میڈیا اور موبائل ایپ کو اپنا کر جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگی کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا کہ سرسید احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد نے اپنی صحافت سے ملک و قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، عصر حاضر کے اردو میڈیا کو بھی اس سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنی صدارتی تقریر میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر کوثر مظہری نے ڈاکٹر مشتاق صدف کے خطبے کو بے حد معلوماتی اور پر مغز قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو میڈیا کو چاہیے کہ وہ اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کے پیش نظر رائے عامہ کی تشکیل کے لیے خوشگوار فضا اور اظہار رائے کی آزادی کو مثبت رنگ عطا کرے۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر جاوید حسن نے مہمان مقرر ڈاکٹر مشتاق صدف کا تعارف پیش کیا اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔ آخر میں ڈاکٹر قرۃ العین نے سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر شعبے کے اساتذہ ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 23 ستمبر 2026

ڈیجیٹل ٹرانسفارمیشن ان ٹیچنگ عربک ٹو نان نیٹیو اسپیکرز

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ عربی کے زیر اہتمام 'ڈیجیٹل ٹرانسفارمیشن ان ٹیچنگ ان عربک ٹو نان نیٹیو



اسپیکرز' کے موضوع پر توسیعی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر فوزان احمد صدر شعبہ عربی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ کا مختصر جائزہ بھی پیش کیا اور یونیورسٹی میں جاری مختلف تعلیمی پروگراموں اور کورسز پر روشنی ڈالی۔ یہ توسیعی خطبہ مالک شہوان نے دیا، جنھوں نے غیر عربی بولنے والوں کو عربی سکھانے میں ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز کے کردار کے حوالے سے اپنی مہارت اور عملی تجربات سے آگاہ کیا۔ انھوں نے ابھرتے ہوئے ڈیجیٹل ٹولز اور عربی زبان کی تدریس کے عمل کو موثر بنانے کے لیے ٹیکنالوجی کے فراہم کردہ مواقع اور امکانات پر گفتگو کی۔ مہمان خطیب نے عصر حاضر کے آموزگاروں کی بدلتی ہوئی ضروریات کی تکمیل کے لیے جدید ٹیکنالوجی کو زبان کی تدریس کے موثر طریقوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ اپنے پریزنٹیشن کے دوران شہوان نے 'یوتھ پروفیشنل عربک' متعارف کرایا، جو عربی زبان نہ بولنے والوں کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ ایک ڈیجیٹل پروگرام ہے۔ انھوں نے وضاحت کی کہ یہ پروگرام زبان کی تعلیم اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کی ایک بڑی ٹیم کے باہمی تعاون سے تیار کیا گیا ہے۔ ان کے مطابق اس پروگرام میں زبان سکھانے کے جدید طریقہ کار اور جدید ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کو شامل کیا گیا ہے۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر عبدالمجید قاضی نے اس اقدام کو سراہا اور کہا کہ خطبہ انتہائی معلوماتی تھا اور اس نے عربی زبان کی تعلیم میں ڈیجیٹل تبدیلی سے وابستہ امکانات اور چیلنجوں کے بارے میں بیش قیمت بصیرت فراہم کی ہے۔ پروگرام کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر نسیم اختر تھے۔ اس توسیعی خطبے میں شعبہ عربی کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 15 ستمبر 2026

ڈاکٹر خالد مبشر کی کتابوں پر مذاکرہ

نئی دھلی: معروف شاعر اور ناقد ڈاکٹر خالد مبشر کی دو تنقیدی کتابوں 'تنقیدی تفاعل وتعامل' اور 'اپنی سی تعبیریں' کے اجرا کے موقعے پر مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ جلسے کی



صدارت کرتے ہوئے ممتاز شاعر پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ خالد مبشر کا ادبی انسلاک صرف نثر اور تنقید ہی نہیں بلکہ شاعری سے بھی نہایت مستحکم ہے۔ ان کا نمایاں پہلو زبان و بیان کی پختگی ہے۔ مہمان خصوصی ممتاز دانشور پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ڈاکٹر خالد مبشر کے اسلوب کی انفرادیت متاثر کن ہے۔ ان کے مطالعے کا دائرہ متنوع بھی ہے اور مختلف بھی۔ ممتاز ادیب پروفیسر خالد محمود نے اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر خالد مبشر پر جامعہ کو فخر ہے۔ ان میں بہت سی صلاحیتیں ہیں۔ ان کے مضامین نہایت دقیق موضوعات و مسائل کو محیط ہیں۔ صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور معروف ادیب پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ بجا طور پر خالد مبشر سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ شعبۂ اردو کی جو مستحکم علمی روایت رہی ہے، وہ اس سلسلے کو بہت آگے بڑھائیں گے۔ شعر و ادب کے سلسلے میں ان کا اپنا ایک مخصوص نظریہ اور رویہ ہے، جو انھیں اپنی نسل میں مختلف بناتا ہے۔ سابق پرووائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ممتاز سائنس داں پروفیسر تسنیم فاطمہ نے کہا کہ خالد مبشر بہت کم لکھتے ہیں، لیکن جو کچھ لکھتے ہیں اس کی بنیادیں ٹھوس ہوتی ہیں۔ انھوں نے پیش لفظ میں اپنے تنقیدی موقف کا جرأت مندانہ اظہار کیا ہے۔ معروف محقق، فکشن نگار اور شاعرہ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا نے کہا کہ خالد مبشر غیر معمولی ذہن و فکر کے نمائندہ ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ادق سے ادق علمی مسئلے کو بھی بوجھل اور گراں نہیں ہونے دیتے۔ معروف ادیب و نقاد سیفی سرونجی نے کہا کہ خالد مبشر کی نثر میں قاری کو کھینچنے اور جکڑنے کی صفت موجود ہے۔ وہ ہر بات پورے استدلال کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس موقع پر استوتی اگروال نے منظوم خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ خالد مبشر میرے بھائی ہیں اور ان کے مخلصانہ مشوروں کا میرے ادبی سفر میں اہم کردار رہا ہے۔ ان کی تحریریں بصیرت افروز ہوتی ہیں۔ ترجمہ نگار اور شاعر ڈاکٹر اے نصیب خاں نے کہا کہ خالد مبشر کا تنقیدی وژن شفاف ہے۔ وہ نظریہ و عمل میں تضاد اور تصادم کے شکار نہیں ہیں۔ البتہ وہ فکری ارتقا سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان کی تنقید کی جڑیں متن میں بہت گہرے طور پر پیوست ہیں اور کہیں کہیں ان کا رجحان ساخت شکنی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عادل حیات، ڈاکٹر فیضان شاہد، ڈاکٹر زاہد ندیم احسن، ڈاکٹر حبیب الرحمٰن اور مصدق مبین نے بھی دونوں کتابوں میں شامل مضامین پر مبسوط تجزیاتی مقالات پیش کیے۔ جلسے میں نئی نسل کے نمائندہ شاعر سفیر صدیقی نے مہمانان کا تعارف کراتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ نظامت کے فرائض آصف بلال نے انجام دیے۔ اختتام نوید یوسف کے اظہارِ تشکر پر ہوا۔ اس موقعے پر سعید جامعی اور سفیان مظفر نے دونوں کتابوں سے منتخب اقتباسات کی بلند خوانی کی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 22 ستمبر 2026

میرا تخلیقی سفر

نئی دھلی: شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ڈاکٹر عبدالحلیم لائبریری میں شعبۂ عربی کی جانب سے ایک



توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا جس کا موضوع تھا 'میرا تخلیقی سفر' اور خطیب تھے شعبۂ تاریخ کی اے ایم خواجہ چیئر کے پروفیسر ڈاکٹر محمد علیم۔ پروگرام کی نظامت پروگرام کے کوآرڈینیٹر اور شعبۂ عربی کے سابق صدر پروفیسر نسیم اختر ندوی نے کی۔ انھوں نے مہمان کا تعارف کرایا اور موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کی صدارت صدر شعبۂ عربی پروفیسر فوزان احمد نے کی۔ اپنے خطاب میں پروفیسر ڈاکٹر محمد علیم نے اپنے تخلیقی سفر کے مختلف مراحل اور اس کے تجربات بیان کرتے ہوئے کہا کہ تخلیق کا سفر عموماً انجانی راہوں پر کسی پیشگی منصوبہ بندی کے بغیر شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے اندر موجود تخلیقی صلاحیت کا انکشاف بھی اچانک ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ ہوا، لیکن یہی تخلیقی عمل ان کی زندگی کی دلچسپیوں کا مرکز ومحور بن گیا۔ انھوں نے اپنے تعلیمی و تدریسی سفر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حالات کی مختلف کروٹوں کے باوجود انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت اور ادبی ذوق کو ہمیشہ اپنی زندگی کا مرکز بنائے رکھا۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد علیم نے اپنی تخلیقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے ڈرامے، ناول، اسکرپٹ اور دیگر ادبی اصناف میں طبع آزمائی کی اور ان کی تخلیقات کو عوام و خواص کی جانب سے خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں، 'آدم خور' 'رابعہ' اور ناول میں 'جو اماں ملی تو کہاں علی' اور 'میرے نالوں کی گمشدہ آواز' اور 'ایک مسافر کی کہانی' کا ذکر کیا، انھوں نے بتایا کہ ان کا ایک ناول 'ردائے حریم' حضرت عائشہ پر جلد ہی منظر عام پر آرہا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 23 ستمبر 2026

عربی شاعر المتنبی کی یاد میں خصوصی لیکچر

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کی جانب سے عربی شاعر ابوطیب المتنبی کی شعری خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک خصوصی لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی نظامت پروفیسر عبید الرحمٰن طیب نے کی۔ پروگرام کا آغاز شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر محمد قطب الدین کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ پروفیسر عبید الرحمٰن طیب نے فاضل خطیب پروفیسر عبدالماجد قاضی کا تعارف پیش کیا اور ان کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر پروفیسر عبدالماجد قاضی نے عربی ادب کے عظیم شاعر المتنبی کی شخصیت، شاعرانہ

عظمت، تخلیقی عبقریت اور فکری جہات پر تفصیلی گفتگو کی۔ پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر عظمت اللہ نے مہمان مقرر، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور تمام طلبہ و طالبات، خاص طور پر جامعہ سے آنے والے ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر اساتذہ کے ساتھ جے این یو اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات کی بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 26 ستمبر 2026

صنفی تناظر میں علم کی تشکیل: ہندستانی نظام علم کی تفہیم

نئی دھلی: سروجنی نائیڈو سینٹر فار ویمنز اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ساہتیہ اکیڈمی کے اشتراک سے 'صنفی تناظر میں علم کی تشکیل: ہندستانی نظام علم کی تفہیم' کے موضوع پر سمپوزیم کا انعقاد کیا۔ سینٹر کی ڈائرکٹر پروفیسر وجے لکشمی برارا کی قیادت اور ڈاکٹر اپرنا دکشت کی نظامت میں منعقدہ اس سمپوزیم میں 140 سے زائد افراد شریک ہوئے جن میں ممتاز مقررین، ماہرین تعلیم، محققین اور طلبہ کے علاوہ یونیورسٹی کے اندر اور باہر سے تعلق رکھنے والے شرکا شامل تھے۔ پروگرام میں ایک افتتاحی اجلاس، دو علمی نشستیں: اور ایک اختتامی اجلاس شامل تھا، جن میں 8 مقررین نے صنف، علم کی تشکیل اور ہندستانی نظام علم کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا۔ افتتاحی اجلاس کا آغاز ساہتیہ اکیڈمی کی پروگرام آفیسر مریگ نیانی گپتا کے رسمی خیر مقدمی خطاب سے ہوا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ جو کچھ ابھی تک دستاویزی شکل میں محفوظ نہیں ہے، اسے دستاویزی شکل دینا بہت ضروری ہے۔ افتتاحی خطاب کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیمی امور کی ڈین اور سینٹر فار دی اسٹڈی آف سوشل انکلوژن کی ڈائرکٹر پروفیسر تنوجا نے 'گیان'، 'پران' اور حکمت کے تصورات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ہندستانی نظامِ علم سے وابستگی کے دوران مرد و زن اور جدید و قدیم جیسے دوئی پر مبنی تصورات سے بالاتر ہو کر غور و فکر کی ضرورت پر زور دیا۔ کلیدی خطاب ممتاز ماہر عمرانیات پروفیسر میتری چودھری نے کیا، جنھوں نے حوالہ جات کے ذریعے علم تک رسائی حاصل کرنے کی اہمیت کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ علم کی تخلیق اور تشکیل کے عمل کو سمجھنا ہندستانی نظام علم سے منسلک کسی بھی مکالمے یا مطالعے کے لیے مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر وجے لکشمی برارا نے 'قومی تعلیمی پالیسی' کے دائرہ کار میں اس طرح کی علمی سرگرمیوں کے انعقاد کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ انھوں نے اس سمپوزیم کو صنفی مطالعات اور علم کی تخلیق کے شعبے میں ایک بروقت اور اہم پیش رفت قرار دیا۔ پہلے ورکنگ سیشن کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ سماجیات کے سینئر پروفیسر اروندرائے انصاری نے کی۔ نارتھ ایسٹرن ہل یونیورسٹی کی پروفیسر ریکھا شانگپلیا نگ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ سماجیات کی پروفیسر گوتمی بودرا ہیمبروم نے بالترتیب 'کھاسی' اور 'بائگا' برادریوں کے ذاتی تجربات پر مقالات پیش کیے۔ اس سیشن میں کیس اسٹڈیز کے ذریعے ہندستانی نظام علم کا جائزہ لیا گیا اور علم، سماجی زندگی، ثقافتی روایات اور روزمرہ کے تجربات کے باہمی تعلق کو اجاگر کیا گیا۔ دوسرے ورکنگ سیشن کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ کی سربراہ پروفیسر پریتی شرما نے کی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 26 ستمبر 2026

حکیم عبدالحمید کے 118 ویں یوم پیدائش کے موقع پر سمینار

نئی دھلی: غالب اکیڈمی میں ادارے کے بانی حکیم عبدالحمید کے 118 ویں یوم پیدائش کے موقع پر سمینار منعقد ہوا، جس میں ماہرین طب یونانی، ادیبوں اور اہم شخصیات نے ان کی علمی، طبی، تعلیمی اور سماجی خدمات کو یاد کیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ حکیم عبدالحمید نے 1935 میں مزار غالب کے قریب زمین حاصل کر کے غالب اکیڈمی کی بنیاد رکھی تھی، اس اعتبار سے ان کے قائم کردہ اداروں میں اسے اولیت حاصل ہے۔ سمینار کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ حکیم عبدالحمید نے غالب اکیڈمی قائم کر کے اردو زبان و ادب کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی۔ غالب اکیڈمی کا افتتاح غالب پرست ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ حکیم عبدالحمید اعزازات کے خواہشمند نہیں تھے، اصل معنی میں وہ بھارت رتن تھے اور انسانیت کے رہنما تھے، جب کہ تصوف ان کے عمل میں نمایاں تھا۔ ڈاکٹر امان اللہ نے کہا کہ حکیم عبدالحمید نے صبر، شکر اور قناعت اختیار کر کے اپنے والد کے قائم کردہ ہمدرد کو بلندیوں تک پہنچایا۔ پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ حکیم عبدالحمید نے پرانی دہلی میں رابعہ گرلز پبلک اسکول اور سنگم وہار میں انگلش میڈیم اسکول قائم کیا، جب کہ غالب اکیڈمی کے قیام سے اردو زبان و ادب کی غیر معمولی خدمت انجام دی۔ ہمدرد صحت کا اجرا کر کے انھوں نے طبی صحافت کے شعبے میں بھی اہم کام کیا۔ ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ حکیم عبدالحمید کو تعلیم سے گہرا شغف تھا۔ انھوں نے برہان پور میں ہسپتال قائم کیا اور مستحق افراد کی مدد بھی کرتے رہے۔ حکیم نازش احتشام اعظمی نے 'حکیم عبدالحمید: حکمت، خدمات اور انسانیت کے منارۂ نور'، ڈاکٹر رخشندہ روحی نے 'لسانی یکجہتی کا علمبردار: حکیم عبدالحمید' اور ڈاکٹر ثمر جہاں نے حکیم عبد الحمید کی شخصیت اور خدمات پر مقالے پیش کیے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ اورنگ زیب کے زمانے تک طب کی کتابیں فارسی میں تھیں۔ حکیم عبدالحمید نے ان کے تراجم کرائے اور اسلامک اسٹڈیز کے نام سے ادارہ قائم کیا، جہاں عربی کتابوں کے تراجم کا کام ہوا۔ اس ادارے کے سربراہ سید اوصاف علی تھے۔ آخر میں ڈاکٹر عقیل احمد نے اظہار تشکر ادا کیا۔



روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 16 ستمبر 2026

غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام امیر خسرو کی پہیلیوں پر مبنی مقابلے کا اہتمام

نئی دھلی: غالب اکیڈمی کی جانب سے وزارت ثقافت، حکومت ہند کے تعاون سے گورنمنٹ بوائز سینئر سیکنڈری اسکول، پنڈارا روڈ میں حضرت امیر خسرو کی پہیلیوں پر مقابلہ منعقد کیا گیا، جس میں جماعت چھٹی، ساتویں اور آٹھویں کے 99 طلبہ نے حصہ لیا۔ مقابلے میں سنتوش سمپرتی نے حضرت امیر خسرو کی 40 پہیلیاں طلبہ کے سامنے پیش کیں اور طلبہ نے ان کے جوابات دیے۔ سب سے زیادہ درست جوابات دینے والے طلبہ کو اول، دوم اور سوم انعامات کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس موقع پر اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر رمیش چند نے کہا کہ امیر خسرو کو ہندی کا پہلا شاعر مانا جاتا ہے۔ انھوں نے ہندی میں دوہے، گیت، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں بھی کہیں۔ ہندی کے استاد جے شنکر دوبے نے اسکول کے طلبہ اور اساتذہ کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ اسکول کے طلبہ نے امیر خسرو کی پہیلیوں کے ساتھ ان کی سوانح بھی پڑھ کر سمجھی ہے، جس سے بچوں میں امیر خسرو کے کلام کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا ہے۔ نتائج کا اعلان کرتے ہوئے ڈاکٹر رمیش چند نے بتایا کہ آیوش کمار گپتا نے اول، سبھاش اور راج ویر سنگھ سسودیا نے مشترکہ طور پر دوم، جب کہ عفان اور دیوانشو نے مشترکہ طور پر سوم مقام حاصل کیا اور غالب اکیڈمی کی جانب سے بالترتیب 1500 روپے، 1200 روپے اور 1000 روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا گیا۔ آخر میں ڈاکٹر عقیل احمد نے طلبہ، اساتذہ اور اسکول کے عملے کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 3 ستمبر 2

ہندی میری جان-2

نئی دھلی: فن، ثقافت اور زبان و ادب کے تحفظ و فروغ کے لیے سرگرم تنظیم 'امیر فاؤنڈیشن' کی جانب سے ہندی پکھواڑے کے موقع پر قومی زبان ہندی کا جشن 'ہندی میری جان-2' منعقد کیا گیا۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں منعقد ہونے والی اس یادگار تقریب کا اہم ترین حصہ آل انڈیا مشاعرہ و کوی سمیلن تھا، جس میں ملک بھر سے تشریف لانے والے ڈھائی درجن سے زائد نامور شعرا اور شاعرات نے اپنے کلام سے سماں باندھ دیا۔ تقریب کے دوران زبان، ثقافت، ادب اور صحافت کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی بعض اہم شخصیات کو 'امیز ایوارڈ 2026' سے سرفراز کیا گیا۔ ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں قطر میں مقیم معروف شاعر، قلمکار اور کاروان اردو قطر کے بانی صدر عتیق انظر اور 'بھارت ایکسپریس' کے چیف مینجنگ ڈائرکٹر اور چیف ایڈیٹر اپیندر رائے، انجمن محبانِ اردو، تلنگانہ کے بانی صدر سید مسکین احمد (حیدر آباد) اور 'ادب کی محفل ثقافتی سمیتی' (اندور) کے بانی ہیمنت گٹانی اور اشرف غوری کے نام شامل ہیں۔ فن اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ میں مسلسل خصوصی تعاون کے اعتراف میں ممبئی کے معروف تاجر ایم اے حسین کو 'آرٹ پروموشن ایوارڈ' پیش کیا گیا۔ تقریب کے ایک خصوصی اجلاس میں معروف شاعرہ ڈاکٹر اروشی اگروال اروی کے پانچویں غزلیہ مجموعے 'صرف تمھاری' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ معروف شاعر ڈاکٹر بدھی ناتھ مشرا، مشہور گیت کاریش مالویہ، معروف شاعر پون کمار اور آلوک اورل سمیت اسٹیج پر موجود معزز مہمانان اور اہل قلم نے کتاب کی رونمائی کی اور ڈاکٹر اُروی کے شعری سفر اور ان کی حساس شعری طبیعت کی ستائش کی۔ اس باوقار تقریب کی صدارت معروف کوی ڈاکٹر بدھی ناتھ مشرا اور مشہور گیت کاریش مالویہ نے کی۔ اتر پردیش حکومت کے سابق وزیر اور راشٹریہ لوک دل کے پارلیمانی بورڈ کے رکن اشوک یادو اور وزارت دیہی ترقی، حکومت ہند میں تعینات سینئر آئی اے ایس افسر اور معروف شاعر پون کمار مہمانِ خصوصی تھے۔ ادیب اور شاعر آلوک اورل نے معزز مہمان کی حیثیت سے اسٹیج کی رونق بڑھائی۔ ان کے علاوہ بھارتیہ صوفی فاؤنڈیشن کے قومی صدر، معروف ادبی ادارے غزل اکیڈمی کے سکریٹری اور گلوبل نیوز کے مدیر کشش وارثی اور مہان وادی پارٹی کے قومی صدر ہریش لودھی راجپوت مہمانِ اعزازی کے طور پر تقریب میں موجود تھے۔ ان کے علاوہ بڑی تعداد میں ادب و ثقافت سے وابستہ معزز شخصیات نے تقریب کی رونق میں اضافہ کیا۔ پروگرام کے آرگنائزر راگھویندر دویدی اور کنوینر شاہد انجم نے اپنے استقبالیہ کلمات میں 'ہندی میری جان' کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ امیز فاؤنڈیشن کا مقصد زبانوں کے درمیان موجود فاصلے کو کم کر کے گنگا جمنی تہذیب کو مضبوط بنانا ہے۔ کو آرگنائزر رندھی ترپاٹھی نے مہمانوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ سینئر صحافی اور شاعرہ دامنی یادو نے مہمانوں کا تفصیلی تعارف پیش کیا اور اعزاز حاصل کرنے والی شخصیات کے توصیفی اسناد بھی پڑھ کر سنائے۔ پروگرام کی نظامت معین شاداب نے کی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 29 ستمبر 2026

مخطوطات کے ڈیجیٹائزیشن اور میٹا ڈاٹا پر خصوصی پروگرام

نئی دھلی: قدیم و نادر مخطوطات کے تحفظ، ڈیجیٹائزیشن اور ان کے معیاری ڈاٹا کی تیاری کے سلسلے میں جامعہ ہمدرد، نئی دہلی میں وزارت ثقافت، حکومت ہند کی جانب سے قائم کیے گئے کلسٹر سینٹر میں ایک خصوصی تربیتی پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں مخطوطات کے ڈیجیٹائزیشن کے جدید طریقۂ کار، میٹا ڈاٹا کی تیاری اور ڈیجیٹل ریکارڈ کو منظم انداز میں محفوظ کرنے کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی تربیت دی گئی۔ واضح رہے کہ جامعہ ہمدرد میں قائم کیے گئے مذکورہ کلسٹر سینٹر کے تحت پوری دہلی کے مخطوطات خواہ وہ کسی بھی زبان کے ہوں سب کو ڈیجیٹائز اور محفوظ کرنے کا ہدف رکھا گیا ہے، جس سے کہ وزارت ثقافت کی جانب سے تشکیل نیشنل ڈیجیٹل رپوزیٹری (این ڈی آر) میں پورے بھارت کے ساتھ ساتھ دہلی کے بھی مخطوطات کو طلبہ، اسکالروں اور محققین کے لیے ڈیجیٹائز کر کے اس میں محفوظ کیا جا سکے اس کے لیے جامعہ ہمدرد مذکورہ کلسٹر سینٹر کی جانب سے دہلی کے تمام چھوٹے بڑے اداروں بشمول جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، ایوان غالب، اردو اکادمی، لال بہادر شاستری نیشنل سنسکرت یونیورسٹی، انجمن ترقی اردو ہند اور طبیہ کالج قرول باغ وغیرہ میں اسکالر اور ڈیجیٹائزیشن کے ماہرین وہاں کے مخطوطات کا ڈیجیٹائزیشن اور تحفظ کریں گے۔ اس تربیتی پروگرام میں جامعہ ہمدرد کے لائبریرین و کلسٹر سینٹر کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر اختر پرویز نے کہا کہ جامعہ ہمدرد جیسے اہم علمی ادارے کی اس قومی کوشش میں شمولیت سے مخطوطات کے تحفظ اور ان کے تحقیقی استعمال مزید روشن اور آسان ہو جائیں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ دہلی میں مختلف کتب خانوں، علمی اداروں، مذہبی و ثقافتی مراکز، ذاتی

کتب خانوں اور ذاتی مجموعوں میں بڑی تعداد میں مخطوطات موجود ہیں جو صدیوں پرانے علمی، ادبی، طبی، تاریخی، سائنسی اور ثقافتی ورثے کی نمائندگی کرتے ہیں، جنھیں ڈیجیٹل شکل میں محفوظ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس موقعے پر گیان بھارتم کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر عبدالرازق الحافظ نے مخطوطات کے ڈیجیٹائزیشن، تحفظ اور میٹا ڈاٹا کی تیاری کے مختلف مراحل پر تفصیلی گفتگو کی۔ تربیتی پروگرام کے اختتام کے موقعے پر ڈاکٹر امیر عباس، ڈاکٹر قمر الحسن، ارشاد احمد، شب رخسار، اروشی اور شاہین وغیرہ نے اس بات پر اتفاق کیا کہ مخطوطات کے ڈیجیٹائزیشن اور درست میٹا ڈاٹا کی تیاری پر مسلسل توجہ ضروری ہے۔ اس تربیتی پروگرام کو ہندوستان کے قیمتی علمی و ثقافتی ورثے کے تحفظ کی سمت میں ایک مفید اور اہم قدم قرار دیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 3 اکتوبر 2026

نثری نشست

نئی دھلی: غالب اکیڈمی نئی دہلی میں ماہانہ ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت سیما کوشک نے کی۔ انھوں نے کہا کہ مجھے غالب اکیڈمی کی نثری اور شعری نشستوں میں شامل ہونے کا موقع ملا ہے۔ شاعری کے میرے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں جلد ہی کہانیوں کا مجموعہ چھپنے والا ہے۔ انھوں نے 'آرو' کے نام سے ایک کہانی پیش کی جو غیر ملکی سفر میں مصروف رہتا تھا۔ وہ کما تا تو گھر کے لیے تھا گھر میں اسے صرف اسکرین پر دیکھا جاتا تھا۔ گھر میں جو کچھ ہوتا تھا اس کی اجازت وہ دے دیتا تھا لیکن آرو کو باپ کی موجودگی چاہیے تھی۔ ڈاکٹر شہلا احمد نے 'تقسیم ہند کے اثرات اردو ادب پر' مضمون پیش کیا۔ چشمہ فاروقی نے مخصوص انداز میں 'چشمہ ذات' کے عنوان سے افسانہ پیش کیا۔ ثروت عثمانی نے 'تلفظ' کے عنوان سے اپنے مقالے میں سمیناروں میں پڑھے جانے والے مقالوں میں تلفظ کا ذکر کیا۔ سینہ سرتاج نے 'ہم نے بھی جئے وہ پل' کے عنوان سے ایک کہانی پیش کی۔ یوگیندر سنگھ نے 'انمول دعائیں' کے عنوان سے ایک کہانی پیش کی۔ پروین ویاس نے اپنے اردگرد کے ماحول پر مبنی ایک کہانی پیش کی۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے 'خواجہ نظام الدین اولیا' کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ انھوں نے اپنے مضمون میں بتایا کہ حضرت نظام الدین اولیا نے حضرت امیر خسرو کو دیسی زبان استعمال کرنے کے لیے تلقین کی تھی۔ بعد میں یہ دیکھا بھی گیا کہ حضرت امیر خسرو نے نہ صرف دیسی زبان کو اپنایا بلکہ دیسی تہذیب کو بھی اپنی شاعری میں بیان کر دیا۔ اس موقعے پر مقصود خاں علیگ نے ایک کہانی 'اتحاد کی برکت' کے عنوان سے پیش کی۔ اس موقعے پر ان کی کتاب 'گلشن قطعات' کا رسم اجرا بھی ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 26 ستمبر 2026

اتر پردیش

انجینئر ڈے کے موقعے پر خصوصی پروگرام

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے شعبۂ سول انجینئرنگ کی جانب سے نرمان کلب کے زیر اہتمام انجینئر ڈے کے موقعے پر وائس چانسلر پروفیسر اجے کمار تیجا کی صدارت میں ایک خصوصی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام میں طلبہ نے مختلف تکنیکی ماڈلز اور سرگرمیوں کے ذریعے اپنی تکنیکی مہارت اور تخلیقی صلاحیتوں کا عملی مظاہرہ کیا۔ پروگرام کا افتتاح مہمان خصوصی انجینئر اروند کمار جے، سابق انجینئر اِن چیف و سربراہ محکمہ، یو پی پی ڈبلیو ڈی اور وائس چانسلر پروفیسر اجے کمار تیجا نے کیا۔ تکنیک اور انسانی زندگی کے باہمی تعلق پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ موجودہ دور میں ٹیکنالوجی انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہے۔ انجینئرز نہ صرف نئی ٹیکنالوجی کی تشکیل اور ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں بلکہ انسانی زندگی کو زیادہ آسان، محفوظ اور پائیدار بنانے میں بھی ان کی ذمے داری نہایت اہم ہے۔ ایک اچھا انجینئر صرف تکنیکی معلومات کا حامل نہیں ہوتا بلکہ وہ سماج کی ضروریات اور مسائل کو سمجھتے ہوئے ان کے عملی اور موثر حل تلاش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ انھوں نے طلبہ پر زور دیا کہ وہ تکنیکی مہارت کے ساتھ تحقیق، جدت طرازی، تخلیقی فکر اور سماجی ذمہ داری کو بھی اپنی شخصیت کا حصہ بنائیں، کیونکہ مستقبل کے چیلنجز کا سامنا جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ انسانی اقدار اور ذمہ دارانہ رویے کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔ مہمان خصوصی انجینئر اروند کمار جے نے بھارت رتن سر ایم۔ وشویشوریا کی خدمات کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ انجینئرز کے لیے ان کی زندگی نظم و ضبط، محنت، دوراندیشی اور قومی تعمیر کے جذبے کی روشن مثال ہے۔ انھوں نے طلبہ کو مسلسل سیکھنے، نئی ٹیکنالوجی سے واقف ہونے اور معاشرے کے مسائل کے عملی حل تلاش کرنے پر آمادہ کیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 16 ستمبر 2026

اے ایم یو میں ہندی پکھواڑے کا آغاز، ہندی کو علم و سائنس کی زبان بنانے پر زور

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہندی ڈے کے موقعے پر راج بھاشا (ہندی) نفاذ کمیٹی اور شعبۂ ہندی کے مشترکہ تعاون سے ہندی پکھواڑے کا آغاز کیا گیا۔ تقریب کی صدارت یونیورسٹی کی وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے کی۔ وائس چانسلر نے کہا کہ ہندی ہندوستان کی اہم رابطے کی زبان ہے اور ہندی ڈے محض رسمی تقریب نہیں بلکہ اپنی ثقافت اور روایات سے جڑنے کا موقع ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندی اب علم، سائنس اور اختراع کی زبان کے طور پر بھی مسلسل ترقی کر رہی ہے اور اے ایم یو اس کے فروغ کے لیے پرعزم ہے۔ مہمان خصوصی معروف ماہر لسانیات پروفیسر وی، آر، جگن ناتھن نے کہا کہ ہندی ہندستانی شناخت کی نمائندہ زبان ہے۔ اسے صرف سرکاری خط و کتابت تک محدود رکھنے کے بجائے علم و سائنس، اعلیٰ ٹیکنالوجی اور حکومتی امور میں بھی زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جانا چاہیے۔ آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر رضوان خان نے ڈیجیٹل ذرائع اور جدید ٹیکنالوجی میں ہندی کے استعمال کو بڑھانے پر زور دیا۔ شعبۂ ہندی کے سربراہ پروفیسر میراج احمد نے بتایا کہ اس سال ہندی ہفتہ کے بجائے 14 سے 26 ستمبر تک ہندی پکھواڑہ منایا جا رہا ہے۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر شمبو ناتھ تیواری نے کی، جب کہ ہندی افسر اسد اللہ خان نے پروگرام کا خاکہ پیش کیا۔ اس موقع پر اساتذہ، ملازمین، طلبہ اور شہر کے دانشور بڑی تعداد میں موجود رہے۔

روزنامہ 'تاثیر'، دہلی، 15 ستمبر 2026

AI اور روزگار

میرٹھ: AI محبت میں بھی کامیاب ہے۔ علم سے محبت، ملک سے محبت، فن سے محبت وغیرہ میں AI کام کر رہا ہے۔ ادب میں بہت سے اخبارات اور پیپرس آن لائن آ رہے ہیں۔ AI کے ذریعے بہت سی فلموں میں جو کام ہو رہا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ اس ٹیکنالوجی کو اپ گریڈ

کرنا ضروری ہے۔ یہ الفاظ تھے سابق صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر صغیر افراہیم کے جو شعبہ اردو اور ایوسا کے زیر اہتمام منعقد 'AI اور روزگار' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جب ہم نئی چیزیں حاصل کریں گے تو ہمیں حوصلہ ملے گا۔ نئی جنریشن، نئی نسل اور نئے طالب علموں کے لیے A-I بہت ضروری ہے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد وافسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمانان کے بطور عارف عمیر ایم ڈی آف AI متر، میرٹھ شہر او ششٹھ بانی و چیئر پرسن آئی ٹی ہٹ، میرٹھ اور محمد اورنگ زیب سی ای او آف AI متر، میرٹھ نے شرکت فرمائی۔ مقرر کے بطور لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود رہیں۔ استقبالیہ کلمات محمد ندیم، نظامت اور شکریے کی رسم ڈاکٹر اکاوششٹھ نے ادا کی۔ پروگرام کا تعارف پیش کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ آج کا موضوع بڑا منفرد ہے۔ یونیورسٹی اور کالجز کے طلبا کے لیے AI اب ضروری قرار دیا جا رہا ہے۔ اے آئی سے ہم اپنے بہت سے کاموں کو آسان بنا سکتے ہیں۔ محمد اورنگ زیب نے کہا کہ آج کے دور میں AI بہت ضروری ہے۔ AI ایک ایسی چیز ہے جو سبھی کاموں کو آسانی سے کر سکتا ہے۔ ٹیکنالوجی ہماری خوبیوں میں اضافہ کرتی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 15 ستمبر 2026

زبان اور لسانیات: عصری نظریات اطلاقات اور بین العلومی نقطۂ نظر

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے پروفیسر ایم جے وارثی نے اوڈیشہ کی بہرام پور یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کی جانب سے منعقد کیے گئے دو ہفتے کے آن لائن ریفریشر کورس میں بطور مہمان خصوصی افتتاحی لیکچر دیا۔ اس کورس کا موضوع 'زبان اور لسانیات: عصری نظریات، اطلاقات اور بین العلومی نقطۂ نظر' تھا۔ پروفیسر وارثی نے



اپنے لیکچر میں 'اعلیٰ تعلیم میں کثیر لسانیت اور کثیر الشعبہ جاتی نقطۂ نظر: ایک پائیدار ہندوستان کی جانب' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے پائیدار ترقی اور تیزی سے بدلتے ہوئے ڈیجیٹل دور میں لسانی تنوع کی بڑھتی ہوئی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اگر ترقی کے نتیجے میں لوگوں کا تعلیم سے محروم ہونا، سماجی عدم مساوات میں اضافہ، ثقافتی نظر اندازی یا ان لسانی وسائل کا بتدریج خاتمہ شروع ہو جائے جن کے ذریعے مختلف برادریاں اپنے علم اور تجربات کو محفوظ رکھتی ہیں اور انھیں اگلی نسل تک منتقل کرتی ہیں، تو ایسے معاشرے کو حقیقی معنوں میں پائیدار نہیں کہا جا سکتا۔ پروفیسر وارثی نے کہا کہ سال 2030 کے ترقیاتی ایجنڈے میں شامل 'کسی کو پیچھے نہ چھوڑنے' کے عزم کو ہندستانی تناظر میں اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ملک کی لسانی تنوع کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ ان کے مطابق ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں مختلف زبانوں کا تحفظ اور ان کے استعمال کے مواقع کو برقرار رکھنا سماجی اور تعلیمی ترقی کا اہم حصہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جس تیزی سے تعلیم، صحت کی خدمات، مالیاتی سہولتیں اور دیگر ضروری خدمات آن لائن منتقل ہو رہی ہیں، اس کے ساتھ محدود ڈیجیٹل وسائل رکھنے والی زبانوں کے لیے نئے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی زبان کے لیے مناسب ڈیجیٹل مواد، ٹیکنالوجی، سافٹ ویئر یا آن لائن سہولتیں دستیاب نہ ہوں تو اس زبان کو بولنے والے افراد جدید خدمات تک رسائی میں مشکلات کا سامنا کر سکتے ہیں۔ پروفیسر وارثی نے اس بات پر زور دیا کہ ڈیجیٹل ترقی کے عمل میں تمام زبانوں اور لسانی برادریوں کو شامل کرنا ضروری ہے۔ ان کے مطابق ٹیکنالوجی اور تعلیم کی ترقی کا فائدہ اس وقت ہی وسیع پیمانے پر پہنچ سکتا ہے جب لسانی تنوع کو بھی ترقی کے عمل کا لازمی حصہ سمجھا جائے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم میں کثیر لسانیت اور مختلف علمی شعبوں کے درمیان تعاون کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ ان کے مطابق زبان صرف اظہار خیال کا ذریعہ نہیں بلکہ کسی بھی معاشرے کی ثقافت، تاریخ، اجتماعی یادداشت اور علم کو محفوظ رکھنے کا اہم وسیلہ بھی ہے۔

روزنامہ 'تاثیر'، دہلی، 22 ستمبر 2026

10 روزہ عربی اور خطاطی ورکشاپ

لکھنؤ: کرامت حسین مسلم گرلز پی جی کالج لکھنؤ میں کالج کے مینجر سید نوید احمد کی سرپرستی اور پرنسپل پروفیسر ہما خواجہ کی رہ نمائی میں طالبات کے لیے '10 روزہ عربی اردو خطاطی ورکشاپ' کا آغاز ہوا۔ یہ ورکشاپ کالج کے شعبۂ عربی کے زیر اہتمام ہوا۔ افتتاحی جلسے میں مہمان خصوصی مسز صبورہ صدیقی لکچرر شعبۂ علوم مشرقیہ لکھنؤ یونیورسٹی نے کہا کہ اس طرح کے کورس طالبات کے لیے بہت مفید ہوتے ہیں اور ان کی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ مسلمانوں نے جس طرح دیگر نفع بخش علوم وفنون کو ترقی دی اور ان میں مہارت حاصل کی اسی طرح انھوں نے خطاطی جیسے اہم فن کو بھی عروج بخشا۔ انھوں نے کہا کہ خطاطی اور خوش نویسی سیکھنے سے ہماری طالبات کو بہت فائدہ ہوگا۔ آج جدید ٹیکنالوجی قدیم فنون پر حاوی ہو رہی ہے۔ لیکن جو خوبی اور خوبصورتی ہمارے روایتی طور طریقے میں ہے اس سے جدید ٹیکنالوجی عاری ہے۔ پرانے کاتبوں کے تحریر کردہ طغرے، کتبے اور تختیاں آج بھی دلکشی اور خوبصورتی میں بے مثال ہیں۔ وہ صرف خطاطی کے نمونے ہی نہیں بلکہ ان کو دیکھنے سے اپنائیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے طالبات پر زور دیا کہ وہ اس ناپید ہوتے ہوئے فن کو دل لگا کر سیکھیں۔ انھوں نے ڈاکٹر عائشہ قدسی قدوائی صدر شعبۂ عربی کی ستائش کی کہ انھوں نے کالج میں اتنا اہم ورکشاپ کیا۔ اس سے یقیناً ہماری طالبات کو فائدہ ہوگا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر عائشہ قدسی قدوائی نے ورکشاپ کا تعارف کراتے ہوئے اس کے انعقاد کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی۔ نظامت ڈاکٹر زینب اخلاق اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عرب کلچر نے کی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 23 ستمبر 2026

اعلیٰ اخلاقی اقدار اور ہم

لکھنؤ: اعلیٰ اخلاقی اقدار انسان کی شخصیت کو سنوارنے اور معاشرے میں امن، احترام، رواداری اور باہمی اعتماد کو فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ طلبہ کے لیے اعلیٰ اخلاقی اقدار محض ایک نظری تصور نہیں بلکہ کامیاب تعلیمی اور عملی زندگی کی اہم بنیاد ہیں۔ یہ باتیں شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر پروفیسر عباس رضا نیر نے شعبۂ اردو میں منعقدہ 'اعلیٰ اخلاقی اقدار اور ہم' کے موضوع پر مذاکرے کے دوران کہیں۔ اس مذاکرے کی صدارت پروفیسر عباس رضا نیر نے کی، جب کہ

ڈاکٹر جان نثار عالم مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود رہے۔ مذاکرے کی نظامت شعبۂ اردو کے اسکالر سید غلام عباس بلوری نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر نیر نے کہا کہ تعلیمی اداروں کی ذمہ داری صرف طلبہ کو علمی اور فنی تعلیم فراہم کرنا نہیں بلکہ ان کی شخصیت میں اخلاقی شعور، ذمہ داری، برداشت اور انسان دوستی کے جذبات پیدا کرنا بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اعلیٰ اخلاقی اقدار ہی ایک باشعور اور ذمہ دار معاشرے کی تشکیل کی بنیاد بنتی ہیں۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر جان نثار عالم نے کہا کہ اخلاقی اقدار انسان کی شخصیت کا وہ سرمایہ ہیں جو اسے علم کے ساتھ کردار کی بلندی بھی عطا کرتے ہیں۔ انھوں نے طلبہ پر زور دیا کہ وہ اپنی عملی زندگی میں سچائی، دیانت، احترام انسانیت اور رواداری کو اختیار کریں۔ اس موقع پر شعبۂ اردو کے اعزازی اساتذہ ڈاکٹر محمد ریحان، ڈاکٹر کفایت حسین کیفی اور ڈاکٹر محمد شہزاد کے علاوہ فارسی شعبے کے ڈاکٹر عارف نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ مذاکرہ شعبۂ اردو کے درجہ ایم اے کے طلبہ کے لیے خصوصی طور پر منعقد کیا گیا تھا، جس میں طلبہ کے ساتھ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرز نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 ستمبر 2026

ترجمہ کی اہمیت اور چیلنجز

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے شعبۂ عربی، اردو اور فارسی کے باہمی تعاون سے 'ترجمہ



کی اہمیت اور چیلنجز' کے عنوان سے ایک روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر مسعود عالم فلاحی نے تمام مہمانوں، مقررین، اساتذہ اور شرکائے سمینار کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی شرکت پر اظہار تشکر کیا۔ انھوں نے موضوع کی معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ موجودہ عالمی منظر نامے میں ترجمے کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ علم و تحقیق، ادب، سائنس، ٹیکنالوجی اور ثقافت کے وسیع تر تبادلے کے لیے زبانوں کے درمیان موثر ترسیل ناگزیر ہو چکی ہے۔ پروفیسر مسعود عالم فلاحی نے کہا کہ آج کا یہ سمینار اسی بدلتے ہوئے منظر نامے کو سمجھنے، ترجمے کے نئے امکانات کا جائزہ لینے اور مصنوعی ذہانت کے باعث پیدا ہونے والے چیلنجز پر سنجیدہ علمی گفتگو کا ایک اہم پلیٹ فارم ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ سمینار میں ہونے والی علمی بحث سے ترجمے کے موجودہ مسائل کو سمجھنے اور مستقبل کے لیے نئی جہتیں متعین کرنے میں مدد ملے گی۔ اس سمینار کے مہمان خصوصی پروفیسر ابوسفیان نے اپنے خطبے میں اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں مصنوعی ذہانت نے ترجمے کے میدان میں ایک نئے عہد کا آغاز کیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے ترجمے کے عمل کو تیز، وسیع اور کسی حد تک آسان ضرور بنایا ہے لیکن اس کے ساتھ مترجم کے سامنے کئی نئے سوالات اور چیلنجز بھی پیدا ہوئے ہیں۔ اس صورت حال میں مترجم کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے کہ وہ ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی لسانی، ادبی اور تخلیقی بصیرت کو بھی بروئے کار لائے۔ اس قومی سمینار کے دوسرے اہم مقرر انجینئر محمد انس خان نے مصنوعی ذہانت کے فوائد اور اس کے ممکنہ نقصانات پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے اس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ جدید ٹیکنالوجی نے ترجمہ کے عمل کو تیز اور آسان ضرور بنا دیا ہے، تاہم معیاری اور بامعنی ترجمہ کے لیے انسانی فہم، لسانی بصیرت اور سیاق و سباق کی صحیح تفہیم اب بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 ستمبر 2026

بچوں کا مذاکرہ

لکھنؤ: مولانا آزاد میموریل اکیڈمی کی جانب سے ہندی پندرہ روزہ کے تحت 14 سے 29 ستمبر تک منعقد ہونے والے مختلف پروگراموں کی کڑی میں بچوں کے لیے ایک خصوصی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر اکیڈمی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبدالقدوس ہاشمی نے کہا کہ ہندی صرف رابطے کی زبان نہیں بلکہ علم، ثقافت اور قومی یکجہتی کا بھی اہم ذریعہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی لسانی اور ثقافتی گونا گوں کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک مختلف زبانیں ایک دوسرے کی حریف نہیں بلکہ ہندستانی تہذیب و ثقافت کو مالا مال کرنے والی معاون زبانیں ہیں۔ ہندی کو مضبوط بنانے کا مطلب دوسری ہندستانی زبانوں کو کمزور کرنا نہیں بلکہ تمام زبانوں کے درمیان باہمی احترام اور رابطے کو فروغ دینا ہے۔ ڈاکٹر ہاشمی نے قومی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ابتدائی تعلیم میں بچوں کی مادری زبان یا مقامی زبان کے ذریعے تعلیم دینے پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم بچوں کی سمجھ، اظہار اور سیکھنے کے عمل کو زیادہ آسان اور موثر بناتی ہے۔ انھوں نے بچوں سے اپیل کی کہ وہ ہندی کو محض امتحان کا مضمون نہ سمجھیں بلکہ اسے مطالعہ، غور و فکر، تحریر، سوال کرنے اور نئے علم کی تخلیق کی زبان بنائیں۔ اس کے ساتھ اپنی مادری زبان اور ملک کی تمام ہندوستانی زبانوں کے احترام کا جذبہ بھی پیدا کریں۔ انھوں نے کہا کہ ہندی پندر ہواڑہ صرف ہندی کے تئیں جشن منانے کا موقع نہیں بلکہ زبان کے ذریعے علم، تخلیقی صلاحیت اور قومی یکجہتی کو مضبوط بنانے کے عزم کا بھی موقع ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 ستمبر 2026

منظر کاظمی کے افسانے

میرٹھ: منظر کاظمی بڑے افسانہ نگار تھے۔ ترقی پسندی کے دور میں پروان چڑھنے والا شخص مذہبی اسلوب کے ساتھ ہمیں اچھے افسانے دے گیا۔ ان کے افسانے بالکل یونک ہوتے تھے۔ ان کے افسانوں کی تمثیل ابھرتی چلی جاتی ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے اشاروں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ الفاظ تھے سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر صغیر افراہیم کے جو شعبۂ اردو اور ایوسا کے زیر اہتمام منعقد 'منظر کاظمی کے افسانے' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور پروفیسر زین رامش صدر شعبۂ اردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس ونووا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ نے آن لائن شرکت کی۔ مقررین کے بطور ڈاکٹر اختر آزاد اسسٹنٹ پروفیسر ٹی این بی کالج، بھاگل پور اور ڈاکٹر پرویز شہریار معروف فکشن ناقد، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی شریک ہوئے۔ اس دوران لکھنؤ سے

ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود رہیں۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ریسرچ اسکالر سیدہ مریم الٰہی، نظامت ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور شکریے کی رسم محمد ندیم نے ادا کی۔ پروگرام کا تعارف پیش کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ آج کا موضوع بڑا اہم ہے اس لیے کہ آج ان کی یوم ولادت ہے۔ ڈاکٹر منظر کاظمی ایک غیر معمولی افسانہ نگار تھے جنھوں نے بہت سے افسانے لکھے لیکن 'سیاہ غلاف کالے جرنیل' ایسا افسانہ ہے کہ قارئین اس افسانے میں کھو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر پرویز شہریار نے کہا کہ ڈاکٹر منظر کاظمی جدیدیت کے علمبردار تھے۔ انھوں نے علامتی افسانوں میں منفرد راہ قائم کی۔ ان کا منفرد اسلوب خلیل جبران سے ملتا ہے۔ بڑے استاد کی طرح منظر کاظمی بڑے افسانہ نگار اور ادیب تھے۔ ڈاکٹر اختر آزاد نے کہا کہ ڈاکٹر منظر کاظمی جدید افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تھے کہ جب جدیدیت دم توڑ رہی تھی انھوں نے اردو دنیا کو بہترین افسانے دیے۔ ان کی انفرادی خصوصیت یہ بھی ہے کہ 42 سال میں آپ نے ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ 55 افسانے تحریر کیے۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر زین رامش نے کہا کہ ڈاکٹر منظر کاظمی بحیثیت تنقید نگار، بحیثیت افسانہ نگار، بحیثیت ادیب کے ساتھ ساتھ دیگر اہم شخصیت کے بھی مالک تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 25 ستمبر 2026

ترقی پسند اردو خواتین افسانہ نگار اور سماجی شعور

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام 'یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام 'ترقی پسند اردو خواتین افسانہ نگار اور سماجی شعور' کے عنوان سے ایک توسیعی خطبے کا انعقاد ابوالکلام آزاد اکیڈمک بلڈنگ کے ہائبرڈ ہال، دوسری منزل پر کیا گیا۔ تقریب کے آغاز میں ڈاکٹر محمد اکمل نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبۂ ساجیات کی صدر پروفیسر عذرا عابدی کا خیر مقدم کیا اور موضوع کی اہمیت پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر پروفیسر عذرا عابدی نے توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے ترقی پسند اردو افسانے کی روایت اور اس میں خواتین افسانہ نگاروں کے کردار کا تفصیلی جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو محض جمالیاتی اظہار تک محدود رکھنے کے بجائے اسے معاشرے کے حقیقی مسائل سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خواتین افسانہ نگاروں نے عورت، خاندان، طبقاتی ناہمواری، معاشی استحصال، گھریلو جبر، تعلیم، سماجی پابندیوں اور صنفی امتیاز جیسے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور ان مسائل کے پس پشت موجود سماجی، معاشی اور تہذیبی اسباب کو بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ پروفیسر عذرا عابدی نے کہا کہ سماجی شعور کا مطلب صرف معاشرتی مسائل کی نشاندہی کرنا نہیں ہے بلکہ یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ یہ مسائل کیوں پیدا ہوتے ہیں، ان کے اسباب کیا ہیں اور طاقت کے کون سے نظام انھیں برقرار رکھتے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 29 ستمبر 2026

فلسفۂ عدم تشدد اور گاندھی جی

میرٹھ: گاندھی جی اگر مہاتما بدھ سے متاثر ہیں تو مذہب اسلام سے بھی کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ مولانا جوہر ہوں یا مولانا حسرت موہانی سب نے گاندھی جی کو مجاہد کہا ہے۔ آج ہر ہندستانی کو عدم تشدد کی ضرورت ہے، جہاں ہر ماں اپنے بچے کی تربیت کرتی ہے عدم تشدد کی تو وہ اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ دوسرے بچوں کو بھی ڈانٹ دیتی ہے کیونکہ ہمارے لیے عدم تشدد ہی ضروری چیز ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف محقق و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد 'فلسفہ عدم تشدد اور گاندھی جی' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ادیب و ناقد اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور پروفیسر ارادھنا گپتا (سابق صدر شعبۂ تاریخ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ) نے شرکت فرمائی۔ مہمانان اعزازی کے بطور ڈاکٹر محمد اخلاق (ہیڈ فیکلٹی آف آرٹس، اسلامیہ ڈگری کالج، دیوبند) ڈاکٹر جے ویر رانا، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ پالیٹیکل سائنس، سی سی ایس یونیورسٹی، میرٹھ اور ڈاکٹر مہیپال سنگھ شعبۂ قانون، سی سی ایس یونیورسٹی، میرٹھ نے شرکت فرمائی اور مقالہ نگار کے بطور، ڈاکٹر یگیش کمار شعبۂ ہندی، سی سی ایس یونیورسٹی، میرٹھ، ڈاکٹر دیپک کمار اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ تاریخ، ایس ایس وی ڈگری کالج، ہاپوڑ، ڈاکٹر محمد طلحہ کمال اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، اسلامیہ ڈگری کالج، دیوبند اور انورادھا ریسرچ اسکالر، شعبۂ پالیٹیکل سائنس، سی سی ایس یونیورسٹی، میرٹھ شریک ہوئے۔ اس دوران پروگرام میں ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین بھی موجود رہیں۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض شعبے کے استاد ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیے۔ پروگرام میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ گاندھی جی نے اپنی تمام عمر ہندوستان کے لوگوں کی خدمت کرنے اور مشترکہ تہذیب کو قائم کرنے میں لگا دی۔ آج پوری دنیا میں گاندھی جی کو امن کے پیغامبر کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ پروفیسر ارادھنا گپتا نے کہا کہ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ ہم جیسا بیج لگائیں گے ویسا ہی پھل ملے گا، انھوں نے 1921 میں کہا تھا کہ ہمیں اپنے لیے سخت اور دوسروں کے لیے ہمدرد انسان ہونا چاہیے گاندھی جی کہتے تھے کہ کسی کو درد دینا یا پریشان کرنا بھی تشدد ہے۔ انورادھا نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر مہاتما گاندھی کے زاویہ نگاہ سے دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے عدم تشدد کو مختلف حصوں میں منقسم کیا ہوا تھا۔ موجودہ دور میں خواتین کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی کی باتوں پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر یگیش کمار نے کہا کہ ہمیں گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کو اپنی زندگی میں لانا ہوگا۔ ڈاکٹر محمد طلحہ نے کہا کہ عدم تشدد آزادی کی تحریک اور سماجی مسائل کو دور کرنے میں بہت ضروری ہے۔ آزادی کی تحریک میں گاندھی جی نے یہ فلسفہ بڑی فنکاری سے پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 2 اکتوبر 2026

گاندھی سے شاستری تک: بدلتا بھارت

لکھنؤ: مولانا آزاد میموریل اکیڈمی، لکھنؤ کے زیر اہتمام مہاتما گاندھی اور لال بہادر شاستری کی یوم پیدائش کے موقع پر 'فکر سے عمل تک' پندرہ روزہ پروگرام کا آغاز 'گاندھی سے شاستری تک: بدلتا بھارت' کے موضوع پر منعقدہ قومی ویبینار سے ہوا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کے صدر پروفیسر ششی کانت پانڈے نے کہا کہ گاندھی کی جمہوریت صرف انتخابات تک محدود نہیں تھی بلکہ عوامی شمولیت، سماجی مساوات، اختیارات کی نچلی سطح

تک منتقلی اور ذمہ دار شہریت اس کی بنیاد تھے۔ گاندھی جی نے تحریک آزادی کو عام لوگوں سے جوڑ کر اسے ایک وسیع عوامی تحریک بنایا۔ ان کے جمہوری تصور میں گرام سوراج اور عوام کی فعال شرکت کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ سینئر صحافی و سماجی کارکن وندنا مشرا نے جمہوریت میں حق رائے دہی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ جمہوریت کی حقیقی طاقت اسی وقت یقینی ہوتی ہے جب ہر شہری کو، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، ووٹ دینے اور اپنی حکومت منتخب کرنے کا مساوی حق حاصل ہو۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی نے خواتین کو تحریک آزادی سے جوڑ کر انھیں عوامی زندگی میں عزت اور شرکت کا موقع فراہم کیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے سابق اردو پروگرام ایکزیکیوٹر، سینئر صحافی و مصنف پرتپل جوشی نے کہا کہ گاندھی خود کفیل اور جامع ہندوستان کا خواب دیکھتے تھے۔ وہیں شاستری جی کے ''جے جوان، جے کسان'' کے نعرے نے ملک کی سلامتی اور غذائی خود کفالت کے جذبے کو مضبوط کیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 13 اکتوبر 2026

مشاعرہ اور کوی سمیلن

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی میں یوم تاسیس کی مناسبت سے آرٹ فیکلٹی کے طلبہ کی جانب سے ابوالکلام آزاد اکیڈمک عمارت کے اٹل ہال میں ایک مشاعرہ اور کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا۔ اس مشاعرہ اور کوی سمیلن کی صدارت ڈین فیکلٹی آف آرٹ اینڈ ہیومنٹیز اور شعبۂ اردو صدر پروفیسر ثوبان سعید نے کی۔ پروفیسر ثوبان سعید نے اپنی صدارتی تقریر میں طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ نے اپنی بساط سے بڑھ کر اس مشاعرے اور کوی سمیلن کی بزم سجائی ہے اور نہایت خوب صورت اور یادگار ادبی فضا قائم کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مشاعرہ محض شعر سننے اور سنانے کی محفل نہیں بلکہ ہماری تہذیبی، ثقافتی اور ادبی روایت کا ایک اہم مظہر ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مشاعرے کی محفل میں مختلف خیالات، احساسات اور تجربات ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہیں جس سے طلبہ میں اظہار خیال کا سلیقہ، اعتماد اور ادبی ذوق پروان چڑھتا ہے۔ اس مشاعرے اور کوی سمیلن میں مختلف فیکلٹی کے طلبہ و طالبات نے اپنی غزلیں اور نظمیں پیش کر کے اپنے شعری ذوق، تخلیقی صلاحیتوں اور ادبی استعداد کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر ثروت تقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج طلبہ نے جس سلیقے، ذوق اور خلوص کے ساتھ یہ خوبصورت بزم سجائی ہے، وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ اس مشاعرے کی نظامت حسن اکبر ریسرچ اسکالر اور محمد انس نے کی اور آخر میں شکریہ ریسرچ اسکالر راشدہ خاتون نے ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 4 اکتوبر 2026

بھار

اسٹریٹیجک فیصلہ سازی میں مصنوعی ذہانت کا کردار

دربھنگہ: جہاں تہذیب کے آغاز سے ہی دنیا نے مسلسل تبدیلیاں دیکھی ہیں وہیں گذشتہ دو دہائیوں میں ٹیکنالوجی کے میدان میں جو ترقی ہوئی ہے وہ بے مثال ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر مشتاق احمد، پرنسپل سی، ایم کالج دربھنگہ نے کیا۔ پروفیسر احمد شعبۂ کامرس کالج ہذا میں ایک سیمینار بعنوان 'اسٹریٹیجک فیصلہ سازی میں مصنوعی ذہانت کا کردار' میں تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ مصنوعی ذہانت اور مشین لرننگ کو اپنانے سے جدید انتظامی ماہرین اور کاروباری افراد کے کام کرنے کے طریقوں کو ایک نئی جہت ملی ہے۔ ہندوستان اور بیرون ملک کمپنیاں پیچیدہ کاروباری مسائل کو حل کرنے کے لیے مصنوعی ذہانت کا استعمال کر رہی ہیں۔ تاہم، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسانی عقل اور انسانی شمولیت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ بلکہ مصنوعی ذہانت اور انسانی رویے کے درمیان توازن برقرار رہنا چاہیے۔ سمینار کے کلیدی مقرر مسٹر کے، گری (نئی دہلی) نے بنیادی انتظامی تصورات، میدان کی موجودہ حالت اور اسٹریٹیجک فیصلہ سازی کے عمل میں مصنوعی ذہانت کے تعاون کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا۔ انھوں نے مصنوعی ذہانت کی حدود کے حوالے سے بھی گہرائی سے گفتگو کی۔ بی بی اے ڈیپارٹمنٹ کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر للت شرما نے مشین لرننگ اور مصنوعی ذہانت کے تاریخی ارتقا کا خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کا درست استعمال ہندوستان اور بیرون ملک ہنرمند پیشہ ور افراد کے لیے روزگار کے نئے مواقع پیدا کرے گا۔ طلباء میں مہارت کی نشو ونما کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے جناب راجیش کمار جھا نے کہا کہ 'ترقی یافتہ ہندوستان' 2047 کا خواب صرف تکنیکی مہارت اور مسلسل محنت کے امتزاج سے ہی پورا ہوگا۔ سمینار میں کالج کے بی بی اے اور بی سی اے کے شعبۂ جات کے 100 سے زائد طلبا و طالبات نے جوش وخروش سے شرکت کی اور حاضرین ماہرین نے ان کے سوالات کے بصیرت افروز اور موثر جوابات دیے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر دیویا شرما نے کی جب کہ شکریہ کی رسم ڈاکٹر للت شرما نے ادا کی۔ سمینار میں دیگر شعبے کے اساتذہ اور بڑی تعداد میں طلبا نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 4 ستمبر 2026

تلنگانہ

'قیام امن' کے موضوع پر مشاعرہ

حیدرآباد: انجمن محبان اردو تلنگانہ کے زیر اہتمام رویندرا بھارتی تھیٹر حیدرآباد میں منعقدہ عظیم الشان اندرا گاندھی یادگار عالمی امن مشاعرہ بعنوان 'قیام امن' نے سامعین کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ مہمان خصوصی وی ہنمنت راؤ، مشیر بی سی ویلفیئر اینڈ ڈیولپمنٹ حکومت تلنگانہ، نے کہا کہ حیدرآباد گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار اور پیار و محبت کا شہر ہے۔ اردو ایک میٹھی اور پیاری زبان ہے جو دلوں کو جوڑنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ انجمن محبان اردو تلنگانہ کی جانب سے حیدرآباد، اضلاع اور دیگر مقامات پر منعقد ہونے والے مشاعروں سے قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ تہذیبی سفیر افتخار شریف نے کہا کہ امریکہ میں اردو کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں اور وہاں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد قابل ذکر ہے۔ انھوں نے عالمی سطح کے شعرا کو حیدرآباد مدعو کرنے پر سید مسکین احمد کو مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر ایس اے شکور نے کہا کہ اردو مشاعرے ہماری تہذیبی روایت کا اہم حصہ ہیں اور سید مسکین احمد مشاعروں کے ذریعے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مشاعرے کی نظامت ممتاز شاعر لطیف الدین لطیف اور استاد سخن ڈاکٹر سردار سلیم نے کی۔ ماسکو سے تشریف لائیں شاعرہ ڈاکٹر شویتا سنگھ اومانے اردو سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہندی کی بیٹی ہیں لیکن اردو سے عشق کرتی ہیں۔ انھوں نے صوفیانہ کلام سمیت اپنی غزلیں ترنم سے پیش کر کے خوب داد حاصل کی۔ مشاعرے میں ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی، محمد

علی وفا، نازنین علی ناز، چرن سنگھ بشر، شاہد انجم، اسلم چشتی، احمد فیض آبادی، انور امان، سدھارتھ شاندلیہ، دیپک اگروال، رفیق سوداگر، انجنی کمار گوئل، سعد اللہ خان سہیل اور آرزو مہک سمیت متعدد شعرا نے کلام پیش کیا۔ طنز و مزاح کے شعرا شاہد عدیلی، وحید پاشاہ قادری اور لطیف الدین لطیف نے بھی اپنے مزاحیہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ آخر میں کنوینر لطیف الدین لطیف کے اظہار تشکر کے ساتھ مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اکتوبر 2026

اعزاز و اکرام

اودھ رتن ایوارڈ

لکھنؤ: سنگم فاؤنڈیشن کی ایک اہم اور اعلیٰ سطحی میٹنگ خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ کی نظامت کے فرائض خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ثوبان سعید نے انجام دیے۔ میٹنگ میں کافی غور و خوض کے بعد مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں اور گرانقدر خدمات انجام دینے والی ممتاز شخصیات کو دیے جانے والے 'اودھ رتن ایوارڈز' کے لیے درج ذیل ناموں کی منظوری دی گئی: سید نعیم اشرف اودھ رتن ایوارڈ برائے سماجی خدمات: قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارے (وزارت تعلیم، حکومت ہند، نئی دہلی) کے قائم مقام چیئرمین پروفیسر شاہد اختر کو ان کی گرانقدر تعلیمی و سماجی خدمات کے لیے اس ایوارڈ سے سرفراز کیا جائے گا۔ سید منظور احمد اشرفی اودھ رتن ایوارڈ برائے مجموعی خدمات: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ کے وائس چانسلر پروفیسر اجے تیجا کو ان کی مجموعی تعلیمی و انتظامی خدمات کے اعتراف میں اس ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اودھ رتن ایوارڈ برائے ادبی خدمات: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق چیئرمین پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی کو ان کی گرانقدر ادبی خدمات کے لیے اس اعزاز سے نوازا جائے گا۔ احتشام حسین اودھ رتن ایوارڈ برائے تنقید: الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر اور معروف نقاد پروفیسر علی احمد فاطمی کو اردو تنقید کے شعبے میں ان کے نمایاں کردار کے لیے اس ایوارڈ سے سرفراز کیا جائے گا۔ سید امتیاز احمد اشرفی اودھ رتن ایوارڈ برائے صحافت: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت کے پروفیسر شافع قدوائی کو صحافت کے شعبے میں ان کی گرانقدر خدمات کے اعتراف میں یہ ایوارڈ دیا جائے گا۔

ملک محمد جائسی اودھ رتن ایوارڈ: اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU) کے رجسٹرار پروفیسر جتیندر شریواستو کو اس پروقار ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اودھ رتن ایوارڈ برائے نوجوان ادیب: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ کے شعبۂ اردو کے ڈاکٹر اعظم انصاری کو دیا جائے گا۔ اس میٹنگ میں علمی و ادبی دنیا کی متعدد معروف شخصیات نے بطور رکن شرکت کی۔ پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ سنگم فاؤنڈیشن گذشتہ 10 ادوار سے مسلسل علمی، ادبی اور سماجی شعبوں میں بلاتفریق خدمات انجام دینے والی شخصیات کی پذیرائی کرتی آ رہی ہے اور یہ گیارہواں دور بھی اسی تسلسل کی ایک کڑی ہے، میٹنگ کے اختتام پر اعلان کیا گیا کہ جلد ہی لکھنؤ میں ایک باوقار تقریب کا انعقاد کر کے ان تمام منتخب شخصیات کو اس اعزاز سے سرفراز کیا جائے گا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 ستمبر 2026

بھارت ایجوکیشن ایکسیلنس ایوارڈ

نئی دھلی: ڈاکٹر قاضی محمد میاں کو شعبۂ اور تعلیمی انتظامیہ میں ان کی خدمات کے اعتراف میں باوقار 'بھارت



ایجوکیشن ایکسیلنس ایوارڈ' سے نوازا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ تیرہویں بھارت ایجوکیشن لیڈرشپ کانکلیو کے دوران آئی آئی ایل ایم یونیورسٹی، نوئیڈا میں منعقدہ تقریب میں پیش کیا گیا۔ کانکلیو کا انعقاد سینٹر فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ فاؤنڈیشن انڈیا (سی ای ڈی انڈیا) نے نیتی آیوگ، حکومت ہند اور آئی آئی ایل ایم یونیورسٹی، نوئیڈا کے اشتراک سے کیا تھا۔ ڈاکٹر قاضی محمد میاں کو یہ ایوارڈ میجر جنرل بی ڈی وادھوا (ریٹائرڈ)، پرو چانسلر، آئی آئی ایل ایم یونیورسٹی، نوئیڈا اور جی ایس چوہان، سابق جوائنٹ سیکریٹری، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) نے پیش کیا۔ کانکلیو میں شعبہ تعلیم سے وابستہ متعدد ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔ ان میں اروند کمار مشرا، ڈپٹی سیکریٹری سی بی ایس ای: پروفیسر دنیش سنگھ، چانسلر، کے آر منگلم یونیورسٹی اور سابق وائس چانسلر، دہلی یونیورسٹی: ڈاکٹر جے شنکر واریر، وائس چانسلر، آئی آئی ایل ایم یونیورسٹی، نوئیڈا، اور ڈاکٹر پریہ درشی نانک، صدر سی ای ڈی انڈیا اور چیئرمین، سی بی ایس ای سہودیا اسکول کمپلیکس سمیت ملک بھر سے آئے متعدد ماہرین تعلیم شامل تھے۔ ڈاکٹر قاضی محمد میاں اس وقت دی اسکالر اسکول، دہلی کے ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ آل انڈیا ایجوکیشنل موومنٹ کے ایگزیکٹو ممبر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ متعدد قومی اور بین الاقوامی تعلیمی اداروں اور تنظیموں سے بھی وابستہ ہیں۔ تعلیم اور تعلیمی انتظامیہ کے شعبے میں ان کی خدمات کو اس سے قبل بھی مختلف تعلیمی اداروں اور تنظیموں کی جانب سے متعدد اعزازات سے سراہا جا چکا ہے۔ بھارت ایجوکیشن ایکسیلنس ایوارڈ ڈاکٹر قاضی محمد میاں کی تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ایک اور اہم اعزاز قرار دیا جا رہا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 ستمبر 2026

ڈاکٹر مشتاق صدف

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کی وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے ڈاکٹر مشتاق صدف کو سرسید اکیڈمی کا ڈپٹی ڈائرکٹر مقرر کیا ہے جس میں پبلی کیشن ڈویژن کی اضافی ذمہ داریاں بھی شامل ہیں۔ یہ



اطلاع جوائنٹ رجسٹرار محمد عارف الدین احمد کے دستخط سے جاری ایک آفس آرڈر میں دی گئی ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر محمد شاہد اب تک اس عہدے پر فائز تھے۔ آج پروفیسر شافع قدوائی ڈائرکٹر سرسید اکیڈمی کی موجودگی میں ڈاکٹر مشتاق صدف نے چارج سنبھالا۔ مشتاق صدف کی اب تک 18 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اے ایم یو سے قبل ادب کے پروقار قومی ادارہ ساہتیہ اکادمی میں وہ پروگرام آفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ ادبی و ثقافتی پروگراموں

کے انعقاد کے ساتھ پبلیکیشن کا بھی انھیں طویل تجربہ ہے۔ عرصہ دراز سے وہ سرسید کے افکار و خدمات پر لکھتے رہے ہیں۔ تاجکستان کی راجدھانی دوشنبہ کی تاجک نیشنل یونیورسٹی میں آئی سی سی آر چیئر پر تین برسوں تک وزٹینگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی وہ اپنی تدریسی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ آج کل وہ فکری و تحقیقی رسالہ 'فکر و نظر' کے جوائنٹ ایڈیٹر کی ذمہ داریاں بھی نبھا رہے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 18 ستمبر 2026

رسم اجرا

نئی روشنی

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام سینٹ روز پبلک اسکول، گڑھی پیر خان، ٹھاکر گنج میں ممتاز پی جی کالج کے سابق پرنسپل پروفیسر عتیق احمد فاروقی کی اردو میں شائع ہونے والی تیسری کتاب 'نئی روشنی' کی رسم رونمائی شفیق الزماں، سابق ڈائرکٹر یوتھ ڈیولپمنٹ، این ایس ایس، کی صدارت میں انجام پائی۔ پروگرام کے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید احسن الظفر، سابق ریڈر، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، اور مہمانان اعزازی ممتاز پی جی کالج کے پروفیسر سلمان خان ندوی، صدر شعبۂ عرب کلچر اور ڈاکٹر محمد عمران خان، صدر شعبۂ سیاسیات، تھے۔ نظامت ڈاکٹر ثروت تقی، سابق وائس پرنسپل، شیعہ پی جی کالج، لکھنؤ، نے کی۔ اس تقریب میں منعقد شعرا نے اپنے منظوم کلام پیش کیے، اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد عمران خان نے پروفیسر عتیق فاروقی سے اپنے قریبی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہ صرف ایک شریف النفس انسان ہیں بلکہ ایک منفرد اور قابل صحافی، ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ پروفیسر سلمان ندوی نے صاحب کتاب کی ستائش کرتے ہوئے انھیں ممتاز پی جی کالج کا ایک کامیاب پرنسپل قرار دیا۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر سید احسن الظفر نے 'نئی روشنی' کی رسم رونمائی کے موقعے پر کتاب کو موجودہ دور میں مثبت فکر، اخلاقی شعور اور معاشرتی اصلاح کے پیغام کو عام کرنے کی ایک اہم کوشش قرار دیا۔ صدر جلسہ شفیق الزماں نے کہا کہ یہ کتاب قارئین میں مثبت سوچ، تعمیری فکر اور روشن مستقبل کے عزم کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہوگی۔ کتاب کے مصنف پروفیسر عتیق فاروقی نے اپنے خطاب میں کتاب کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ 'نئی روشنی' دراصل ان کے خیالات کی ترجمان اور معاشرے کے مختلف مسائل پر ان کے نقطۂ نظر کی عکاس ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب مسابقتی امتحانات میں شرکت کرنے والے طلبہ کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 7 ستمبر 2026

شعرائے دبستان میرٹھ

میرٹھ: میرٹھ کالج میں کئی ایسی ادبی شخصیات بھی آئیں جنھوں نے یہاں کی مٹی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ایسے ہی اساتذہ میں ڈاکٹر یونس غازی کا بھی نام شامل ہے جنھوں نے یہاں رہ کر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ آج یہاں ان کی دو کتابوں 'شعرائے دبستان میرٹھ' قطعات کا مجموعہ اور حمدیہ مجموعہ 'للہ الحمد' کا اجرا عمل میں آیا۔ ان قطعات میں جدت ہے جو مرقع نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ یہ الفاظ تھے معروف شاعر اور سابق صدر شعبۂ اردو فاروق بخشی کے جو یہاں شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد ڈاکٹر محمد یونس غازی کی شعری کاوشوں 'للہ الحمد' اور 'شعرائے دبستان میرٹھ' کی شاندار رسم اجرا کے پروگرام کے دوران مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ڈاکٹر یونس غازی کا مطالعہ تو ہے ہی لیکن ان کا مشاہدہ بھی کمال کا ہے اور یہ ساری باتیں انھیں ایک قادر الکلام شاعر ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے معروف شاعر اور سابق صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد نے شرکت کی۔ مہمانانِ اعزازی کے بطور معروف استاد شاعر انوار الحق شاداں پھلاؤدی، ڈاکٹر یشیکا ساگر صدر شعبۂ اردو، میرٹھ کالج معروف سماجی کارکن عادل چودھری اور آفاق احمد خاں شریک ہوئے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے انجام دیے جب کہ شکریے کی رسم ڈاکٹر الکا وششٹھ نے ادا کی۔

اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایڈوکیٹ ارشاد بیتاب نے کہا کہ یہ اردو ہی ہے جس کی محبت اور لگن کی وجہ سے آج اردو کی اتنی بڑی ہستیوں کے ساتھ میں اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہوں۔ میں دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے اپنی کتاب میں شامل کیا۔ اس موقعے پر شاہد چودھری ذیشان قریشی اور ڈاکٹر شاداب علیم نے



بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' 9 ستمبر 2026

گلزار اشرف

نئی دھلی: مدرسہ فیض القرآن آر زیڈ ڈی 23/50 فٹا روڈ، نہال وہار، نانگلوئی میں رسم اجرا و نعتیہ پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں قاری فخر الدین اشرف کشی نگری (نائب مہتمم مدرسہ فیض القرآن) کے نعتیہ مجموعہ 'گلزار اشرف' کا اجرا مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت بانی و مہتمم مدرسہ فیض القرآن مولانا خورشید احمد الحسینی نے کی، جب کہ سرپرستی مقصود عالم صدیقی کی حاصل رہی۔ نظامت نور العین قیصر قاسمی نے کی۔ بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر شفیع ایوب اور شاعر و صحافی ڈاکٹر حبیب سیفی نے شرکت کی اور 'گلزار اشرف' کے ادبی و فکری اسلوب پر نہایت معلوماتی گفتگو کی۔ صدر محفل مولانا خورشید احمد الحسینی نے اپنی صدارتی تقریر میں نعت رسول ﷺ کی اہمیت، عظمت اور اس کے روح پرور ادبی مقام پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ رسم اجرا کے بعد ایک نعتیہ محفل کا انعقاد کیا گیا جن میں کئی شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ پروگرام کے اختتام پر قاری فخر الدین اشرف نے آئے ہوئے جملہ مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' 21 ستمبر 2026

ماحولیاتی ادبی تنقید

میرٹھ: کسی بھی کتاب کا اجرا کتاب کی اہمیت میں اضافے



کا سبب بنتا ہے۔ 'ماحولیاتی ادبی تنقید' بہت اہم کتاب ہے۔ بغیر انوائیرمینٹ کے ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ موضوع بہت ہی عمدہ اور افادیت سے بھرپور ہے اور اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہونا چاہیے۔ آج ٹیکنالوجی کا دور ہے، کتاب کا ترجمہ کرنا بھی بہت آسان ہے۔ ارتضیٰ کریم صاحب سے میری درخواست ہے کہ اس کا دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کرائیں تاکہ یہ دیگر زبانوں کے طالب علموں اور ریسرچ اسکالرز تک پہنچے۔ یہ الفاظ تھے سابق شیخ الجامعہ سہیل دیو یونیورسٹی، اعظم گڑھ، پروفیسر پی کے شرما کے جو مہمان خصوصی کی حیثیت سے شعبۂ اردو میں منعقد پروفیسر ارتضیٰ کریم کی کتاب 'ماحولیاتی ادبی تنقید' کی رسم اجرا و مذکراہ کے دوران ادا کررہے تھے۔

پروگرام کی صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور سابق شیخ الجامعہ سہیل دیو یونیورسٹی، اعظم گڑھ پروفیسر پی کے شرما نے شرکت فرمائی۔ مہمانان اعزازی کے بطور معروف فکشن نگار و منفرد شاعر پروفیسر شفق سوپوری، پروفیسر اے کے چوبے (سابق صدر شعبۂ زولوجی) اور پروفیسر کویتا تیاگی (سابق صدر شعبہ ہندی، میرٹھ کالج) نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر الکا وششٹھ نے ادا کی۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ نئی صدی میں نئے موضوع پر لکھی گئی نئی کتاب کا نام 'ماحولیاتی ادبی تنقید' ہے۔ جو بڑی جانفشانی کے ساتھ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ترتیب دی ہے۔ نئی صدی میں ماحولیات ایک اہم اور نیا موضوع ہے۔ اردو ادب میں ماحولیات ہمارے ادبا و شعرا سے اچھوتا نہیں رہا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' 20 ستمبر 2026

علم کی روشنی

دیوبند: پبلک گرلز انٹر کالج دیوبند میں کالج کی سالانہ میگزین 'علم کی روشنی' کا رسم اجرا شیخ الہند ہال میں عمل



میں آیا۔ پروگرام کی صدارت محمد ایاز صدیقی نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر صحافی شیومنی تیاگی اور نامور مصنفہ و جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پروفیسر رخشندہ روحی مہدی موجود رہیں۔ نظامت کالج کی معلّمہ زیبا نگہت نے کی۔ اس موقعے پر محمد ایاز صدیقی نے کہا کہ تعلیم صرف ڈگری حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ بہتر انسان اور ذمہ دار شہری بننے کی بنیاد ہے۔ طالبات میں پڑھنے، سوچنے اور معاشرے کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ پیدا کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اشوک گپتا نے کہا کہ علم کی روشنی، جیسے رسالے طالبات کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اسکولوں میں تعلیم کے ساتھ ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں کو بھی فروغ دیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر رخشندہ روحی نے طالبات سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کتابیں اور رسالے علم کی دنیا کے دروازے کھولتے ہیں۔ طالبات کو صرف نصاب تک محدود نہیں رہنا چاہیے، بلکہ ادب کا مطالعہ کرنے اور اپنے خیالات کو تحریر کے ذریعے سامنے لانے کی عادت اپنانی چاہیے۔ شیومنی تیاگی اور شائستہ پروین نے کہا کہ طالبات کی صلاحیتوں کو پلیٹ فارم فراہم کرنا انھیں خود کفیل اور پر اعتماد بنانے کی سمت میں ایک اہم قدم ہے۔ ایسی سرگرمیاں ان کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اسکول کے منیجر نے کہا کہ ادارے کی کوشش ہے کہ طالبات کو معیاری تعلیم کے ساتھ ادب، ثقافت اور سماجی اقدار سے بھی جوڑا جائے۔ 'علم کی روشنی' اسی سوچ کا نتیجہ ہے۔ سکریٹری انس صدیقی نے کہا کہ طالبات کی صلاحیتوں کو سامنے لانے کے لیے اسکول میں مسلسل تخلیقی سرگرمیاں منعقد کی جاتی ہیں۔ رسالے میں طالبات کی تحریروں کو جگہ دے کر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ نجم عثمانی اور ماسٹر شمیم کیرت پوری نے کہا کہ جس معاشرے کی بیٹیاں کتابوں سے دوستی کر لیتی ہیں، اس معاشرے کا مستقبل روشن ہوتا ہے۔ انھوں نے طالبات کو مسلسل پڑھنے، لکھنے اور اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کا پیغام دیا۔ آخر میں پرنسپل صبا حسیب صدیقی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' 27 ستمبر 2026

دی ٹیسٹ آف لکھنؤ

لکھنؤ: جواں سال قلمکار احمد حارث علوی کی کتاب 'دی ٹیسٹ آف لکھنؤ' کا اجرا پروفیسر صابرہ حبیب کے ہاتھوں رشید بارہ دری، عیدگاہ میں ہوا۔ صدارت مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے کی اور نظامت رضوان احمد فاروقی نے کی۔ اس موقعے پر بطور مہمان خصوصی سینئر جرنلسٹ پردیپ کپور نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا میں نے 'کافی ہاؤس' کو موضوع بنایا تھا، لیکن نوجوان نسل کے قلمکار احمد حارث علوی نے لکھنؤ کے پکوان، یہاں کے ادب و ثقافت، گنگا جمنی تہذیب اور جداگانہ شان کے متعلق وہ کچھ لکھ دیا ہے جس کی نہ صرف آج بلکہ مستقبل میں شدت سے ضرورت محسوس کی جائے

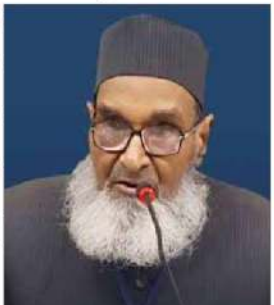
گی۔اسی حوالے سے نوجوان نسل لکھنؤ کو سمجھے گی۔صدر ذی وقار مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے نہ صرف مصنف کے کام کو سراہا بلکہ ان کی دور بینی، عمیق نگہی، سنجیدگی اور متانت کی داد دی اور کہا کہ احمد حارث علوی نے خاندان کی وراثت کو سنبھالا ہے۔مختلف انجیوز سے وابستہ رہ کر اپنی تہذیب و ثقافت کی فکر لائق تعریف و تقلید ہے۔پروفیسر صابرہ حبیب نے کہا نئی نسل دائروں سے نکل کر زیادہ توانائی کے ساتھ کار ادب انجام دے رہی ہے۔جس کی واضح مثال یہ کتاب ہے۔انگریزی زبان میں بات زیادہ طاقتور انداز میں دور تک پہنچائی جاسکتی ہے۔لکھنؤ کے حوالے سے یہ کتاب بہت اہم ہے۔اس کا سماج کے ہر طبقے میں استقبال ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی نے کہا کہ حارث علوی کا کام بڑا اور مقاصد نیک ہیں۔ان سے مزید کام کی امید اس موقعے پر مولانا نعیم الرحمٰن ندوی، احمد ابراہیم علوی، ڈاکٹر زبیر انصاری، رضوان احمد فاروقی نے بھی اظہار خیال کیا۔احمد حارث علوی کے کلمات تشکر پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 1 اکتوبر 2026

وفیات

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

لکھنؤ: ایشیا کی عظیم اور ممتاز دینی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے مہتمم، انٹیگرل یونیورسٹی کے چانسلر اور بین الاقوامی سطح پر معروف عالم دین ومنفرد عربی



ادیب مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کا 7 اکتوبر 2026 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین ڈالی گنج کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف، بصیرت افروز ادیب، زیرک صحافی اور عربی زبان وادب کے ایسے مستند ماہر تھے جن کی علمی خدمات کا دائرہ سرحدوں سے ماورا تھا۔حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی پوری زندگی ہندوستان میں اسلامی تعلیمات کے فروغ، عربی زبان وادب کی ترویج، معتدل صحافت کی آبیاری اور دینی و تعلیمی اداروں کی بے لوث خدمت سے عبارت رہی ہے۔ وہ سات دہائیوں سے زائد کے طویل عرصے تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیمی وفکری روایت سے گہرائی کے ساتھ وابستہ رہے اور انھوں نے ندوہ کے فکرِ اعتدال کو آگے بڑھانے میں انتہائی کلیدی اور نمایاں ترین کردار ادا کیا۔ بحیثیت مہتمم، انھوں نے نہ صرف ندوۃ العلماء کے انتظامی و تربیتی امور کو ایک باوقار اور مضبوط نہج پر استوار کیا، بلکہ اپنے شفیق اور مربیانہ انداز سے ہزاروں طلبہ اور فارغین کی فکری و اخلاقی تعمیر وتربیت فرمائی۔ان کا یہ طویل اور مخلصانہ علمی سفر آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ بنا رہے گا۔مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی پیدائش مئو میں ہوئی۔ ان کے سنہ پیدائش کے حوالے سے دستیاب ذرائع میں 1934 اور 1935 دونوں کا ذکر ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ 1952 میں مزید علمی تشنگی بجھانے کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ پہنچے۔ یہاں انھوں نے ندوہ کے ممتاز اساتذہ سے عربی زبان، ادب، دینی علوم اور دیگر علوم کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں مولانا شاہ محمد حلیم عطا سلونوی، مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی جیسے نام شامل ہیں۔ندوہ میں تعلیم کے دوران ان کی علمی صلاحیتیں نمایاں ہوئیں اور فراغت کے بعد وہ اسی ادارے سے تدریسی طور پر وابستہ ہوگئے۔جس ادارے سے انھوں نے طالب علم کی حیثیت سے علمی سفر شروع کیا، اسی ادارے میں استاد، ادیب، صحافی، عربی شعبے کے ذمہ دار اور بعد میں مہتمم کی حیثیت سے طویل عرصے تک خدمات انجام دیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں شعراء الرسول، ساعۃ مع العارفین، 48 سال شفقتوں کے سائے میں، علم التصریف، اسوۂ حسنہ کے آئینے میں، اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء شامل ہیں۔ انھوں نے مجلّہ البعثت الاسلامی کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی بخوبی نبھائیں۔ ان کی عربی زبان وادب سے خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند کی جانب سے 1994 میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مولانا کی رحلت پر ملک وبیرون ملک کے سرکردہ علما، دانشوروں، سماجی رہنماؤں اور سیاسی شخصیات نے خراجِ تحسین پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 9 اکتوبر 2026

مہتاب قدر

حیدرآباد: سعودی عرب کے شہر جدہ میں مقیم ممتاز شاعر اور ادیب مہتاب قدر کا 25 ستمبر کی صبح ان کے وطن حیدرآباد میں اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 70 برس تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ مہتاب قدر کا اصل نام سید سرفراز عالم تھا، عرصہ دراز سے جدہ میں مقیم تھے اور 80 کی دہائی کے اواخر میں انھوں نے سعودی عرب میں مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔ان کے شعری سفر کا آغاز 1971 میں ہوا اور 2013 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'چھاؤں صحرا کی' شائع ہوا تھا۔ان کی نثری کتاب 'تھوڑی سی آوارگی' 2018 میں منظر عام پر آئی تھی جو سفرنامہ ہند ہے۔مہتاب قدر نے جدہ میں رہ کر شعری اور ادبی محفلوں کو فروغ دیا اور 'بابائے مشاعرہ' کہلائے۔ ان کی تدفین 27 ستمبر بعد ظہر حیدرآباد کے سلطان دائرہ قبرستان میں عمل میں آئی۔



روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 26 ستمبر 2026

ڈاکٹر مرزا احسان حیدر

بھاگلپور: معروف شاعر وادیب پروفیسر ڈاکٹر مرزا احسان حیدر کا 30 ستمبر 2026 کو پٹنہ میں تقریباً 76 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ گذشتہ کچھ عرصے سے علیل چل رہے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر مرزا احسان حیدر شام ایک مخلص، سنجیدہ، منکسر المزاج اور شائستہ طبیعت کے انسان تھے۔ اردو زبان و ادب سے انھیں گہری وابستگی تھی اور وہ ایک شاعر و ادیب کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں جانے جاتے تھے۔ان کی متعدد کتابیں اور شعری مجموعے منظر عام پر آکر اہل ادب سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر مرزا احسان حیدر



تدریسی شعبے سے بھی وابستہ تھے۔ وہ آر ایس ایس کالج، سہرسہ میں معاشیات (Economics) کے پروفیسر رہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ پٹنہ میں اپنے صاحبزادے کے ساتھ مقیم تھے، جہاں کچھ عرصے سے علالت کے باعث زیرِ علاج تھے۔ بالآخر وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ڈاکٹر مرزا کے انتقال پر علم و ادب کی مختلف شخصیات نے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، اکتوبر 2026

محمد الیاس

نئی دھلی: انگریزی روزنامہ ٹائمز آف انڈیا کے سینئر فوٹو جرنلسٹ محمد الیاس طویل علالت کے بعد بدھ کی صبح 71 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ پسماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹا اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ نماز جنازہ بعد نماز مغرب ادا کی گئی، جس کے بعد دہلی گیٹ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ اور تدفین میں بڑی تعداد میں صحافیوں، دوست احباب اور دیگر افراد نے شرکت کی۔ محمد الیاس نے دلی کالج سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد فوٹو گرافی کو اپنایا اور اپنی محنت، صلاحیت اور منفرد انداز کے ذریعے صحافت میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا اعتراف اس وقت ہوا جب وہ ملک کے معروف انگریزی اخبار 'ٹائمز آف انڈیا' سے وابستہ ہوئے اور طویل عرصے تک اس کے سینئر فوٹو جرنلسٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔



محمد الیاس کا تعلق پرانی دہلی کے ایک معروف خاندان سے تھا۔ ان کے والد حاجی شبراتی اپنی نہاری کے لیے پرانی دہلی میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ شبراتی نہاری آج بھی پرانی دہلی کی ایک معروف شناخت اور برانڈ کے طور پر جانی جاتی ہے۔ محمد الیاس کے انتقال پر علم و ادب کی مختلف شخصیات کے انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ محمد الیاس اور ان کے درمیان ایک قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں نے تقریباً چار دہائیوں قبل صحافت میں ایک ساتھ قدم رکھا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 1 اکتوبر 2026

رام دھاری سنگھ 'دنکر'

بھاگلپور: شعبۂ ہندی کی جانب سے قومی شاعر رام دھاری سنگھ دنکر، کی 118 ویں یوم پیدائش نہایت جوش وخروش، عقیدت اور احترام کے ساتھ منائی گئی۔ اس موقعے پر شعبۂ ہندی میں ایک خصوصی ادبی وفکری پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں کالج کے مختلف شعبوں کے اساتذہ، پروفیسرز، طلبہ و طالبات نے شرکت کرتے ہوئے رام دھاری سنگھ 'دنکر' کی ادبی، قومی اور فکری خدمات کو یاد کیا اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ تقریب کی صدارت شعبۂ فلسفہ کی صدرِ شعبہ پروفیسر آرتی کماری نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ رام دھاری سنگھ 'دنکر' محض مردانہ حوصلے، جد و جہد، شجاعت اور خودداری کے شاعر نہیں تھے بلکہ خواتین کے شعور، نسائی احساسات اور انسانی جذبات کے حوالے سے بھی ان کی فکر نہایت حساس اور وسیع تھی۔ انھوں نے 'دنکر' کی معروف تخلیق 'اروشی' کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس تخلیق میں شاعر کی نسائی شعور اور انسانی جذبات کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں گہری بصیرت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے مطابق دنکر کی شاعری کو صرف قومی اور انقلابی شعری روایت تک محدود کر کے نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ اس میں انسانی زندگی کے متنوع جذبات اور فکری جہات بھی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ پروگرام کی نظامت شعبۂ ہندی کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر دویا رانی نے کی۔ انھوں نے رام دھاری سنگھ 'دنکر' کی ادبی شخصیت، شعری اسلوب اور قومی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دنکر ایسے عظیم شاعر تھے



جنھوں نے اپنی پرجوش، ولولہ انگیز اور اثر انگیز شاعری کے ذریعے عوام کے اندر قومی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی شاعری میں حب الوطنی، خودداری ، جد و جہد، مزاحمت اور قومی یکجہتی کے جذبات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ شعبۂ ہندی کے صدر وجیند رکمار یادو نے رام دھاری سنگھ 'دنکر' کو ملک کا فخر اور قومی شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ دنکر کی ادبی خدمات ہندستانی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے ہندی ادب کو ایک نئی توانائی اور بلندی عطا کی اور ساتھ ہی قومی شعور کو مضبوط بنانے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر سجاتا کماری نے کہا کہ انگ پردیش کی سرزمین کے سپوت رام دھاری سنگھ 'دنکر' نے اپنی ادبی تخلیقات کے ذریعے اس خطے کے تہذیبی و ثقافتی شعور کو وسیع تر قومی شعور سے جوڑنے کا اہم کام کیا۔ انھوں نے کہا کہ دنکر نے اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے انگ پردیش کی مٹی کی خوشبو، یہاں کی تاریخی روایات اور تہذیبی احساسات کو ملک کے وسیع ادبی منظر نامے تک پہنچایا۔ ان کی تخلیقات میں مقامی وابستگی کے ساتھ ساتھ وسیع قومی اور انسانی فکر کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اس موقع پر شعبۂ انگریزی کے صدر اور معروف دانشور پروفیسر ڈاکٹر محمد فیروز عالم نے دنکر کی قومی شعور سے لبریز معروف شعری سطور پیش کرتے ہوئے ان کی ادبی عظمت، قومی فکر اور حب الوطنی کے جذبے کو اجاگر کیا۔ دنکر کی شاعری میں الفاظ محض شعری اظہار نہیں بلکہ قومی احساس اور اجتماعی بیداری کی آواز بن جاتے ہیں۔ تقریب میں شعبۂ ہندی کے طلبہ و طالبات نے بھی بھرپور جوش وخروش کے ساتھ شرکت کی۔ طلبہ نے رام دھاری سنگھ 'دنکر' کی مختلف نظموں اور شعری تخلیقات کی پرجوش انداز میں پیش کش کی اور اپنی آواز میں ان کی شاعری کا پاٹھ کر کے عظیم شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آخر میں رام دھاری سنگھ 'دنکر' کی ادبی وقومی خدمات کو یاد کرتے ہوئے انھیں عقیدت و احترام کے ساتھ خراجِ عقیدت پیش کیا گیا اور اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ ان کی تخلیقات اور فکری ورثے کو نئی نسل تک پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا جائے گا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 24 ستمبر 2026

دوروزہ قومی سمینار، حیدرآباد



उर्दू दुनिया, मासिक, नवम्बर–2026,वर्ष:28, अंक:011
URDU DUNIYA Monthly, November-2026, Vol.28, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/10/2026**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100



ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ



قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025